رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
عیدالاضحیٰ
مبارک
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
aanchalpk.com aanchalnovel.com

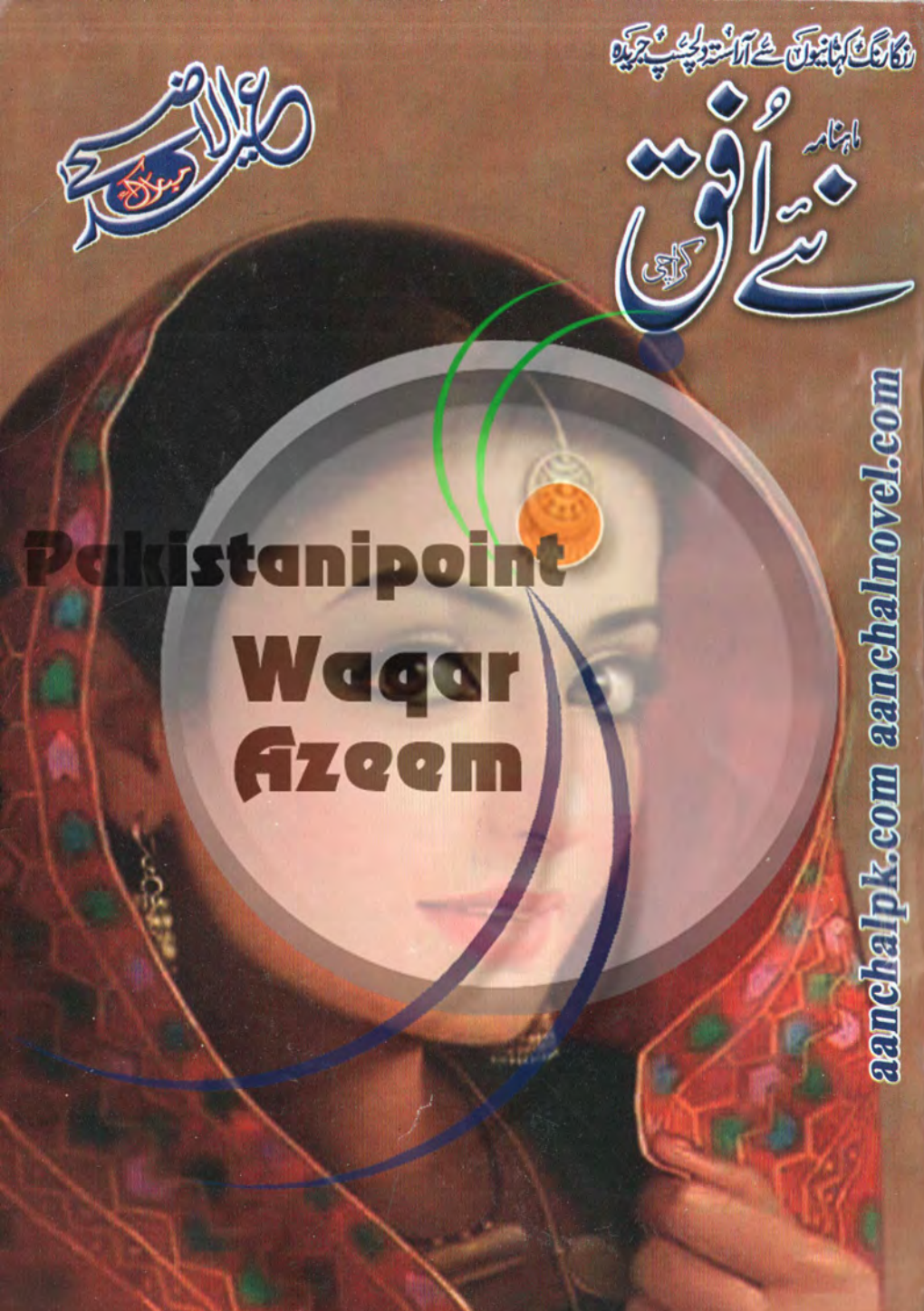

نئے افق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین

جلد	41
شمارہ	08
ستمبر	2017

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ
PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)	............50 روپے
پاکستان (سالانہ)	............600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
f naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

دستک
مشتاق احمد قریشی 10

گفتگو
اقبال بھٹی 12

اقرأ
طاہر قریشی 24

عشنا کوثر سردار
دستگیر شہزاد 26

ایکس ون
زرین قمر 30

بازگشت
عرفان رامے 56

جرم
مہتاب خان 68

ایک سو سولہ چاند کی راتیں
عشنا کوثر سردار 76

نفس کے قیدی
ریاض بٹ 100

اجڑ تا عشق
قرۃ العین سکندر 114

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

تجربہ
عارف شیخ 114

بھوتوں کی جیل
دستگیر شہزاد 122

جامن کا درخت
ربیعہ امجد 128

تلخ یادیں
خلیل جبار 140

فن پارے
ادارہ 147

گوشۂ ابنِ صفی
ادارہ 165

ذوق آگہی
سباس گل 226

خوش بوئے سخن
نوشین اقبال نوشی 230

مرشد
ساحر جمیل سید 234

کترنیں
000

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 سے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کوئی تو ہے.....

اس مملکت الٰہیہ میں کوئی تو ہے جو ہوش و حواس میں ہے ویسے چیئرمین سینیٹ جناب رضا ربانی نے انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کو مکالمہ اور مذاکرات کی دعوت دی ہے کیونکہ مکالمہ اور مذاکرات ہی صحیح العقل قوم کا وطیرہ ہوتا ہے۔ یقیناں میاں رضا ربانی ایک سنجیدہ سیاست دان اور قانون دان ہیں وہ میاں صاحب کی بات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے ہیں اسی لیے انہوں نے پارلیمنٹ کی مضبوطی اور وطن عزیز کو درست سمت چلانے اور ہر قسم کی سیاسی شورش سے بچانے کے لیے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اور ایک محب وطن ہونے کا ثبوت دیا ہے کوئی تو ہے جو وطن کے بارے میں سوچتا ہے اور خواہش کر رہا ہے کہ پارلیمنٹ مضبوط و مستحکم ہوتا کہ وطن سیاسی طور پر مضبوط و مامون ہو۔ یوں تو آج کل کیا ہمیشہ ہی ہمارے سارے سیاستدانوں کا اقتدار ملتے ہی دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے وہ خود کو عوامی نمائندے سے زیادہ بادشاہ یا آمر سمجھنے لگتے ہیں اور جامے سے باہر ہوتے رہتے ہیں اقتدار چاہے جس سطح کا بھی ہو وہ کسی نشے کی طرح دماغ پر چڑھ جاتا ہے اور بندہ اپنی اوقات ہی بھول جاتا ہے میاں صاحب کو ان کے تکبر اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی لے ڈوبی خود ان کو عمران خان اور قادری، شیخ رشید کی الزام تراشی سے تنگ آ کر عدالت سے رجوع کرنے کا خیال آیا تھا جس میں پہل ان کے مخالفین نے کر دی، میاں صاحب معاملہ عدالت عظمیٰ لے جانے پر ہی نہیں بلکہ جے آئی ٹی بنائے جانے پر بھی بڑے مطمئن تھے ان کے حواری مٹھائیاں بانٹ رہے تھے لیکن ہوا کیا خود اپنے دام میں صیاد آ گیا اب مار پچھے پکار کے مصداق میاں صاحب اپنے گھر لاہور جانے کے نام پر ایک ہجوم لے کر چلے ہیں یہاں تک بھی ٹھیک تھا ان کے ووٹران کے چاہنے والے اگر انہیں گھر تک پہنچانے کے لیے ان کے ہم راہی ہوئے تو کچھ غلط نہیں لیکن میاں صاحب نے پھر ایک بار وہی رویہ اپنا لیا جو اقتدار ملنے پر اپنایا تھا وہ ہجوم کو دیکھ کر ہوا س باختہ ہو گئے ہیں اور جگہ جگہ رک رک کر عدلیہ انتظامیہ اور اسٹیبلشمنٹ کو للکارنے لگے ہیں شاید ان کو ان کے مشیران بگاڑ رہے ہیں ان کو ان کے گھر پہنچانے نہیں بلکہ سرکاری گھر پہنچانے کے انتظامات کرا رہے ہیں یہ درست ہے کہ فی الوقت پنجاب اور مرکز میں ان کی اپنی حکومت ہے لیکن انتظامیہ اور اسٹیبلشمنٹ ساری کی ساری ان کے طابع فرمان نہیں ہے اگر ہوتی تو انہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا فی الحال تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میاں صاحب اپنی جلد بازی میں اپنی جیتی ہوئی بازی ہارنے لگے ہیں اپنے اردگرد اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تمام سیاسی جماعتیں اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپ رہی ہیں سب اس وقت تماشا دیکھ رہے ہیں کسی کو بھی نہ عوام کی نہ وطن عزیز کی فکر ہے۔

وطن عزیز گزشتہ کئی ہفتوں سے سیاسی انتشار اور بے چینی کا شکار ہے اس میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے تحریک انصاف اپنی بوٹیاں نوچ رہی ہے ان کا خیال تھا کہ میاں صاحب نااہل ہو کر صدمے کے باعث خاموشی سے گھر جا بیٹھیں گے اور اپنی حکومت کی باقی ماندہ مدت پوری کرانے کی کوشش کریں گے دو دن کی خاموشی نے تحریک انصاف اور شیخ رشید کی زبانوں کی لگام کھول دی جبکہ انہیں یہ احساس تو ہے کہ میاں صاحب کی گردن میں ابھی نیب اور احتساب کا پھندہ پڑنا باقی ہے کچھ یہی کیفیت خود میاں صاحب کے مخالفین کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ میاں صاحب کی رسی کھینچ دی گئی اور انہیں فوری طور پر نااہل قرار دے دیا گیا ہے جبکہ میاں صاحب کو للکارنے والوں کی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے وہ بھی کسی بھی وقت ٹکٹکی پر چڑھ سکتے ہیں میاں صاحب کو تو پھر یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کی جماعت برسر اقتدار ہے جبکہ نہ عمران خان

کو نہ ہی ان کے بغل بچہ شیخ رشید کو یہ امتیاز حاصل ہے اس کے برعکس ان کی اپنی جماعت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل چل پڑا ہے اور خود عمران خان صاحب کے گلے گلائی پڑ گئی ہے عمران خان صاحب نے پہلے تو بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاتون گلالئی کے مطالبے کہ میرا اور خان صاحب کا فون چیک کرلیا جائے حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی جسے انہوں نے خوش دلی سے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ خوش آئند قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس طرح دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا لیکن ان کے سرپرستوں نے یا اسٹیبلشمنٹ کے کسی ہمدرد نے انہیں مشورہ دے دیا ''پردے میں رہنے دو پردہ نہ اٹھاؤ پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا'' کہ خان صاحب اگر آپ نے اپنا بلیک بیری دے دیا تو بہت سے پردے اٹھ جائیں گے اور بہت سے پوشیدہ راز افشاں ہوجائے گے تب اچانک خان صاحب نے کمیٹی پر عدم اعتماد کردیا اور اپنا فون دینے سے انکار کردیا اپنی جگہ دوسروں کے فون چیک کرنے کی بات کردی اس سے نہ صرف ان کے مخالفین اور خود ان کے جماعت کی وہ کارکنان جو جماعت میں دوسرے یا تیسرے درجے میں ہیں انہیں جماعت کے فیصلوں اور ان فیصلوں کے کرنے والوں سے کہیں زیادہ صرف خان صاحب کے حکم کا انتظار رہتا ہے وہ بڑی الجھن کا شکار ہیں کیا واقعی خان صاحب نے کسی طرح کمزوری دکھائی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو ان کی جماعت کے بہت سے مخلص کارکن شاید ان کا ساتھ نہ دیں اور آنے والے الیکشن میں تحریک انصاف کو وہ کامیابی حاصل نہ ہوسکے جس کی امید انہیں ان کے سرپرستوں نے دلائی ہے جو ان کے لیے میدان صاف کرنے میں لگے ہوئے ہیں اب جبکہ قومی اسمبلی نے منتخب نمائندوں پر مشتمل کمیٹی کے قیام کا اعلان کردیا ہے اس کمیٹی میں کون میلا ثابت ہوتا ہے کون شفاف تب ہی معلوم ہوگا جب دونوں فریق پیش ہوں اب اگر عمران خان صاحب نے اپنا بلیک بیری جس کا مطالبہ خاتون گلالئی کررہی ہیں دے دیا تو بات آگے بڑھ سکے گی ورنہ جو کا لک خان صاحب کے لگ چکی ان کے حال ماضی کے حوالے سے اس کا صاف ہونا یقیناً دشوار ہوگا۔

میاں صاحب جوش جذبات میں وہ اور ان کے ساتھی جس طرح عدلیہ اور اس کے فیصلے کو للکار رہے ہیں وہ ان کے مخالفین کو راہ دے رہی ہے کہ وہ میاں صاحب کے خلاف اگر عدالت خود از خود نوٹس نہیں لیتی تو عدالت جائیں آج جو عوام ان کے ساتھ موج مستی کررہی ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی آڑے وقت میں ان کے ساتھ نظر آئے بقول ہمارے ایک دوست تجزیہ کار کے جن کا تعلق خود پنجاب سے ہے کہنا ہے کہ پنجاب کا مزاج برسوں سے J.P.O ہے ہم نے اس کی تشریح چاہی تو انہوں نے بڑی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ''جیہتے پاور اودے نال'' میاں صاحب کے ساتھ جو عوامی بہار آج نظر آرہی ہے یہ زیادہ سے زیادہ آٹھ نو مہینے کی ہے پھر تو الیکشن ہونے ہیں اس وقت تک تو ان سب کی تقسیم ہوچکی ہوگی اور میاں اینڈ کمپنی حیران پریشان میدان میں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہوں گے ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ میاں صاحب کے دور حکومت میں ان کے بھائی شہباز شریف نے پنجاب میں محنت کی ہے اور لوگوں کے عوامی کام بھی کیے ہیں ان سے پنجاب میں ان کی پوزیشن کچھ نہ کچھ بہتر ہوسکے گی اس بار پیپلز پارٹی کے جیالے بھی نئے نعروں کے ساتھ میدان میں اترے گے کچھ نہ کچھ پہلے سے بہتر سیٹیں نکال لیں گے کیونکہ زرداری پس پشت رہ کر کام کریں گے اور منظر عام پر بلاول بھٹو نظر آئیں گے اس سے نوجوانوں اور بوڑھوں کے ووٹ پیپلز پارٹی کو مل سکیں گے رضا ربانی نے اپنی پارٹی کے لیے بہتری کا ڈول ڈال دیا ہے اس طرح مسلم لیگ میں کچھ نہ کچھ ڈنٹ پڑ سکتا ہے میاں صاحب کو اس وقت ہوش کی ضرورت ہے جوش کی نہیں یہ بڑا نازک وقت ہے وہ اپنے چاہنے والوں کو ضرور ساتھ لے کر چلیں لیکن اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زبانوں پر قابو رکھے جوان کے حق میں بہتر ہوگا اللہ وطن عزیز کو ہر آفت ہر مشکل سے محفوظ رکھے اور آنے والے وقت میں نیک وصالح قیادت سے نوازے، آمین۔

گفتگو

اقبال بھٹی

''حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ وہ بارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔'' (البخاری باب حلاوۃ الایمان)

عزیزان محترم..... سلامت باشد۔

میں ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں کے طفیل اللہ رب العزت نے مجھے دوسری زندگی عطا کی گزشتہ دو ماہ سے میں ذہنی طور پر حاضر نہیں تھا جس کی وجہ سے کام میں بھی بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں اور قارئین کو ذہنی طور پر کوفت کا سامنا کرنا پڑا گزشتہ ماہ ہمارے ایک قاری جو خود بھی ایک پرچے کے ایڈیٹر ہیں اور کئی ادبی تنظیموں کے رکن بھی ہیں نے ایک کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے عورت کو فساد کی جڑ کہا جو یقیناً غلط بات ہے گویا انہوں نے اماں حوا، بی بی پاک مریم، ام المومنین کی نادانستہ طور پر توہین کی۔ ہم یہ واضح کر دیں گفتگو میں شائع ہونے والے خطوط لکھنے والے کی اپنی رائے ہوتی ہے اس کا ادارے کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بہر حال جن قارئین کی دل آزاری ہوئی ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی اصلاح کریں گے گزشتہ ماہ ہمارے ایک لکھاری حسیب اشرف کی کہانی ''دل مشکل'' پر ادیب کا نام غلطی سے حسین اشرف لکھا گیا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

اس ماہ ایشیا کے سب سے عظیم جاسوسی ناول کار جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے بانی محترم ابن صفی کی برسی کے حوالے سے کچھ تحریریں گوشہ ابن صفی کے عنوان سے شامل اشاعت ہیں۔ یہ محترم ابن صفی مرحوم کو ان کے چاہنے والوں کا خراج عقیدت ہے جو فیس بک پر ابن صفی فیز کلب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ہم شکریہ کے ساتھ اسے نئے افق کی زینت بنا رہے ہیں اس کا دوسرا حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے گا۔

اب آیئے اپنے محبت ناموں کی طرف

ریحانہ سعیدہ..... لاہور۔ سلام۔ بڑے عرصے بعد اس گلشن کی باسی بنی ہوں۔ رسالے میں کچھ تبدیلیاں خوش آئند ہیں لیکن کچھ نے رسالے کے فطری حسن کو ختم کر دیا۔ کہانیوں پہ تبصرہ سے پہلے آج عدالتی فیصلہ آیا ہے اس پر بات کرنا چاہوں گی۔ عدالت نے صادق و آمین نہ ہونے کی وجہ سے نواز شریف کو نا اہل قرار دیا ہے لیکن سوال یہ کہ ہمارے ملک میں صادق و آمین ہے کون کیا ایک عام سبزی والا جو ناپ تول میں کمی بیشی نہیں کرتا۔ ایک قصاب جو مردہ مر غیوں اور گدھے کا گوشت نہیں بیچتا۔ تو کیا ہم اقتدار کا ہما ان کے سر پہ بٹھا سکتے ہیں۔ یہی لوگ روپ بدل بدل کے آئیں گے اور یہ سب نا اہل ہیں زرداری تو بین الاقوامی لیول پر مسٹر ٹن پرسنٹ کے نام سے مشہور ہیں عمران نے تو یہودیوں سے پیسہ لیا اور نواز کا پانامہ۔ عدالتی فیصلے نے پاکستان کی سیاست کے لئے غلط راہ کھول دی ہے۔ ہر پارٹی دوسری کو نا اہل کروانے میں لگی رہے گی۔ جج صاحبان کو چاہیے تھا کہ پانامہ کے حوالے سے سزا سناتے لیکن وزارت سے علیحدہ نہ کرتے تا کہ انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوتے۔ اور عوام میں انارکی اور انتشار نہ پھیلتا اور عدالتی فیصلہ سیاسی پارٹیوں کی ذاتی

انا کی جنگ بھی نہ بنتا۔ سرفروش بہت اچھی کہانی تھی کافی عرصے بعد نئے افق اس کیانی کی وجہ سے پہلے جیسا لگا۔ مرشد بھی اچھی کاوش ہے۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں غیر ضروری طوالت کی وجہ سے مزہ نہیں دے رہی۔ دل مشکل ماں کے جذ بات کی عکاسی کرتی ہوئی اچھی کہانی تھی۔ ریاض بٹ تو واقعی بٹ صاحب ہیں مزے کا لکھتے ہیں لائیو سا آپ کی وجہ سے میں چلودوں کو پلسیا سمجھنے لگی ہوں۔ سنہرے لوگ بھی اچھی تھی کہ منزل کے لئے دو گام چلنا شرط ہوتی ہے اور منزل سامنے آجاتی ہے۔ زرین قمر کی ایفائے عہد بھی اچھی ہے۔ پتھارے والے کے اینڈ نے مزہ دیا اور صداقت صاحب کی روٹی کے دل کو اداس کر دیا۔ اسحاق صاحب کا میلا پراتا صاحب اقتدار لوگوں کے منہ پہ طمانچہ ہے۔ جذبہ عشق میں کئی جگہ جھول تھا تاہم ٹھیک ہی رہی۔ وفا کی دیوی متاثر نہیں کر سکی ہر رشتے کے حقوق ہوتے ہیں جو نبھانا ہی عورت کی ذمہ داری ہے فن پارے میں پچھلے دو رسالوں میں تو انتہائی بے تکی کہانیاں تھیں جن کا کوئی سر پاؤں نہیں تھا۔ کالنگ کارڈ کا موضوع پرانا تھا۔ تاہم بہتر تھی۔ باقی کہانیاں کچھ خاص نہیں۔ خوش بوئے سخن کسی رسالے کا ہو کالج یونیورسٹی کا میگ ہو یا کسی آرگنائزیشن کا رسالہ اگر شاعری میں غزل اور نعت کے ساتھ حمد ہو تو پہلے حمد پھر نعت پھر غزلیات ہوتی ہیں۔ یہ ایک مسلم کی روایت ہے رسالہ اس بات کا خیال کرے تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ عشق مجازی پڑھ کے نعت پڑھنا عجیب سا ہے۔ اب اجازت سب لکھنے والوں کو میرا آداب اور تنقید صرف اصلاح کے لئے ہے۔

ریاض بٹ۔ حسن ابدال۔ السلام علیکم ماہ اگست کا منفرد سرورق لیے ہر دل عزیز انداز میں شمارہ 22 جولائی کو باسلامت پوسٹ ملا اس بار وقت پر پرچہ مل گیا ورنہ پچھلی بار تو پرچے کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئی تھیں اور جب بازار سے پرچہ لیا تو اس کا مطالعہ تو ہو سکتا تھا لیکن خط لکھ کر ارسال کرنے کا وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ خیر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے بہرکیف 10 جولائی کو اعزازی پرچہ مل گیا تھا اب اس ماہ کے شمارے کی طرف آتے ہیں سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی وہ امریکا کا اصل چہرہ دکھا رہے ہیں امریکا مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے ایک طرف اپنا اسلحہ بیچ رہا ہے دوسری طرف مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہا ہے کاش مسلمان اب بھی سمجھ جائیں اور آپس میں لڑنے کی بجائے اتحاد کر لیں گفتگو کی محفل میں داخل ہوئے تو سب سے اطمینان بخش بات یہ پڑھی کہ ہمارے محترم اقبال بھٹی صاحب اب کافی بہتر ہیں میری خدا بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ باری تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین، کرسی صدارت پر مجید احمد جائی صاحب براجمان ہیں مبارک ہو آپ کا خط حسب معمول بڑا مدلل اور خوب صورت خیال کا مرقع ہے۔ اس وقت امت مسلمہ کو اتحاد کی ضرورت ہے، ورنہ ہمارا اس سے بھی بدتر حال ہوگا پچھلے شمارے میں، میں نے اپنا نیا نمبر دیا تھا میرا موبائل گم ہو گیا تھا وہ نمبر میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر بند کرا دیا ہے آپ مجھ سے نئے نمبر پر رابطہ کریں میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ صائمہ نور بہن کیسی ہو، اللہ تمہیں سدا خوش رکھے اور کوئی غم فکر تمہارے نزدیک نہ آئے آمین، آپ کی یہ اعلیٰ ظرفی اور ادب شناسی ہے کہ آپ میری کہانیاں پسند کرتی ہیں اور میرا حوصلہ بڑھاتی ہیں شکریہ، زرین قمر بہن آپ کی پرچے میں آمد اچھی لگی آپ دل سے لکھتی ہیں اور بہت اچھا لکھتی ہیں پرنس افضل شاہین آپ کی ماں جیسی ساس کے انتقال کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین ثم آمین اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، میرا تبصرہ اور ذوق آگہی میں میرا انتخاب پسند کرنے کا بے حد شکریہ محمد رفاقت صاحب کیسے ہیں اب تو ماشاءاللہ آپ تبصرہ خوب کرنے لگے ہیں لفظوں سے کھیلنا آپ کو آ گیا ہے ویل ڈن ایم حسن نظامی آپ کا تبصرہ بھی قابل تعریف ہے میرا خط اور کہانی اللہ رکھا آپ کو بھی پسند آئی جس کے لیے مہربانی اور نوازش میں تو حقیقی زندگی کے کرداروں پر چار دیواری کی کہانیاں لکھتا ہوں اس لیے یہ کردار آپ کو جانے پہچانے لگتے ہیں ریاض حسین قمر بھائی آپ نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے میں آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں ویسے بھی ایسے معاملات میں سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہوتا میرا خط اور کہانی آپ کے اعلیٰ ذوق پر

پوری اتری، جس کے لیے ممنون و مشکور ہوں خدا آپ کو صبر اور سکون عطا فرمائے، آمین۔ پیارے بھائی عمر فاروق ارشد کیسے ہو جی دار بندے ہو اور مجھے آپ کا جیداری سے کیا ہوا تبصرہ پسند آتا ہے میرا خط سب سے پہلے شائع ہونے پر مبارکباد دینے کا شکریہ میری تحریر کردہ تفتیشی کہانی آپ کو پسند آئی اور آپ میری تفتیشی کہانیوں کے فین ہیں جس کے لیے یہ بندہ ناچیز آپ کو دعائیں ہی دے سکتا ہے اور شکریہ ہی ادا کر سکتا ہے باقی آپ کی یہ بات سر آنکھوں پر کہ مجھے اب کہانیوں میں جدت لانے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلے میں ایک گزارش ہے کہ تفتیش کہانیوں میں زیادہ جدت لانے سے ان میں سسپنس چاشنی اور دلچسپی ختم نہیں تو کافی حد تک کم ضرور ہو جاتی ہے تفتیشی کہانیوں میں تفتیش کے لیے سیڑھیوں سے جانا پڑتا ہے اگر لفٹ سے جائیں تو آپ ہی لوگ کہہ اٹھیں گے بور کہانی تھی ویسے میں ہر کہانی میں تھوڑی بہت جدت اور انفرادیت ڈالنے کی ضرور کوشش کرتا ہوں اس ماہ کی کہانی سیانا کوا ذرا غور سے پڑھ کر بتایئے گا سید محمود حسن محفل میں پہلی بار آنے پر خوش آمدید، ذرا آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ آیئے گا دل مشکل حسین اشرف نے کیا خوب کہانی لکھی ہے لحہ لحہ رلاتی اور سوچ کے در وا کرنے والی کہانی ہے واقعی ماں ماں ہوتی ہے اور وہ ایسی ہی مائیں ہیں جن کے قدموں تلے جنت ہے ایک سو سولہ چاند کی راتیں کی یہ قسط بھی تیزی سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہے کہانی پر عشنا کوثر سردار کی گرفت مضبوط ہے اور وہ قاری کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں سنہرے لوگ محمد سلیم اختر کی ایک بہترین کہانی ہے ہر اندھیری رات کی سحر ضرور ہوتی ہے صرف انسان کو ہمت ہونا چاہیے روزی کی زندگی بھی آخر روشن ہو گئی اور اس کے اردگرد پھیلے اندھیرے دور ہو گئے محمد سلیم اختر ایسی ہی کہانیاں لکھنے کی وجہ سے مشہور ہیں سرفروش تفسیر عباس بابر کی ایک لازوال تحریر ہے آخری قسط بہت شاندار ہے وطن کی مٹی سے پیار کی ایک انمول مثال ہے باقی تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں اب بات ہو جائے باقی سلسلوں کی کترنیں پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں ذوق آگہی میں سب انتخاب اچھا ہے لیکن ایم حسن نظامی پرنس افضل شاہین جاوید احمد صدیقی عبدالجبار رومی انصاری اور شہروز ناپ پر ہیں خوش بوئے سخن میں بھی سارا انتخاب اپنی مثال آپ ہے اب اجازت۔

صائمہ نور.....ملتان آداب! اُمید کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے کرم و رحمت سے ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں، مسکراہٹوں سے نوازے رکھے اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ جوان رہے۔ آمین! ماہ اگست کا نئے اُفق جلد ہی مل گیا۔ ٹھہریئے، سب سے پہلے تمام اہل وطن کو جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ نئے اُفق کی تحریریں تو اگست کی نوید سنا رہی ہیں لیکن گفتگو میں جشن آزادی کی بات نہیں کی گئی اور نہ ہی سرورق پر آزادی مبارک لکھا گیا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی صاحب بجا فرما رہے ہیں، ملکی حالات کبھی اُن کے سامنے ہیں، یہاں بھی کسی تیسرے کا ہاتھ ہے۔ جو کٹھ پتلی کی طرح نچا رہا ہے۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف نااہل قرار دیئے گئے ہیں۔ اب نہ تو پارٹی کے صدر بن سکتے ہیں، نہ الیکشن لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی دوسری کوئی پارٹی تشکیل دے سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آج تک کسی وزیراعظم نے اپنی مدت پوری کی ہے جو یہ کرتے، جمہوریت کا رونا تو رویا جاتا ہے جمہوریت دکھتی کہیں نہیں۔ ملکی مسائل جوں کے توں ہیں بلکہ بڑھتے جا رہے ہیں اور سیاستدانوں کو کھیل تماشے سے فرصت ہی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے جو نیا وزیراعظم آئے گا وہ دودھ کا دُھلا ہوگا۔ کیا عدلیہ ملکی لوٹی ہوئی رقم واپس دلا سکے گی۔ سیاسی گفتگو ہر طرف ہو رہی ہے، ہم ذرا ادبی بات کرتے ہیں۔ انکل مشتاق احمد قریشی صاحب کو ناقص رائے دیتے ہیں کہ ادبی کالم لکھا کریں۔ یا کم از کم ادب اور ادیبوں کے مسائل پر ہی کچھ لکھ دیں۔ گفتگو میں ہماری دُعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول کر لیں، ہمارے انکل اقبال بھٹی صاحب صحت یاب ہو کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکے ہیں۔ اللہ کرے جگ جگ جیئیں۔ سلامت رہیں تا قیامت رہیں۔ آمین! صدارت مجید احمد جائی کے حصے میں آئی، زریں قمر گفتگو کی محفل میں آئیں خوش آمدید، پرنس افضل شاہین، جزاک اللہ، محمد رفاقت، خوشیوں کے ساتھ سلامت رہیں، ایم حسن نظامی، ریاض حسین قمر

محبتوں کے لئے شکر گزار ہوں۔ گفتگو کے شرکاء کم ضرور ہیں لیکن گفتگو بہت پیاری کر رہے ہیں اور جو کچھ عرصہ سے غیر حاضر ہیں جلد از جلد اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ اقراء نے قلبی سکون دیا۔ دل مشکل نے دل کے ساتھ دُنیاوی حالات بھی مشکل میں کر دیئے۔ سیانا کوا کیا کمال کی کہانی ہے۔ گھوڑی کی چوری انوکھی کہانی اور خیر دین بڑا خوش نصیب ہے۔ جس کی گھوڑی واپس مل گئی۔ چلیں چند دن اگر تھانے میں گزارے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ چرایا ہوا مال بھلا کون واپس کرتا ہے۔ پھر اگر یہ چوری پاکستان میں کی گئی ہو تو واپسی خواب لگتی ہے۔ لیکن یہاں کچھ انوکھا ہی ہو گیا۔ جس ملک کے حکمران ہی چور ہوں وہاں چوریاں تو معمول ہوں گی ناں۔ زمرد بیوقوف تھا جو نورین کے ساتھ معاملات میں کوئی ثبوت نہ رکھ سکا۔ سرفروش نے اچھا تاثر قائم کیا۔ ویری گڈ۔ سنہرے لوگ، ایفائے عہد۔ پتھارے والے، ہو جذبہ عشق گر، وفا کی دیوی، میلا پراتا، روٹی کا ٹکڑا، اچھی تحریریں پڑھنے کو ملی۔ فن پارے بھی معیاری اور زبردست رہے۔ مرشد کامیابی کے ساتھ آگے کو بڑھ رہی ہے۔ خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی خوب ہیں۔ نئے افق میں کچھ نئے سلسلے شروع کریں جس سے قارئین میں دلچسپی مزید بڑھے۔ کوئی چٹ پٹ سا، سفرنامہ شروع ہونا چاہیے یا کسی ایک ادیب کی سوانح حیات پر لکھا جائے۔ ایسے بہت سے سلسلے ہیں جن کو شروع کر کے قارئین کی تعداد مزید بڑھ سکتی ہے۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ قابل قدر اقبال بھٹی صاحب سلام عرض امید ہے آپ اور سبھی احباب خیر یت سے ہوں گے اگست کا پرچہ اپنی پوری آب و تاب اور روایتی انداز سے جلوہ گر ہوا اچھا معیاری اور منفرد پایا تحریروں کا انتخاب، پروف ریڈنگ اور بائنڈنگ بلاشبہ آپ جیسے کامیاب و کامران ایڈیٹر کی مرہون منت ہے اور آپ کی بیلراں محنت اور کوششیں اسے پہلے سے ساتویں افق تک پہنچا رہی ہیں میں آپ کی بے پناہ محنتوں کی داد دیتا ہوں، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک حکمرانوں کے علاوہ عوام الناس کے لیے بھی دست عبرت ہے۔ گفتگو میں بھٹی صاحب کی صحت یابی کا سن کر دلی خوشی ہوئی خداوند کریم انہیں جلد از جلد شفا دے۔ پرچے پر سبھی احباب نے دل کھول کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا اور ہمیں بھی اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھا یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے ہم بھی اس بزم کا حصہ ہیں اور ہمیں بھی اپنی گفتگو کرنے کی کھلم کھلا اجازت ہے تو اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو احباب ہم سے اور ہمارے پرچے سے کسی بھی وجہ سے ناراض ہیں ناراضگی چھوڑ کر واپس لوٹ آئیں کہ بستی ہوئی نگری ایک بندے بنا بھی سونی اور ویران لگتی ہے اور گھونسلہ تو ایک ایک تنکے سے ہی مکمل ہوتا ہے نا، سید محمود حسن کو پہلی انٹری پر ویلکم امید ہے وہ آئندہ بھی باقاعدگی سے اپنی حاضری کو یقینی بنائیں گے، طاہر قریشی صاحب اللہ تعالیٰ کی صفات بڑی باریک بینی سے واضح فرما رہے تھے پڑھ کر وجود کے سبھی جذبے معطر ہو گئے۔ طویل تحریروں میں دل مشکل ایک سو سولہ چاند کی راتیں، سرفروش کا آخری حصہ اور پرچے کی آخری تحریر مرشد بے حد پسند آئیں تمام رائٹرز نے اپنی اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا۔ سیانا کوا، سنہرے لوگ، ایفائے عہد اور پتھارے والا ٹاپ پر رہیں۔ روٹی کا ٹکڑا زندگی کے تلخ اور بنیادی پہلوؤں کی خوب صورتی سے نشاندہی کی گئی ہو جذبہ عشق گر اور وفا کی دیوی بھی معیاری تحریریں پائیں فن پارے میں ابن عبداللہ، محمد فاروق اور سحرش علی نقوی کی سوچ کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ ذوق آگہی کے انتخاب شاعری اور مراسلے ساتھیوں کی خوبصورت اور منفرد تحریریں جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ خوش بوئے سخن، شاعری کا آئینہ ہوتی ہے اور خوب صورت شاعری تو جیسے سونے پر سہاگہ اچھا معیاری اور باذوق سلسلہ ہے جو بے حد پسند آیا۔ ساتھیو! آپ کی بے پناہ محبتیں میرے لیے بے بہا سرمایہ ہیں اور میرا سابقہ نمبر بلاک ہونے سے احباب سے رابطہ منقطع ہوا معذرت کے ساتھ نیا نمبر نوٹ فرمالیں 03046629024 رابطے بحال رہیں تو دوستیاں اور تعلق داریاں برقرار رہتی ہیں رابطے کٹ جائیں تو تنہائیوں کا زہر مقدر بن جاتا ہے۔ خوش رہیں خوشیاں بانٹیے اور اپنا خیال رکھیں ہم سبھی کا اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو۔

بارش علی سمیر...... جیجے والا۔ صد قابل احترام طاہر صاحب اور ہر دل عزیز اقبال انکل السلام علیکم شمارے میں میری یہ پہلی انٹری ہے امید کرتا ہوں اہل ادب کی طرف سے خوش آمدید کہا جاؤں گا بازار میں شمارے تو اور بھی بہت ملتے ہیں کم پیسوں میں اتنا معیاری پرچہ مل جائے تو اور کیا چاہیں ویسے بھی ادب کا یہی معیار ہے کہ سستا فراہم کیا جائے طاہر صاحب بے شک آپ خدمت کرر ہے ہیں۔ میں پیشہ کے اعتبار سے مزدور ہوں اسی لیے مضبوط ہوں پاکستان کا جوان ہوں اپنے ماں باپ کا مان ہوں نئے افق کا میں عرصہ چار سال سے شیدائی ہوں یہ پرچہ بہت منفرد اور اپنی نوعیت کا کوئی ثانی نہیں رکھتا نئے افق کی ٹیم جتنی محنت پرچے کے اک اک گوشے پر محنت کرتی ہے اتنی محنت میں تو لوگ پورا پورا پرچہ مارکیٹ میں لے آتے ہیں اور یہی اک وجہ ہے اس پرچے کی مقبولیت کی فن پارے مختصر کہانیاں لکھنے والوں کے لیے بہترین سلسلہ ہے اس سے لکھنے والوں میں جذبہ اور ولولہ پیدا ہوتا ہے ذوق آگہی کم وقت میں بہت آگہی پیدا کرتا ہے خوش بوئے سخن کی شاعری کا اک اپنا ہی معیار اقبال صاحب بڑے افسوس کے ساتھ اگلی سطور لکھ رہا ہوں جناب اعلیٰ میری ماں عورت ہے میری بہن بھی عورت ہے رب کریم کے کرم سے میں دو بچوں کا باپ ہوں ایک بیٹا اور ایک بیٹی یعنی کہ میری بیٹی بھی ایک عورت ہے اور تو اور میرے بچوں کی ماں بھی ایک عورت ہی ہے نا تو میں قبل از اسلام سے ہوں اور نہ ہی قوم لوط میں سے ہوں مجید احمد جائی عورت کے وصف بیان کرر ہے تھے ان کے نیک خیالات جان کر بہت دکھ ہوا موصوف کو بحیثیت ایک ادیب عورت کی عصمت کا پتا ہونا چاہیے۔

علی اصغر انصاری...... منچن آباد۔ آداب سر اقبال بھٹی صاحب سرورق بہت شوخ تھا جو کہ اچھا لگا دستک انکل مشتاق احمد قریشی بالکل درست فرماتے ہیں انکل کی گہری سوچ کو سلام گفتگو میں ایسی گفتگو کہ عورت کو اپنے عورت ہونے پر شرم آئے مجید جائی بہت دکھ ہوا ادی زرین قمر کا خط اچھا ہے بھائی پرنس افضل شاہین کی ساس کا بہت دکھ ہوا عمر فاروق ارشد طویل خط کے ساتھ محفل کو سجا رہے ہیں سید محمود حسن بھائی کچھ تو لکھا ہوتا خط میں صرف اپنے مطلب کی بات کہہ کر خط ختم بہت سے یار دوست غیر حاضر تھے جن کی بہت کمی محسوس ہوئی امید کرتا ہوں اگلی بار محفل میں خوب رونق ہوگی عبدالغفار عابد صاحب سے پتا چلا کہ دستگیر شہزاد صاحب نے نئے افق میں لگنے والی تحریر سچی کہانیاں میں بھی بھیجی ہے کتنے افسوس کی بات ہے اقبال بھٹی صاحب میں امید کرتا ہوں آپ اس بات کا نوٹس لیں گے اقرا طاہر قریشی صاحب بہت اچھا سلسلہ ہے تفسیر عباس بابر کی کہانی سرفروش جذبہ ایمان پر مبنی تحریر ہے سلیم اختر کی کہانی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی کہانیاں تو بقیہ بھی اچھی ہی ہوں گی لیکن اپنی مصروفیت کے باعث ابھی پڑھنے سے قاصر ہوں فن پارے اور ذوق آگہی سپر ہٹ ہیں۔

حسین خواجہ...... سٹی منچن آباد۔ السلام وعلیکم جناب طاہر قریشی، اقبال بھٹی صاحب۔ لگتا ہے اس دفعہ شمارہ چائنا سے شائع کرایا ہے سرورق زبردست بلی کے ساتھ ساتھ تھیلے سے اور بہت کچھ باہر آئے گا مشتاق احمد قریشی صاحب بہت خوب جناب اچھا جی تو اب دو قدم محفل گفتگو کی طرف او ہو جناب اقبال بھٹی صاحب آپ کی علالت کا ذکر جناب عبدالغفار عابد صاحب کرر ہے تھے مالک دو جہاں آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے آمین، پہلا خط ہے مجید جائی کا جناب فرماتے ہیں عورت کی مکاری کوئی نہیں جان سکا وہ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں جہاں میں جتنے بھی فساد ہوتے ہیں عورت کے دم سے ہیں جائی صاحب آپ کی سوچ کو سلام واہ واہ کیا فرمایا ہے آپ نے، میرے پیارے بھائی عورت کی عزت کرنا سیکھو ظہور اسلام نے عورت کو بہت عزت بخشی ہے بہر حال ہر انسان کی اپنی سوچ ہے دوسرا خط ہے جی بہن زرین قمر کا بہت خوب تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا خط ہے جی ہمارے بہت پیارے ساتھی ہمارے ضلع بہاولنگر کی شان پرنس افضل شاہین صاحب آستین کے سانپ اتنی جلدی نہیں مرتے پانامہ کیس کا فیصلہ قوم کے حق میں ہوگا سوال ہی نہیں پیدا

ہوتا پرنس صاحب ہم لوگ اپنی ذات کا تو احتساب کر نہیں سکتے دوسروں کا خاک کریں گے آپ کی ساس کا بہت دکھ ہو مالک دو جہاں ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ جناب تبصرہ بھی آپ کا کمال کا ہے پیارے ایم حسن نظامی آپ کی دوستی زندگی کی کمائی ہے آپ بہت کمال کا لکھتے ہیں آپ جیسا تبصرہ کرنا تو دور کی بات جس دن مجھے آپ کی نقل کرنی آ گئی اس دن میں خود کو کامیاب انسان سمجھوں گا اتنا تسلسل قائم رکھنا صرف آپ کا ہی خاصہ ہے 25 کی شام کو میں آپ کے شہر میں تھا لیکن افسوس آپ سے نہ مل سکا عمر فاروق ارشد ریاض حسین قمر اور بھائی رفاقت بہت خوب سید محمود حسن سرویلم مجھے ذاتی طور پر آپ کی کہانی کا انتظار رہے گا اچھا جی تو اب باری ہے کہانیوں کی ریاض بٹ صاحب کی سیانا کوا بہت زبردست ہے میرے پیارے بھائی تفسیر عباس بابر صاحب کا شاہکار سرفروش لاجواب تحریر ہے جائی بھائی پلیز اک بار بہن عائشہ بٹ کی تحریر وفا کی دیوی کا مطالعہ ضرور کرنا شاید اس سے آپ کو عورت کی عصمت کا اندازہ ہو سکے فن پارے میں بہن صوفیہ کاشف بہت خوب بہن سحر علی نقوی زبردست بہن ریمل آرزو لاجواب دستک بہن مہوش طالب اتنا حساس ہونا بھی انسان کو مار دیتا ہے ذرے کو کوزے میں بند کر دیا آپ نے ویلڈن ذوق آگہی ایس حبیب خان، ایم حسن، افضل شاہین، گل مہر، عائشہ صدیقہ، ندا چوہدری اور شہروز بہت بہت خوب، سستی شہرت کے بھوکے لکھاری ہم سب کے پیارے نئے افق دشمن بنے ہوئے ہیں پتا نہیں لوگوں کو کیا ملتا ہے نئے افق کو خراب کر کے ادارے کی پالیسی کی خلاف ورزی کر کے بڑا افسوس ہوتا ہے نیچ لوگوں پر کم ظرف لوگوں نے معیار ہی گرا دیا ہے ماہ اپریل کے شمارے میں لگنے والی تحریر قیمت ہمارے پیارے بھائی دلگیر شہزاد صاحب نے (سچی کہانیاں) میں بھی ارسال کی اور اس شمارے میں بھی جناب کی کہانی ہے کتنی غلط بات ہے جی ایک ہی کہانی دو شماروں میں ارسال کرنا کیا اس عمل سے زیادہ شہرت ملتی ہے دلگیر شہزاد صاحب پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو ادب کو پڑھنے والے ہیں وہاں وہاں نئے افق پایا جاتا ہے دور حاضر میں نئے افق اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا اگر کسی احباب کی میری وجہ سے دل شکنی ہوئی ہو تو میں معافی کا طالب ہوں میں بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ مالک دو جہاں تمام امت مسلمہ کا حامی و ناصر ہو آمین۔

مجید احمد جائی..... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اہل پاکستان کو جشن آزادی مبارک! اُمید واثق ہے اللہ تعالیٰ کی بے بہا نعمتوں سے لطف اُٹھاتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی کے ساتھ ہنستا مسکراتا رکھے، امن والی زندگی اور پُرسکون نیند عطا کرے، اپنی نعمتوں، رحمتوں کا نزول جاری و ساری رکھے۔ دشمن کے شر سے محفوظ اور نیک اعمال کرنے کی توفیق دے آمین ثم آمین! آج کے دور میں ہر شخص پریشان نظر آتا ہے، کیا کسی نے سوچا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔؟ کسی نے اپنا محاسبہ کیا ہے۔؟ قصور اپنا ہوتا ہے اور الزام دوسرے پر تھونپ کر خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی میں سکون نہیں ہوتا، ہر لمحہ پریشان، اُداس رہتے ہیں۔ اپنی مصروفیات سے چند لمحے نکال کر خود کے لیے بھی سوچیں، سکون پائیں گے۔ اپنے شب و روز کو دیکھیں کہ کیسے گزرے۔ کہیں کسی کا حق تو نہیں دبایا، کسی کو ہماری وجہ سے تکلیف تو نہیں پہنچی، جانے انجانے میں کسی کی دل آزاری تو نہیں ہوئی۔ فرض ادا ہوئے کہ نہیں۔۔۔۔۔ جب آپ ایسا کریں گے تو سکون پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو سکون اور مسرت عطا فرمائے آمین! ماہ اگست کا 2017 کا شمارہ نمبر 07 جلد نمبر 41 تمام تر جلوؤں کے ساتھ جلد ہی میری دسترس میں آیا۔ سرورق بہت خوبصورتی سے مزین کیا گیا ہے۔ کسی دوسری مخلوق کو دکھایا گیا ہے تجسس بھرا سرورق بہت سے سوالات ذہن کی اسکرین پر ابھارتا ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب ملکی اور غیر ملکی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُن کا ہر کالم جامع، معلوماتی، تحقیقی اور مدلل ہوتا ہے۔ ابھی اسی کالم ہی کو دیکھ لیں ''امریکی بلی تھیلے سے باہر آ گئی'' جو حقائق آشکار کیے گئے ہیں، ہر مسلمان جانتا ہے لیکن دشمن کے اشارے پر اپنے ہی بھائی کی گردن کاٹ رہا ہے۔ دشمن چال باز ہے اور اُس کی ہر چال نرالی ہوتی ہے، وہ خود سامنے نہیں آتا اور ضمیر فروشوں کو خرید کر اپنے

منصوبوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلم امہ کو شعور بخشے اور توفیق دے کہ وہ کلیسا کی ان سازشوں کو سمجھیں اور عقل سے کام لیتے ہوئے آنے والی آفت سے بچیں، اللہ تعالیٰ ہماری قوم کی پوری مسلم امہ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائے، مسلمانوں کی نادانیوں، غلطیوں کو معاف فرمائے آمین۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دُعا پر ہاتھ اُٹھا کر ہم بھی آمین کہہ رہے ہیں۔ گفتگو میں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ہمارے پیارے ایڈیٹر جناب اقبال بھٹی صاحب صحت یاب ہو کر جلد ہی اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔ ہم خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اللہ تمام بیماروں کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین! پہلا لیٹر میر الگایا گیا، بہت شکریہ زرین قمر کا پہلی بار خط پڑھا، ماشا اللہ خوبصورت الفاظ سے مزین لیٹر ہے۔ دستگیر صاحب کا معلوماتی تعارف خوب رہا، اس کی داد ہم بھی دے چکے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری وساری رہنا چاہیے۔ اب دیکھیں ناں اس بار کسی کا انٹرویو بھی نہیں۔ پرنس افضل شاہین کمال کی انٹری کرتے ہیں۔ محمد رفاقت صاحب، احمد پور شرقیہ کا حادثہ واقعی خون کے آنسو رلاتا ہے۔ اب سارا الزام حکومت کو بھی نہیں دیا جا سکتا، پیٹ کی بھوک انسان کو کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کیا چیز تھی جو ان کو مجبور کرتی تھی کہ جان کی بازی بھی ہار گئے، چار سو سے زائد افراد جل کر لقمہ اجل بن گئے۔ روح کانپ اٹھی لیکن قوم نے سبق حاصل نہ کیا اور یک بعد دیگرے کئی حادثے ہوئے اور عوام وہی تیل بھرتی نظر آئی۔ ریاض حسین قمر صاحب بہت شکریہ۔ آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں لیکن کیا کریں ہم بھی کہیں نہ کہیں قصوروار ہیں۔ ہم آواز نہیں اُٹھاتے، آواز دبانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ریاض بٹ غیر حاضری کی خاص وجہ ہم سے حاضر رہنے کا وعدہ لے کر خود غائب کیوں۔؟ اقراء سے دل منور کیا اور کہانیوں کی نگری میں خوطہ زن ہوئے۔ دل مشکل، کمال کی تھی۔ سیانا کوا، ریاض بٹ صاحب گریٹ، آخر تک تجسس قائم رہا اور گھوڑی کی چوری تو خواہ مخواہ کہانی کا حصہ بنی۔ اتنی پیاری کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ سنہرے لوگ خوب رہی، سرفروش خوبصورت اختتام کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ ایفائے عہد، پتھارے والا، میلا پراتا، وفا کی دیوی زبردست کہانیاں ہیں۔ مرشد، کمال چل رہا ہے۔ مستقل سلسلے خوش بوئے سخن، فن پارے، ذوق آگہی اچھے رہے۔

مسکان ظفر بھٹی..... جوہر ٹاؤن لاہور۔ سلام مسنون! اس ماہ کا نئے افق 20 جولائی کے بعد مل گیا سرورق سے ہوتے ہوئے ایمان افروز کلمات پڑھنے کے بعد خطوط کی محفل میں پہنچی۔ دنیائے ادب کے ہر دلعزیز ادیب اور آٹھ دس رسالوں کے ایڈیٹر صاحب جناب مجید احمد جائی صاحب عورت ذات پر خوب برسے اور تمام فساد کی جڑ عورت کو قرار دیا اور پھر یہی ہرزہ سرائی محترمہ صائمہ کرتی نظر آئیں، مجید جائی صاحب خود عورت کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں اور صائمہ مجید عورت ہو کر عورت پر کیچڑ اچھال رہی تھیں کم از کم عورت ذات ہونے کے ناتے کچھ خیال کرتیں، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا لیکن جب تک عورت حضرت حوا علیہ السلام تخلیق نہ ہوئیں اس وقت تک انسانیت نہ بڑھ سکی۔ عورت کی یہ فضیلت، عظمت، شان وشوکت اور تقدس وحرمت ہے کہ ہر نبی کی والدہ محترمہ عورت ہے۔ عورت وہ عظیم حقیقت اور عظمت وشان وشوکت والی ہے کہ پورے قرآن مجید میں سوائے حضرت مریم علیہ السلام کے کسی بھی عورت کو نام لے کر نہیں پکارا، دونوں جہانوں کے موجب نبی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پاک تمام فرقوں کے علما بڑے فخر اور شوق سے بیان فرماتے ہیں کہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے ہیں اور میں صلی اللہ علیہ وسلم حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوں اور پھر پوری کائنات کے نبیوں، رسولوں، پیغمبروں اور ان کی آل اولاد میں سے یہ فضیلت صرف حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہے کہ ان کی روح تقدس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خود قبض کی تھی۔ دنیا میں جتنے بھی عظیم لوگ گزرے ہیں سب عورت ذات سے پیدا ہوئے ہوائی جہاز سے لے کر دھاگے والی سوئی تک ایجادات کرنے والے عظیم لوگ عورت ذات سے پیدا ہوئے، عورت کا ایک روپ ماں کا ہے، بہن بیٹی اور بہو کا ہے، حس

گھر میں عورت نہیں ویرانی وہاں ہے اور لگتا ہے الوؤں کا مسکن ہے عورت کے دم سے پوری دنیا کی رونقیں ہیں عورت ایک طرف مرد کی تسکین کا موجب بنتی ہے دوسری طرف اسے زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتی ہے۔ روحانیت کے مقام پر پہنچانے کے لیے عورت کا نمایاں مقام ہے، معاشرے کے اتار چڑھاؤ ترقی تنزلی میں عورت کا نمایاں کردار ہے پورا معاشرہ عورت کے وجود سے مستفید ہو رہا ہے ماں ہے تو وقت کی گرمی سے ٹھنڈی چھاؤں کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ بہن ہے تو بھائیوں کو غیور بناتی ہے بیوی ہے تو نہ صرف نسل انسانی کو بڑھاتی ہے بلکہ مرد کی خواہشات کی تکمیل کرتی ہے اور معاشرے میں نمایاں مقام پیدا کرنے کے لیے اس کی مدد کرتی ہے اور رہنمائی کر کے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ نئے افق کے دو پرچے حجاب اور آنچل خواتین کے لیے مخصوص ہیں کیا یہ بھی فساد کی جڑ ہیں۔ پاکستان میں کتنے ہی معیاری پرچے صرف خواتین کے لیے شائع ہو رہے ہیں کیا وہ فساد کو بڑھا رہے ہیں، عورت تو گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر بطور ماں بیٹے کی تربیت کر رہی ہے، یہی بیٹا کل کو ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان، پروفیسرز، زرعی، آفیسر، سیاستدان بن جاتا ہے۔ گھر کی چار دیواری سے لے کر پوری دنیا کو چلانے میں جو مرد کردار ادا کر رہا ہے وہ ایک عورت سے پیدا ہوا ہے سمجھ نہیں آتی مجید جانی اور صائمہ مجید کو آخر عورت سے اتنی نفرت کیوں ہے مجید جانی کو پہلا کام تو یہ کرنا چاہیے کہ فوراً صائمہ مجید کو گھر سے نکال دے کسی ایسے محلے میں گھر لے جہاں صرف مرد رہتے ہوں اور اس کام کے سلسلے میں اسے کسی فیکٹری کی کالونی میں کوارٹر لینا چاہیے کیا عورت واقعی فساد کی جڑ ہے سوچیے گا ضرور۔ والسلام

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی تجھ سے ملاقات کی، ہمیشہ سلامت رہو، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں کافی عرصہ بعد آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں معاف کرنا کام کی مصروفیات اور زندگی کی گہما گہمی اور کچھ حالات ایسے تھے آپ سے رابطہ نہ ہو سکا آج بڑی مدت بعد بلکہ جب شہر جانا نصیب ہوا تو قریبی بک اسٹال کا چکر لگایا ماہ اگست 2017ء نئے افق سے ملاقات ہوگی سرورق بڑے کمال کا تھا دل بہت خوش اندر رنگ برنگی تحریروں سے واسطہ پڑا ایسا کامیاب پرچہ نکالنا اس مہنگائی کے دور میں آپ [illegible] سے قارئین کی پیاس بجھتی ہے ماہ اگست کے شمارے میں غزل شائع کرنے کا شکریہ وائی عرصہ بعد یاد کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں آپ ہم سے کافی دور ہیں تو کوئی بات نہیں مگر دل کے پہلو میں ما ئے رہتے ہو خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے نئے افق کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں مثلاً گفتگو، اقرا، نا قابل فراموش واقعات، کہانیاں وغیرہ قارئین کے خطوط پڑھ کر پرچے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے برسات کا سماں ہے موسم کا کوئی اعتبار نہیں چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں، بشرط آپ کا میرے تعاون ہو باتیں تو بہت کرنی تھیں مگر ذہن میں اب کوئی خاص بات نہیں خدا آپ کی عمر دراز کرے ہمت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے ہمیشہ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول مہکتے رہیں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں ہر وقت آپ کی دعاؤں کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ بڑے بھائی اقبال بھٹی سمیت نئے افق سے وابستہ سبھی لوگوں کو میرا خلوص بھرا اسلام قبول ہو، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے ایک دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہو رہا ہوں اگست کا نئے افق پڑھا انکل مشتاق احمد قریشی امریکا کی منفی پالیسیوں کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے اور طاہر بھائی اقرا میں اپنے درس سے ہمارا ایمان تازہ کر رہے تھے گفتگو میں ایک صاحب ماں کو گالیاں دے رہے تھے فرما رہے تھے جہاں میں تمام فسادوں کی جڑ عورت ہے میں حیران ہوں ماں کی شان میں اتنی خاموشی پر بھی اقبال بھٹی خاموش رہے اگر یہ ماں نہ ہوتی آج اس دنیا

کا وجود ہی نہ ہوتا کائنات کے پیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عورت کی شان بڑھانے کے لیے اپنی چادر مبارک زمین پر بچھائی فساد کی جڑ مرد ہے عورت نہیں، ایک ایک فٹ کے فاصلے پر مسجدیں بنا کر وہ فساد برپا کیا کہ میدان عرفات والی مرکزیت کمزور ہوگئی شیعہ، سنی، بریلوی، اہلسنت اور وہابی فرقے فساد کی وجہ سے بنے آج نام نہاد ادیب اور دانشور عورت کو تمام فساد کی جڑ کہہ رہے ہیں عورت کا دورانا م صبر ہے صبر کرنے والا فساد کی جڑ کیسے ہوسکتی ہے ایک کہانی کے کردار کی بنا پر عورت کو تمام فساد کی جڑ کہنا کہاں کی دانائی ہے ہم لاکھوں، کروڑوں ایسی کہانیاں پڑھتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آج کا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے اس معاشرے میں عورت کو جینے کا کوئی حق نہیں کہیں چولہا پھٹتا ہے تو عورت جلتی ہے جہیز کم لانے کی سزا عورت کو ملتی ہے یا طلاق یا پھر قتل کر دیا جاتا ہے جائیداد کو بچانا ہو تو قربانی عورت کی دی جاتی ہے عورت کی عزت سے کھیلنا مرد کا پسندیدہ کھیل ہے عورت ذات پر الزام تراشیاں کرنے والے ادیب کا جس شہر سے تعلق ہے اس شہر کو اولیا کرام کا شہر کہا جاتا ہے ان بزرگ ہستیوں کو بھی عورت نے جنم دیا تھا زمانہ جاہلیت کی منفی سوچ رکھنے والے ادیبوں کا وجود بھی ایک عورت کی وجہ سے ہے عورت کی نفی کرنے والے ادیبوں کے گھروں میں رہنے والی اپنی عورتوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ ماں کی شان میں گستاخی کرنے والو اسی ماں کے قدموں کے نشان جنت کی نشاندہی کریں گے ماں کی شان میں گستاخی کرنے والا یہاں بھی رسوا ہوگا اور وہاں بھی رسوائی ان کا مقدر ہوگی قرآن اور احادیث کا مطالعہ کر کے اپنی سوچ بدلیں حسین اشرف کی تحریر ''دل مشکل'' پڑھیں آپ کو پتا چلے کہ ماں اپنی اولاد کے لیے کتنا بے چین اور مضطرب رہتی ہے اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ انسان سے پیار کرنے والی ہستی ماں ہے دل مشکل کے لیے صرف اتنا لکھنا ہی کافی ہے حساب دو اور دو چار کا نام ہے لیکن ماں کی ممتا پر ہر حساب مات کھا جاتا ہے عشنا کوثر سردار کی سلسلے وار تحریر ''ایک سو سولہ چاند کی راتیں'' کی تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے محبت پر انسان کا کوئی اختیار نہیں یہ بے اختیار ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سرحدیں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں سنہرے لوگ سلیم اختر نے اپنی تحریر میں عورت کو گالی دینے والوں کی نفی کی عورت نے اپنے کردار سے انسانیت کو زندہ کیا ایسے کردار ہی دنیا میں مثالی ثابت ہوتے ہیں تفسیر عباس بابر کی تحریر ''سرفروش'' کا آخری حصہ کافی دلچسپ رہا دشمن ہماری مرکزیت کو کس طرح کمزور کر رہا ہے اسلام کو بدنام کرنے کی کیا کیا کوششیں ہوتی اور ڈالر کے بل بوتے پر غدار مل ہی جاتے ہیں وہ غدار ہمارے اپنے ہیں ساحر جمیل سید کی ''مرشد'' پڑھی پتا چلا کہ عشق کے کئی روپ ہیں عشق میں انسان اپنی ہر خواہش سے بے خبر ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے آدمی اپنے اختیار کی تمام حدیں عبور کر کے عشق کی وادی میں پہنچتا ہے وہاں اس کی بقا کسی اور کی نسبت سے وابستہ رہتی ہے فاطمہ عبدالخالق نے اپنی تحریر میں وطن سے عشق کرنے والوں کی تعریف کی دشمن سازشیں کرتا ہے مگر وطن سے محبت کرنے والے سپاہی ان کی ہر سازش ناکام بنا دیتے ہیں اسحاق جنجوعہ کی میلا پراتا پڑھ کر افسوس ہوا اگر شہید کے بچوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا تو پھر کون شہید ہونا پسند کرے گا ریاض بٹ حسب معمول دلچسپ تحریر کے ساتھ حاضر تھے، دستگیر شہزاد کی ایک تحریر ''اک گناہ کی قیمت'' اپریل کے نئے افق میں شائع ہوئی وہی تحریر سچی کہانیاں اپریل کے ہی شمارے میں قیمت کے نام سے شائع ہوئی ادیب کو ایسا زیب نہیں دیتا یہ صرف اور صرف شہرت کی خاطر کیا جاتا ہے ایک ادیب کو شہرت سے کیا غرض تبصرہ اپنی حد کراس کر رہا ہے اس کو کلوز کرتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتا ہوں جاتے جاتے ایک بار پھر کہتا ہوں ماں کو فساد کی جڑ کہنے والے عائشہ بٹ کی کہانی ''وفا کی دیوی'' ضرور پڑھیں آپ سب کی خوشیوں کا طلبگار۔

محمد رفاقت..... واہ کینٹ محترم اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم مزاج بخیر میری طرف سے آپ کو اور آپ کی تمام ٹیم کو سلام اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی دے ماہ اگست کا نیا افق پڑھا بہت پسند آیا مگر وہی بات کہ دو سالہ دیر سے ملا خیر جیسے ہی ملا فوراً پڑھنا شروع کر دیا نئے افق نے اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے اس دفعہ بھی کہانیوں کو پڑھنے والوں کے ذوق کے مطابق ترتیب دیا

ہے، جس میں ریاض بٹ صاحب کی سیانا کوا، سلیم اختر صاحب کی سنہرے لوگ، حسین اشرف صاحب کی دل مشکل، بہت شاندار کہانیاں تھیں، دوسری کہانیاں پتھارے والا، میلا پراتا، روٹی کا ٹکڑا، ہو جذبہ عشق گر بھی اپنی مثال آپ تھیں، فن پارے بھی اپنی جگہ اہمیت جگا رہے تھے ایفائے عہد زرین قمر کی اور مرشد ساحر جمیل سید صاحب کی مدتوں یاد رکھے جانے والی کہانیاں ہیں میری طرف سے بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ ملکی سیاست بدل رہی ہے اب تو پانامہ کا فیصلہ بھی آ گیا ہے اور نواز شریف بھی نا اہل ہو گئے ہیں دیکھو آگے کیا ہوتا ہے اللہ پاک نیا پاکستان کو دشمنوں سے محفوظ رکھے آمین۔ پاکستان ترقی کرے اور دنیا میں عزت پائے ہم سب کو پاکستان کی ترقی اور تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ بننا چاہیے تاکہ آنے والے وقت میں ترقی یافتہ ملکوں میں اس کا شمار ہو، تجربہ عہد کا دن چودہ اگست اس دن ہم وطن سے اپنی محبت کو یقینی بنا میں پاکستان زندہ باد، میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اقبال بھٹی صاحب کو بھی صحت کاملہ عطا کرے آمین، انشاء اللہ اگلے شمارے میں ملاقات ہوگی، اجازت اللہ حافظ۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار نئے افق جلد ہی مل گیا سرورق دیکھا یہ شعر ہونٹوں پر مچلنے لگا۔

تجھے کیا بتائیں کہ دل نشیں ترے عشق میں تری یاد میں
کبھی گفتگو رہی پھول سے کبھی چاند چھت پر بلا لیا

انکل جی دستک میں آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ امریکا ڈبل گیم کھیل رہا ہے مسلمان ملکوں کو اسلحہ بھی فروخت کر [illegible] اور ان [illegible] ابھی [illegible] اور نم ہیں کہ بے وقوف بنے ہوئے ہیں اور امریکا کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں [illegible] بھی تم [illegible] گا اسلامی دنیا کا نمبر ون دشمن امریکا ہے ہمیں سنبھل جانا چاہیے کیا [illegible] ہو گی جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا اور سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ گفتگو میں پہنچے تو ہمیں خوش خبری ملی کہ ہمارے بھیا اقبال بھٹی تندرست ہو گئے ہیں ہمیں بہت خوشی ہوئی کرسی صدارت پر مجید احمد جائی براجمان تھے آپ نے درست کہا ہے کہ اگر ہم عہد کرلیں کہ رشوت نہ دیں گے نہ لیں گے تو پاکستان کرپشن سے پاک ہو جائے گا میں نے اپنا نمبر آپ کے نمبر پر سینڈ کر دیا ہے امید ہے مل چکا ہوگا، صائمہ نور آپ کی اور ہماری سب کی دعاؤں سے بھیا اقبال بھٹی تندرست ہو چکے ہیں، ہم اچھا لکھنے والوں کو یاد رکھتے ہیں ایم حسن نظامی، ریاض حسین قمر میرے خط کو پسند فرمانے کا شکریہ، عمر فاروق ارشد میری تجویز پسند کرنے کا شکریہ آپ ہمارے ضلع کے ہیں اس لیے آپ بھی ہمیں بہت ہی پیارے ہیں آپ کا تبصرہ بھی جاندار ہوتا ہے۔ سید محمود حسن پہلی بار حاضری پر ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں امید ہے اب باقاعدگی سے حاضری دیتے رہیں گے اس بار بھی صرف نو خطوط ہی شامل تھے تمام ساتھی اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ کہانیوں میں سیانا کوا، سنہرے لوگ، روٹی کا ٹکڑا پسند آئیں۔ فن پارے میں وہ ایک لمحہ دستک پسند آئیں ذوق آگہی میں ریاض بٹ عبدالجبار رومی جاوید احمد صدیقی، خوش بوئے سخن میں ایم حسن نظامی، ریاض حسین قمر، بشیر انیلم چھائے رہے نئے افق بہت کم قیمت میں بہت اچھا مواد فراہم کرتا ہے ہمیں نئے افق کی دوستی پر ناز ہے نئے افق اور اس کی ٹیم کے لیے کہوں گا۔

کبھی جو بچھڑنا چاہو تو یہ سوچ لینا
میری سانسوں کو تجھ بن چلنا نہیں آتا

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سلام شوق ماہ اگست 2017ء کا نئے افق بروقت ہی مل گیا جریدہ سالانہ لگوا لینے سے بک اسٹالوں کے جغادریوں سے جان چھوٹی جب بھی جاؤ بس یہی جواب ملتا کہ ابھی نئے افق نہیں آیا اور پھر ذہن پر مایوسیوں کے بادل چھا جاتے ہیں نہ صحیح طور پر مطالعہ ہو پاتا اور نہ ہی بروقت خط لکھا جا سکتا اب بے فکر ہوتے ہیں کہ رسالہ ہر ماہ کی اکیس بائیس کو ہمارے ہاتھوں میں ہوتا ہے اگست کے شمارہ کا ٹائٹل بہت خوب صورت ہے نہ جانے یہ نامراد گلہری دوشیزہ کے خوب صورت بال دیکھ کر کیوں جیلس ہو گئی ہے اور انہیں

کترنے میں لگی ہوئی ہے شمارے پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں صفحہ نمبر 147 پر شائع ہونے والے نواب شاہ کے محترم سید وقار الدین صاحب کے انتخاب کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا جس میں انہوں نے بدعت کی ہلاکتیں کو موضوع بنایا ہے ان کی پوری باتیں قابل غور ہیں مگر کاش وہ بدعت کی وضاحت فرما دیتے تا کہ ہر مسلمان اس کی روشنی میں اپنے آپ کو بدعت کی لعنت سے محفوظ کر لیتا انہوں نے تو ہم سادہ مسلمانوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نکال دی ہے ان کا انتخاب پڑھ کر تو یوں لگا کہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والی رب کائنات کی ذات مقدس ہم سب کو دوزخ میں ڈال دے گی میری آپ سے اور قارئین کرام سے پرزور اپیل ہے کہ لفظ بدعت کی وضاحت فرمائیں میں سب کا شکر گزار رہوں گا۔ میں محترمہ صائمہ نور کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میری اہلیہ محترمہ مرحومہ مغفورہ کو بھابی جان لکھ کر میرا مان بہت بڑھایا ہے یعنی انہوں نے میری اہلیہ کو بھابی جان لکھ کر مجھے ایک بھائی کا درجہ دیا ہے مگر محترم کاتب صاحب کچھ یوں لکھ کر کہ انہوں نے میری زوجہ محترمہ کو بھائی جان لکھ کر میری مان بڑھایا ہے سارے مفہوم کو بدل کے رکھ دیا پھر خوش بوئے سخن میں چھپنے والی میری غزل کے کچھ مصرعے انہوں نے کمال مہارت سے بدل دیے ایک مصرعہ انہوں نے کتابت کر دیا جب طبیعت ہو گناہ گار پر مائل تیری حالانکہ مصرعہ اس طرح سے ہے ہو طبیعت جب گناہوں پر کبھی مائل تیری کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے ایک چٹ کاتب کے حوالے کی جس میں لکھا تھا ضمیر الدین کتب فروش اس کی کتابت کر دو میں تھوڑی دیر بعد لے جاؤں گا واپسی پر کاتب سے کتابت شدہ چٹ اس شخص کے حوالے کی جس پر لکھا تھا ''کتب الدین ضمیر فروش'' ادارے کے لیے ان ضخیم جریدے کی پروف ریڈنگ ناممکن ہے اس لیے میری کاتب بھائی سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ وہ تسلی سے کتابت کیا کریں یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اب روبصحت ہیں اور وہ جلد اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے رب قدوس انہیں اور بھی صحت یابی عطا فرمائے، آمین۔ دستک میں جو آپ نے حقائق بیان فرمائے ہیں ان سے کسی کو انکار ممکن ہے غیر مسلم خواہ کوئی بھی ہے وہ مسلمان کا دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتا وہ دوستی کی آڑ میں بھی ہم سے بدترین دشمنی کر رہا ہوگا کاش ہم مسلمان اس بات کو سمجھ جائیں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے بچیں اور اپنے اندر اتفاق اور اتحاد پیدا کریں۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بڑی پیاری حدیث بیان فرمائی ہے اللہ رب العزت ہمیں آقا اور ان کے صحابہ کی سنت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، اس بار کرسی صدارت پر پیارے بھائی مجید احمد جائی صاحب متمکن ہوئے لکھ لکھ مبارکاں میرے ویر آپ کا تبصرہ حسب سابق شاندار تھا اور جاندار تھا۔ رب کریم آپ کی سوچوں میں مزید وسعت عطا فرمائے آمین۔ آپ نے مجھے اور صائمہ نور کو بڑا اعزاز بخشا ہے اس لیے شکریہ قبول فرمائیں، محترمہ صائمہ نور کا دعاؤں بھرا خط لاجواب تھا محترمہ ہم سب آپ کے اچھے لکھے کی تعریف کرتے ہیں اور آپ واقعی اچھا لکھتی ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ محترمہ زرین قمر صاحبہ کی تحریریں نئے افق کی جان ہوتی ہیں گفتگو میں غالباً وہ پہلی بار تشریف لائی ہیں میں ان سے استدعا ہے کہ وہ گفتگو میں ہر ماہ تشریف لا کر اس کی رونق کو دوبالا کرتی رہیں۔ پرنس افضل شاہین کی ساس صاحبہ کی رحلت کا پڑھ کر دلی صدمہ ہوا خدائے عظیم مرحومہ کی مغفرت فرمائے انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ خط کو پسندیدگی کی سند عطا کرنے کا شکریہ، محمد رفاقت اور ایم حسن نظامی کے تبصرے جاندار تھے پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب کے خط میں تبصرے کے علاوہ اور بھی بہت سی کام کی باتیں ہوتی ہیں جن میں خلوص کوٹ کوٹ کے بھرا ہوتا ہے وہ ایک باذوق قاری ہیں جن کی نظر جریدے کے ہر انداز پر ہوتی ہے عمر فاروق ارشد بھائی یادوں میں رکھنے پر آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں شکریہ، سید محمود حسن صاحب پہلی بار گفتگو میں تشریف لائے ست بسم اللہ جی آیانوں اب آتے رہیے گا محترم جاوید احمد صدیقی صاحب ایک بار جلوہ گر ہو کر غائب ہو گئے ریاض بٹ صاحب خود تو محفل میں تشریف نہیں لائے مگر ان کی کہانی ''سیانا کوا'' نے کافی حد تک ان کی کمی پوری کر دی ریاض بٹ کی کہانی حسب سابق خوب ہے باقی غیر حاضر بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ وہ غیر حاضری کی عادت چھوڑ دیں ان سب کا شکریہ

محترم طاہر احمد قریشی صاحب ہمارے ایمانوں کو مضبوط کرنے کے لیے بڑی جانفشانی سے کام کر رہے اللہ ان کو سلامت رکھے آمین کہانیوں شاعری اور ذوق آگہی کا انتخاب خوب ہے۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ امید کرتا ہوں کہ مزاج بخیر ہوں گے اگست کا نئے افق وقت پر مل گیا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح منفرد تھا فہرست سے ہوتے ہوئے دستک کا مطالعہ کیا قریشی صاحب امریکا بہادر کی سازشوں کو طشت از بام کر رہے تھے یہ تو گوروں کا پرانا اصول ہے کہ تقسیم کرو اور حکومت کے مزے لو اس کا ئیاں اصول کے تحت وہ ہزار ہا سالوں سے ہم پر حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں، گفتگو میں داخل ہوئے تو کئی خوشخبریاں منتظر تھیں اقبال بھٹی صاحب کی صحت یابی کا سن کر دلی خوشی ہوئی ابن صفی کے متعلق اگر تحریر نئے افق کی زینت بن جائے تو کمال ہو جائے، زرین قمر کبھی کبھار گفتگو میں حاضر ہوتی ہیں، دستگیر شہزاد کے انٹرویو کو آپ نے جس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے وہ آپ کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل ہے ان کے انٹرویو سے میں خود بھی بہت متاثر ہوا ہوں، حسن نظامی اور افضل شاہین نے عمدہ تبصرے کیے کہانیوں میں سب سے پہلے سلسلے وار ناول پڑھے تفسیر عباس بابر کا شاہکار ناول مکمل ہوا اختتام خاصا چونکا دینے والا تھا، امید ہے کہ وہ آئندہ بھی حب الوطنی پر مشتمل اس طرح کی تحریروں کے ساتھ حاضر ہوتے رہیں گے ساحر جمیل کے ناول مرشد نے اب اٹھان پکڑ لی ہے اور لگ رہا ہے کہ جلد ہی ایک ہنگامہ خیز ناول نکلے گا یہ اپنی طرز کا ایک منفرد ناول ہے اور موضوع کے حساب سے علیحدہ شناخت کا حامل ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ایک سو سولہ چاند کی [illegible] اس ناول کے ساتھ دیوانگی کا ایسا تعلق ہے رات کو صحن میں بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور لطف کی گہرائیوں [illegible] رومانیت اور ایکشن نما تھرل سے بھرپور رومانیت بھی ایسی کہ جنسیت جیسی گھٹیا شے سے کوسوں دور ہے یہ عشنا کوثر کے قلم کا خاصہ ہے اللہ مزید ترقی سے نوازے، ابتدائی صفحات پر حسین اشرف اگرچہ ایک نیا نام ہے لیکن طرز تحریر عمدہ ہے عارف شیخ ایک تیز رفتار تحریر کے ساتھ حاضر تھے آخر دم تک دلچسپی قائم رہی اتنا خوب صورت اختتام تھا کہ دل خوش ہو گیا ریاض بٹ کی تفتیشی کہانی اس دفعہ کافی چونکا دینے والی تھی کہانی کا اتار چڑھاؤ بھی خاصا بدلا ہوا تھا جو کہ اچھا لگا، دیگر ساتھیوں کی تحریریں اچھی تھیں مصروفیت کے باعث کچھ تحاریر رہ گئی ہیں جو کہ پڑھ نہیں سکا ش م دانش کی غزل مجھے بہت اچھی لگی، خوشبوئے سخن میں اس دفعہ خاصی مناسب تعداد میں ساتھیوں کا کلام شامل تھا دل خوش ہوا اور مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کیا سینئر شاعر حضرات میں ریاض قمر اور نیر رضوی صاحب شامل تھے دونوں کا کلام بڑے شوق سے پڑھتا ہوں نیر رضوی صاحب نے میرا خیال ہے عبدالستار ایدھی کے متعلق غزل لکھی تھی بہتر ہوتا اگر عنوان میں وضاحت کر دیتے تا کہ اچھے طریقے سے خراج تحسین پیش ہو سکتا بہر حال غزل عمدہ تھی دیگر دوستوں نے بھی بہت اچھا لکھا وقت کی قلت کے باعث بہت ساری چیزیں ادھوری رہ گئی ہیں انشاء اللہ اگلے تبصرے میں حساب بے باک کر دیا جائے گا تمام دوستوں کو سلام انتظامیہ کے لیے دعائیں۔

محمد فرقان رومان...... چکوال۔ السلام علیکم میں نئے افق میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اب آتے ہیں تبصرے کی جانب تو دل مشکل کی بے جا طوالت بوریت پیدا کر گئی سیانا کوا، سنہرے لوگ، ایفائے عہد، پتھارے والا، روٹی کا ٹکڑا، میلا پرانا، وفا کی دیوی اور ہو جذبہ عشق گر ایک دوسرے پر سبقت لے گئے فن پارے تو ہوتے ہی اچھے ہیں سرفروش کا خوش کن اختتام ہوا جو کہ بہت اچھا تھا پلیز تفسیر عباس بابر سے کوئی اور سلسلہ وار فکشن ناول لکھوائیں وہ بہت اچھا لکھتے ہیں ایک سو سولہ چاند کی راتیں بھی اچھا جا رہا ہے مرشد ابھی پڑھا نہیں میں آپ کو سلسلہ وار فکشن ناول بھیجنا چاہتا ہوں بھیج دوں؟ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن بھی اختصار کے ساتھ چھائے رہے جلد رائے سے آگاہ کیجیے۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

العزیز

(قوت و غلبے والا)

عزیز کے معنی غالب زبردست' قوی' گرامی قدر' مشاق' دشوار' مبالغہ کا صیغہ ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں عزیز وہ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو۔ عزیز حق تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں شامل ہے' زجاج نے اس کے معنی کیے ہیں ''ایسا زبردست جس پر کوئی چیز غالب نہ ہو سکے'' اور دیگر لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ''ایسا قوی جو ہر شے پر غالب ہو'' اور بعض کے نزدیک ''عزیز'' وہ ہے جس کی مثل کوئی نہ ہو۔''

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں فرماتے ہیں ''حلیمیؒ نے کہا کہ عزیز کے معنی ہیں ''اس ذات تک رسائی نہ ہو سکے اور کسی نامناسب بات کا عمل دخل اس پر ممکن نہ ہو'' کیونکہ عزیز عربی میں عزہ سے مشتق ہے جس کے معنی صلابت یعنی سخت ہونے کے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو عزیز کہنے کا مطلب ہے اس کے قدیم ہونے کا اعتراف کرنا اس طرح کہ جس قدرت اور جس قوت کے ساتھ وہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اس میں ذرا تبدیلی کی گنجائش نہیں جس کا نتیجہ ہے اللہ کو پاک سمجھنا' ان تمام باتوں سے جو مخلوق میں ہو سکتی ہیں۔

حضرت ابوسلیمان' امام خطابیؒ صاحب معالم السنن شرح سنن ابی داؤد کہتے ہیں کہ ''عزیز ایسا غالب ہے جو مغلوب نہ ہو۔'' عز کے معنی کبھی تو غلبہ کے آتے ہیں اور کبھی اس کے معنی شدت کے آتے ہیں اور قوت کے آتے ہیں' کبھی گرامی قدر ہونے کے لئے آتا ہے۔ وہ ذات جس کا کوئی عدیل و مثیل نہ ہو'' (لغات القرآن مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ)

العزیز سے مراد ایسی زبردست ہستی جس کے مقابلے میں کوئی سر نہ اٹھا سکے' جس کے فیصلوں کی کوئی مزاحمت نہ کر سکے' جس کے سامنے سب بے بس ہوں اور بے زور ہوں۔ وہ پیارا بھی ہے اور سب پر غالب بھی ہے' اللہ کے غلبہ میں پیار ہے تباہی نہیں' یہ ایسی صفتِ الٰہی ہے جس سے اللہ کی گرفت اور غلبے کا اظہار ہوتا ہے۔

ترجمہ:۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آ چکی ہیں' اگر اُن کو پا لینے کے بعد پھر تم بہک جاؤ' تو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ (البقرۃ۔۲۰۹)

تفسیر:۔ وہ عزیز ہے' غالب ہے' اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی قوت و غلبے کی مالک ہے' اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایات جو تمام انسانیت کو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مل چکی ہیں' انسان اُن کی خلاف ورزی کرے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ زبردست قوت و طاقت رکھتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ اپنے مجرموں کو سزا کس طرح دینی ہے۔ وہ حکیم ہے' صاحبِ حکمت ہے۔ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے جو نظام زندگی تجویز کیا ہے وہی بہترین ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے وہ دراصل انسان کے لئے بُرا ہے۔ اور اگر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہیں کرے گا اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے نہیں بچے گا تو سخت خسارے میں رہے گا۔

ترجمہ:۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب (بے پناہ طاقت والا ہے) اور بدلہ لینے والا ہے۔ (آل عمران۔۴)

آیتِ مبارکہ میں اللہ جل جلالہٗ نے اپنے بندوں کو بڑی سخت تنبیہ کی ہے جو لوگ بغیر حجت کے' بغیر دلیل کے اللہ تعالیٰ کی آیات سے انکار کرتے ہیں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے' وہ عزیز ہے اور اس کی پکڑ بڑی

ہی شدید ہے وہ کبھی اگر انتقام لیتا ہے تو بڑا ہی خوفناک و عبرتناک ہوتا ہے۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں در حقیقت وہ دینِ حق کا انکار کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو عذابِ الٰہی اور انتقامِ الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے تاکہ انسان سوچ سمجھ کر راہِ راست اختیار کرے اور اللہ کے خوف سے لرزاں رہے۔

ترجمہ: زمین و آسمان کے (تمام) لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔ (الفتح۔ ۷)

آیت میں نہ صرف اہلِ ایمان کو آگاہ کیا جارہا ہے بلکہ تمام انسانیت کو خصوصاً اللہ کے منحرفین کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ دشمنانِ اسلام کی کوئی بات ذاتِ الٰہی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ زمین اور آسمانوں کے تمام لشکر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑی زبردست حکمت کا مالک ہے وہ ہر قسم کی قوتوں والا ہے اور حکمت والا ہے۔

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی تسبیح (پاکی بیان) کررہے ہیں، وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ (الحدید۔ ا۔ الحشر۔ ا)

کائنات کی ہر چیز اس حقیقت کا اظہار و اعلان کررہی ہے کہ اس کا خالق و پروردگار ہر عیب، نقص و کمزوری، خطا اور برائی سے پاک ہے، اس کی ذات پاک ہے، صفات پاک ہے، افعال پاک ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیشہ اپنے خالق و رب کی پاکی بیان کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہستی ہی وہ عظیم ترین ہستی ہے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ اللہ کے نافذ کردہ فیصلے کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اس کی مزاحمت کوئی نہیں کرسکتا، سب کو اس کی اطاعت کرنا اس کا ... خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، کوئی بھی نافرمانی کرنے والا اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ بڑی حکمت و دانائی کے ساتھ کرتا ہے، اس کی تخلیق اس کی تدبیر اس کی فرمانروائی، اس کے احکام و ہدایات سب بڑی حکمت و دانائی پر مبنی ہوتے ہیں۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے اور زبردست حکمت والا ہے۔ (التغابن۔ ۱۸)

تفسیر: اللہ تبارک و تعالیٰ جو قادرِ مطلق ہے وہ اپنی تمام مخلوقات کے نہ صرف ہر عمل سے بلکہ ان کی سوچ و فکر سے بھی پوری طرح باخبر رہتا ہے وہ ایسا زبردست ہے کہ اپنے نافرمانوں کو جب چاہے پکڑ لے، مگر یہ اس کی شانِ عفو و درگزر ہے جس کی وجہ سے وہ ظالموں کو مہلت پہ مہلت دیتا رہتا ہے۔ اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خصوصی ہے کسی تنگ دل آقا کا سا نہیں ہے جو بات بات پر گرفت کرتا ہو اور ذرا ذرا سی خطا پر ساری خدمات اور وفاداری پر پانی پھیر دیتا ہو۔ اللہ تعالیٰ جو بڑا ہی فیاض اور کریم آقا ہے جو بندہ اس کا وفادار ہو اس کی خطاؤں پر چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ بھی خدمت بندے سے بن آئی اس کی قدر فرماتا ہے۔ یعنی نہ صرف ان کے قصور معاف فرمادیتا ہے بلکہ ان کے تھوڑے عمل کی بھی وہ بہت زیادہ قدر کرتا ہے اور اس کی پوری پوری جزا عطا فرماتا ہے۔

یعنی جان بوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس، نیکی کی کوشش کرنے والے اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ بڑے ہی کرم و فضل کا معاملہ فرماتا ہے۔ بندہ جتنی کوشش اپنی طرف سے نیک بننے کی کرتا ہے اللہ اس کو اس سے زیادہ نیک بنادیتا ہے اس کے کاموں میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ اس سے سرزد ہوجاتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ان سے چشم پوشی فرماتا ہے اور جو تھوڑے سے عمل کی پونجی وہ لے کر آتا ہے، اللہ اس کی قدر افزائی کرتے ہوئے انہیں زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمادیتا ہے۔

فضائل: جو شخص چالیس دن تک ہر روز اسم صفتِ الٰہی یا عزیز کا ورد کرے گا، اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ اسے معزز و مستغنی بنادے گا اور جو کوئی ہر فجر کی نماز کے بعد اکتالیس مرتبہ اس صفتِ الٰہی کا ورد کرے گا وہ اللہ کے سوا کسی کا کبھی محتاج نہ ہوگا اور ذلت کے بعد عزت نصیب ہوگی۔

عشنا کوثر سردار

دستگیر شہزاد

عشنا کوثر سردار اردو کی معروف ادیب ہیں انہیں ان کی شخصیت کو آج کے دور کا اردو ادب کا سنگھار کہیں تو بے جا نہ ہوگا، آپ ماہ نامہ آنچل میں ان کے ناول پڑھتے رہے ہیں آج کل نئے افق کے صفحات پر بھی تحریک آزادی پاکستان کے پس منظر میں ان کا ایک خوبصورت ناول ''ایک سو سولہ چاند کی راتیں'' قسط وار چل رہا ہے جسے قارئین کی اکثریت پسند کر رہی ہے انہیں منظر نگاری میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ پڑھنے والا ان کی تحریر کے طلسم میں کھو کر رہ جاتا ہے اور خود کو کہانی کا کردار سمجھنے لگتا ہے اس ماہ ہمارے محترم ادیب و افسانہ نگار شاعر دستگیر شہزاد نے بڑے ہی خوب صورت پیرائے میں ان کی تحریر اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے دستگیر شہزاد بذات خود ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں آپ ان کا انداز تحریر سراہے بغیر نہیں رہیں گے۔

عشنا کوثر سردار کے فنکشن پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس میں اسٹیج ڈرامے کی اس کیفیت کا احساس ہوتا ہے جس میں مناظر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہ صورت حال اس لینڈ اسکیپ کی طرح ہوتی ہے جس میں مقامات اور افراد کی جھلک دکھاتے ہوئے دھندلے مناظر غائب ہو ہو کر پھر سے نظر آتے رہتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج پر کوئی ڈرامہ ہو رہا ہے اور ہم اسے الگ الگ ٹکڑوں کی صورت میں دیکھ رہے ہیں اس کیفیت میں ہماری دلچسپی کو قائم رکھنے کی قوت تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ ربط و تنظیم ہرگز نہیں ہوتی جو اس کے اصل معنی و مفہوم کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے ایک طرح سے دیکھیے تو یہ عدم وضاحت بذات خود زندگی کے تو افق کے مستحکم شعور و احساس کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ وسیع تر معنوں میں سچ پوچھیے تو ہم وجود کی پراسراریت کو گہرائی سے سمجھ ہی نہیں سکتے خواہ اس کا تعلق خود ہمارے اپنے وجود سے ہو یا دوسرے کے وجود سے اس عمل میں ہمارا سامنا الجھن اور پریشانی ہی سے ہوتا ہے ہم جتنے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اتنا ہی کم انہیں سمجھ جاتے ہیں اس پر تصادم دنیا کے بیچ ہم خود کو بھٹکا ہوا اور بے ٹھکانہ محسوس کرتے ہیں اس طرح یا تو ہم اتنی پریشانیوں میں پھنسنے کی خاطر کہیں دور نکل جاتے ہیں یا اپنے پرانے اور جانے پہچانے دکھوں

کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔

عشنا کوثر سردار کے یہ ناول ''اے شمع کوئے جاناں، افسون جاں، ایک خواب طرب، اور کچھ خواب، اعادہ جاں گزارشات، ایک سوسولہ چاند کی راتیں، عطارد جزیرے کے خواب، محبت ربط ہے، جس تن لگیاں، عشق کمال، اس کے زاد راہ میں، حیرت کدہ، خاموشی، مجھے محبت کا قرینہ دو، زمین زادے، سورج پر دستک، آب گمشدہ، حقیقت پسندی اور طنز کے عجیب وغریب جھمیلوں سے بھرے ہوئے ہیں اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ ان میں ہمیں مصنفہ کی حاکمانہ موجودگی کا احساس ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ پانچ انگریزی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

The Skin Of My Teeth.

Dog's Breakfast

Apple's dark Curves

Monocular Depth Cues

The Unspoken Light

عشنا کوثر سردار فطین بھی ہیں اور شریر بھی اس لیے لڑکی بھی اور انسان بھی یہ امر اس کی فطانیت کی دلیل ہو یا نہ ہو اس کی شرارت کی دلیل ضرور ہے کہ اس نے آج اتنا بڑا مجمع اکٹھا کر لیا اتنی خلقت یا تو میں نے میڈم نور جہاں کے فنکشن پر دیکھی تھی یا اس کے اردگرد۔

عشنا کوثر سردار کو اپنی تخلیقی قوتوں پر مکمل اعتماد ہے جو ان کے ہر ناول میں نظر آتا ہے عشنا کوثر سردار نے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے ہاتھ میں مرہم کا پھایا دے کر قدرت نے آپ کو اس وصف سے مالا مال کر دیا ہے جس کے لیے بیشتر اہل قلم حسرت ہی کیا کرتے ہیں۔

عشنا کوثر سردار کی کردار نگاری فطرت کے عین مطابق ہے وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کرداروں کے داخلی جذبات کو پیش کرتے ہیں اور فنکارانہ ہنرمندی سے اپنے ہر کردار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہیں عشنا کوثر سردار فرض شناس ادیبہ ہیں انہوں نے معاشرے کی صحیح تصویریں پیش کرنے کے لیے جس زبان کا استعمال کیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انہیں ہر طبقے اور ہر معاشرے پر عبور حاصل ہے اور کم الفاظ میں کرداروں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا عشنا کوثر سردار کی فنکارانہ ہنرمندی کا ثبوت ہے۔ بہترین ناول نگار کے علاوہ فلم میکر اور صحافی بھی ہیں فلم میکنگ کوریز سبجیکٹ لندن سے پڑھا ہے اور دو شارٹ موویز بنائی ہیں یہ عشنا کی شرافت ہے کہ وہ مجھے تعظیم کے ساتھ بلاتی ہیں ورنہ جو اتنی منہ زور ادیبہ ہو وہ سرور نہیں کہا کرتی ان کا لہجہ تحکمانہ ہوتا ہے جیسے اپنی بہن نسیم سکینہ کا اگر صدف مجھ

سے بات کرتی تو کہتی دستگیر صاحب یہ بتایئے میرے پلاٹ میں گھپلا کیا ہے۔

عشنا کوثر سردار صحافی ہیں یا ادیبہ میں اس کا فیصلہ نہ کر سکا ویسے آج اس کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے اگر آج اس کے اردگرد صحافی زیادہ ہیں تو یہ صحافی اور اگر ادیب زیادہ ہیں تو یہ ادیبہ؟ یہ فیصلہ کچھ ویسا ہی فیصلہ ہے کہ ایک بار میں نے ایڈیٹر فنون اور مونتاج بہن منصورہ احمد سے پوچھا تھا بلبل مذکر ہے یا مونث ان کا جواب تھا اگر سوال کرنے والا مرد ہو تو مذکر، عورت ہو تو مونث۔ بہر حال ادیب عوام کے دلوں میں بستا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں بولتا ہے مگر صحافی خواص کے دلوں میں بستا ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بولتا ہے میں تو اسے اپنا اپنا منصب اور اپنی اپنی قسمت کہوں گا آپ چاہیں تو اپنی اپنی قسمت اور اپنا اپنا منصب کہہ لیں۔

فن دراصل تصور فن کے تابع ہوتا ہے عشنا کوثر سردار اپنی ذات میں بے شناخت ہے یا اس کی شناخت کے نقوش کائنات کے سبھی مظاہر میں مضمر ہیں عشنا کوثر سردار جو کچھ بھی دیکھتی ہے وہی بن جاتی ہے۔

اپنی تمام تر سادگی کے باوجود یہ تمام ناول تنقیدی اوزاروں سے لیس ہو کر مطالعہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ گرفت میں نہیں آتے اکثر ناولوں میں عشنا کوثر سردار نے Space Time Continum کا منظر دکھایا ہے جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ کائنات زمانوں، لمحوں اور ہیولوں میں منقسم نہیں ہے اس کا ہر کردار بیک وقت تینوں زمانوں کا باسی ہے اور جملہ سطحوں پر ہمہ وقت موجود ہے، وقت کے ایک خاص لمحے میں رک کر پتھر بن جانے والے کرداروں میں ایک قدم بھر کر دوسرے زمانے میں پہنچ جانے والے کرداروں کے اس عمل کی تحسین ان ناولوں کا طرہ امتیاز ہے اور یہی شعبدہ گری اور خصوصیت عشنا کوثر سردار کے اسلوب کی شناخت ہے قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر اور پھر ان پیرایوں کو یکے بعد دیگرے برت کر عشنا کوثر سردار نے اپنی تحریروں میں ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی جن میں قابل مطالعہ ہونے کا وصف نمایاں ہے۔

ناول کی ماہیت کیا ہے اس صنف کی ادبی قدر و قیمت اور زندگی سے گہری براہ راست قربت کو پر اسرار کے بجائے اسرار انگیز بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے، ڈی ایچ لارنس کی تعریف سے بڑھ کر توصیف فوراً ذہن میں آنے لگتی ہے جہاں وہ ناول کے لیے ایسے ربط السان ہے گویا کسی Pagan دیوتا کے لیے حمدیہ نظم HYMN پڑھ رہا ہے۔

میں ایک زندہ بشر ہوں اور جب تک میرے بس میں ہے میں ایک زندہ بشر ہی رہنے کا ارادہ رکھتا

ہوں اسی وجہ سے میں ایک ناول نگار ہوں اور ایک ناول نگار کے بطور میں خود کو کسی بھی اولیا سے کسی بھی سائنس دان سے کسی بھی فلسفی اور کسی بھی شاعر سے بالاتر سمجھتا ہوں یہ سب زندہ انسان کے مختلف اجزا کے عظیم ماہر ہیں مگر ان اجزا کی سالم صورت کا ادراک نہیں رکھتے ناول ہی ایک روشن کتاب زندگی ہے کتابیں زندگی نہیں ہوتیں محض خلائے اثر میں تھرتھراہٹیں ہوتی ہیں مگر ناول بطور ایک تھرتھراہٹ کے سالم زندہ بشر کو لرزش میں رہ سکتا ہے جو کہ شاعری، فلسفہ، سائنس یا کسی اور کتابی تھرتھراہٹ سے بڑھ کر ہے ناول ہی کتاب زندگی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تیرہ قسم کے ٹیلنٹ پیدا کیے ہیں یہ تیرہ ٹیلنٹ تیرہ کیٹگریز ہیں یہ کیٹگریز لیڈرز، بزنس مین، کھلاڑی، وکیل، آرٹسٹ، فائٹر، جاسوسی، منتظم، مبلغ، موجد، استاد، سیاستدان اور مزدور کہیں ہم لوگ زندگی بھر اپنی جس عادت کو اپنا مشغلہ اپنی ہابی اپنا شوق سمجھتے رہتے ہیں وہ دراصل ہمارا ٹیلنٹ ہمارا پروفیشن ہوتا ہے میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی بتاتا چلوں کہ جو کام جو تخلیقی کام عشنا کوثر سردار نے کیا وہ تخلیقی کام دنیا کے باقی چھ ارب لوگ بھی کر سکتے ہیں کیونکہ اگر یہ کام ناممکن ہوتا تو عشنا کوثر سردار بھی نہ کر پائی بے شمار تخلیقات کی مصنفہ نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تو ثابت ہو گیا یہ کام انسانی سطح پر ناممکن نہیں بعض کام بعض لوگوں کے لیے آسان اور دوسرے لوگوں کے لیے مشکل ہوتے ہیں لیکن ناممکن کسی کے لیے نہیں ہوتے اور دوم کامیابی ایک ذائقہ ایک ٹیسٹ ہوتا ہے انسان اگر ایک بار یہ ذائقہ چکھ لے تو پھر یہ اپنی زندگی میں ناکامیوں کا زہر نہیں گھلنے دیتا۔

عشنا کوثر سردار کی یہ تخلیقات فکشن کے روایتی اسلوب اور معاصرانہ روش دونوں سے انحراف کرتے ہوئے اپنے رہنما اصول خود ضائع کرتے ہیں دوسرے الفاظ میں عشنا کوثر سردار نے اپنے ناولوں میں تقلیدیت کی بجائے ایک جدید مگر بالکل ہی غیر مانوس اور متفائر انداز اختیار کیا ہے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فکشن کے اس منفرد انداز و اسلوب کی وہ مخترع بھی ہے اور خاتم بھی قصہ مختصر میں عشنا کوثر سردار کا مداح ہوں مجھے اس کے قلم سے محبت ہے اس لیے اس کے کان میں صرف دو جملے کہوں گا پہلا جملہ تیری تحریر میں بانکپن ہے اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا۔

دوسرا جملہ: تیری شخصیت میں موہنی ہے اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا، غالباً یہی دو جملے احمد ندیم قاسمی نے قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی کے کان میں کہے تھے۔

ایکس ون

زرین قمر

حصہ اول

کہانی خاصی دلچسپ ہے یہ ناول Mark Arundel نے لکھا ہے اور اس کا نام Codename Maneyman ہے اس میں ایک ریٹائرڈ فوجی کو ایک شخص کی جان بچانے کی ذمہ داری دی جاتی ہے جبکہ کئی دشمن اسے مارنے پر تلے ہوتے ہیں ہر ہر Chapter میں ایک نیا انکشاف ہوتا ہے دلچسپی اور سنسنی خیز واقعات سے پر ناول ہے۔

PakistaniPoint
Waqar Azeem

رات کا گہرا سیاہ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے بدی کی قوتوں نے اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے ہوں' کہیں کہیں سے چھن کر کچھ روشنی کی کرنیں کبھی کبھی میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ مجھے احساس ہوا جیسے بارش ہو رہی ہے کیونکہ بارش کے قطرے چھن چھن کر میری برساتی سے نیچے گر رہے تھے۔ وہ برساتی میں نے جھاڑیوں کے اوپر ڈالی ہوئی تھی تا کہ خود کو پوشیدہ رکھ سکوں' بارش کے قطرے میرے فولادی جنگی ہیلمٹ پر گر رہے تھے میری وردی خاصی بھیگ گئی تھی اور میرے جوتے جنگل کی چکنی مٹی میں پھسل رہے تھے۔ میں نے اپنے سینے کی طرف دیکھا جہاں میری LMG (ہلکی مشین گن) موجود تھی اور میری کمر کے گرد لگی بیلٹ میں میرا تیز دھار خنجر موجود تھا' میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر میرے خنجر پر جا کر رک گیا مجھے خطرے کا احساس ہو رہا تھا میں نے اپنی توجہ کچھ سننے پر لگا دی اور میری آنکھیں اندھیرے میں کسی ہیولے کو تلاش کرنے لگیں لیکن مجھے بارش کی آواز کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اٹھا اور اندھیرے میں ایک قدم آگے بڑھایا پھر دوسرا...... اور اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سیاہ تاریک جنگل مجھے نگلنے کے لیے تیار ہو دور دور تک صرف درخت اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میرے علاوہ وہاں کوئی اور فوجی' عمارت یا لائٹ نہیں تھی سوائے اس روشنی کے جو کبھی کبھی درختوں سے چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ میں چند قدم اٹھانے کے بعد رک گیا تھا شاید میں نے کسی کے حرکت کرنے کی آواز سنی تھی۔ میں پھر کسی آہٹ کو بغور سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن ہر طرف خاموشی تھی پھر اچانک ہی کوئی اوپر سے مجھ پر گرا تھا اور اس کے ساتھ زمین پر آ رہا تھا' وہ میرے اوپر تھا اور اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا' پھر اس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا تھا اور مجھے اس کے ہاتھ میں تیز دھار خنجر کی چمک نظر آئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنے گھٹنے اس کے پیٹ میں دے مارے تھے وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا اور زمین پر گر گیا تھا اور اب میں اس کے اوپر تھا۔ میں نے اپنا خنجر نکال لیا تھا اور وہ میرے حملے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی میں نے بڑی پھرتی سے اپنا خنجر اس کے گلے میں اتار دیا تھا' اس کی ایک ہلکی سی چیخ نکلی تھی جسے میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر روک دیا تھا پھر وہ پیچھے کی طرف لڑھکتا چلا گیا تھا اور اس ڈراؤنے خواب سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں میرے خواب کا منظر پھر میرے سامنے موجود تھا' پھر کئی بار میں نے اس تصور کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور بہ مشکل اس میں کامیاب ہوا اور پھر ایک نئی صبح کا آغاز ہو گیا ویسے ہی جیسے کے روز ہوتا تھا۔

میں بیڈ سے اتر کر صوفے پر آ گیا اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا اسی وقت ٹام کمرے میں آ گیا اس کے آفس جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار تھا اس نے کمرے میں آ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے اور میرے قریب آ کھڑا ہوا۔

''تمہاری نوکری کی تلاش کہاں تک پہنچی؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تو صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔'' میں نے بے پرواہی سے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں لیکن کیا واقعی تم کوشش کر رہے ہو؟'' ٹام نے پوچھا لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔

''تمہارے پاس کچھ لوگوں کے کال نمبر ہیں' میرا مطلب ہے تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ تمہیں ایک سیکورٹی گارڈ یا اس سے ملتی جلتی نوکری کون دے سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا اور میں اس کی بات پر طنزیہ ہنسی ہنس دیا۔

''دیکھو یہ میرا مسئلہ نہیں ہے اگر یہ صرف میرا مسئلہ ہوتا تو تم جتنے عرصے چاہتے یہاں ٹھہر سکتے تھے لیکن میری بیوی لنڈا چند ماہ ہی میں ماں بننے والی ہے۔'' ٹام کے لہجے میں معذرت تھی جس پر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا' بہر حال یہ اس کا فلیٹ تھا اور اس کی بیوی اپنے دوسرے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اسے مجھ سے یہاں سے جانے کے لیے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ میرے اسکول کا ساتھی تھا اور میں اسکول کے بعد اب اس سے ملا تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے میری مدد کی تھی اور مجھے اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔

''میں نے تمہاری بات سن لی...... میں آج کچھ کرتا

ہوں اور تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے مجھے اتنے عرصے اپنے گھر رکنے کی اجازت دی۔'' میں نے کہا ٹام نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اٹھا اور کچن میں جا کر اپنے لیے چائے کا ایک کپ تیار کیا اس کی ہوی ابھی نہیں اٹھی تھی میں کچھ بسکٹ اور چائے لے کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور اس وقت فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو!''

''کیا میں جان سکتی ہوں کہ میں کس سے بات کر رہی ہوں؟'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا اور مجھے محسوس ہوا کہ اسے اسی جواب کا انتظار تھا۔

''میرا نام چیرلوٹ ملر ہے میں ایک گورنمنٹ ڈپارٹمنٹ میں سول سرونٹ ہوں مہربانی کر کے مجھے اپنا ملٹری سیریل نمبر بتائیں تاکہ میں آپ کی شناخت کی تصدیق کر سکوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور میں نے اسے اپنا نمبر بتا دیا۔

''شکریہ' میں فارن آفس کی طرف سے کال کر رہی ہوں۔''

''فارن آفس؟'' میں نے دہرایا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی۔

''کیا تمہارے لیے ممکن ہے کہ آج ایک ملاقات کے لیے آ سکو؟'' اس نے پوچھا۔

''آج؟ ایک ملاقات؟ میں.....'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

''آپ کا آنا بہت ضروری ہے۔''

''اوہ.....کیا واقعی؟''

''کیا آپ چار بجے تک آ سکتے ہیں۔''

''لیکن کس سلسلے میں؟''

''آپ پریشان نہ ہوں' جب آپ آئیں گے تو آپ کو سب بتا دیا جائے گا۔'' اس نے کہا پھر اس نے مجھے ایڈریس سمجھایا جسے میں نے قریب پڑے ایک اخبار پر لکھ لیا۔

''جب آپ آئیں تو میرا نام لیجیے گا چیرلوٹ ملر۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے جو ایڈریس دیا گیا تھا وہ ''وائٹ ہال'' کا تھا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ چیرلوٹ ملر کون ہے اور فارن آفس مجھ سے کیا چاہتا ہے؟

میں جلد ہی تیار ہو کر اس ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جب میں بتائے ایڈریس پر پہنچا تو مجھے ایک سیکیورٹی ڈیپارٹمنٹ سے چیک کیا گیا پھر سیکیورٹی گارڈ نے مطمئن ہونے کے بعد میرا نام اپنے پاس لکھی ہوئی لسٹ سے چیک کیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''میں یہاں چیرلوٹ ملر سے میٹنگ کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی جناب' آپ کی میٹنگ روم نمبر سکس میں ہے۔''

''وہ کمرہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کمروں پر نمبر لکھے ہوئے ہیں۔''

''شکریہ' میرا خیال ہے میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

میں جب ویٹنگ ایریا میں پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے اور کسی نہ کسی سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ میں چلتا ہوا کاریڈور میں دائیں جانب مڑ گیا اور کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا روم نمبر سکس کے سامنے جا کر رک گیا پھر میں نے دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ کمرے میں فرش پر قالین بچھا تھا اور کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیوں پر قالین کے رنگ سے مناسبت رکھتے ہوئے ہلکے نیلے پردے پڑے تھے کمرے کے درمیان میں ایک ٹیبل تھی جس پر کافی پاٹ اور کچھ بسکٹ رکھے ہوئے تھے میں نے اپنی گھڑی چیک کی' ٹھیک شام کے چار بجے تھے پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا کمرے میں موجود ایک اور دروازہ کھلا تھا اور ایک عورت اندر آئی تھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس کے انداز سے اعتماد جھلک رہا تھا' اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اس کا چہرہ پرکشش تھا اور اس سے آنکھیں ہٹانا مشکل تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر نظر ڈالی اس کی انگلی میں کوئی رنگ نہیں تھی اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں چیرلوٹ ملر ہوں۔آپ وقت کے بہت پابند ہیں۔''اس نے کہا۔

''بارش کی وجہ سے میں تیز تیز چلتا ہوا آیا ہوں۔''

''آئیں بیٹھیں......آپ کافی لیں گے۔'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

''کیا باہر بارش ہورہی ہے؟ میں تو سارا دن بلڈنگ ہی میں رہی ہوں۔'' اس نے دو کپوں میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

''ریاست کے معاملات میں بہت زیادہ مصروف ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''ہاں ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جو مجھے مصروف رکھتے ہیں۔''اس نے کہا۔

''میری طرح۔''میں نے کہا۔

''ہاں آپ کی طرح۔'' اس نے کہا اور اسی وقت پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا پھر وہ چیرلوٹ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور ایک کپ میں کافی نکالنے لگا تھا۔

''یہ اسٹیفن بریڈشا ہے۔''چیرلوٹ نے کہا اور اس شخص نے اثبات میں گردن ہلائی لیکن مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''بریڈشا کا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے۔''چیرلوٹ نے کہا۔

''کیا یہ وہی ہے؟''بریڈ نے میری طرف اشارہ کر کے چیرلوٹ سے پوچھا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

''جو لسٹ بنائی گئی ہے اس کے مطابق سارے ہی لوگ......'' بریڈشا نے کچھ کہنا چاہا لیکن چیرلوٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہمیں ابھی ایک اور شخص کا انتظار ہے۔''

ہم سب کچھ دیر خاموش بیٹھے اپنی کافی پیتے رہے تھے کچھ دیر بعد پھر دروازہ کھلا تھا۔

''میرا خیال ہے میں لیٹ تو نہیں ہوا ہوں۔'' اندر آنے والے شخص نے کہا۔''باہر بہت ٹریفک ہے۔''

''یہ جارج ونچسٹر ہیں......ان کا تعلق فارن آفس سے ہے۔''چیرلوٹ نے بتایا۔

''آپ کیسے ہیں؟'' اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا پھر اس نے بریڈشا کی طرف دیکھ کر سر ہلایا تھا اور اپنے لیے کافی انڈیلنے لگا تھا۔

''تم حیران تو ہوگے کہ آج ہم نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟'' ونچسٹر نے کہا۔''میرا خیال ہے کہ ایک محب وطن برطانوی فوجی ہونے کے ناتے تم پر بھی اپنے ملک کے لیے کچھ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔''

''سابق فوجی......انہوں نے مجھے نکال دیا تھا کیا تم نہیں جانتے؟''میں نے کہا۔

''آگے بات کرنے سے پہلے میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم نے برطانوی آفیشل سیکرٹ کس ایکٹ پر دستخط کیے ہوئے ہیں چنانچہ یہاں ہونے والی گفتگو کو بھی تمہیں خفیہ رکھنا ہے سمجھ گئے۔'' بریڈشاہ نے پوچھا'اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی اور اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر نیلا سوٹ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔''میں نے کہا اور ونچسٹر نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا تمہیں اب بھی آرمی کے دن یاد آتے ہیں' آج کل کیا کررہے ہو؟''

''کچھ نہیں' میں جاننا چاہتا ہوں مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔''میں سیدھا معاملے کی طرف آگیا جس پر بریڈشا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میری طرف بغور دیکھنے لگا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لیے ایک شخص کو قتل کردو۔'' اس نے کہا کمرے میں خاموشی چھاگئی' میں کمرے میں موجود اپنے تینوں ساتھیوں کے چہرے کے انداز کو دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ بریڈشاہ مذاق کررہا ہے۔

''کسی کو قتل کروں؟ کس کو؟'' میں نے پوچھا میں دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹ ڈھونڈ رہا تھا لیکن وہ سب سنجیدہ تھے۔

''اس بات کا جواب تمہیں اس وقت دے سکتے ہیں جب تم ہماری پیش کش کو قبول کرلو۔''ونچسٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''مجھے بتاؤ تمہاری پیش کش کیا ہے؟' میری بات پر ونچسٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات پر نظر دوڑائی۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ

دوسرے ملکوں کی طرح جیسے امریکہ' روس' چین' اسرائیل' فرانس اور بہت سے دوسرے ملک جب انہیں ضرورت ہوتی ہے تو اس قسم کے اقدامات کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور انہیں سرکاری طور پر کچھ لوگوں کو ختم کرنے کے احکامات جاری کرنے پڑتے ہیں جو ان کے ملک کے لیے خطرہ ہوتے ہیں۔''

''ہاں' میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم انہیں ٹارگٹ کلنگ کہہ سکتے ہو۔'' بریڈ شاہ نے اپنی رائے دی۔

''نہیں یہ کہنا تو مناسب نہیں ہوگا لیکن تم اسے دشمنوں کے خلاف ''تادیبی کارروائی'' کہہ سکتے ہو جو دہشت گردی کے خلاف کی جاتی ہے۔''

''ہاں یہ زیادہ بہتر توجیہہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس مقصد کے لیے ہم کافی تعداد میں لوگوں کو ملازم رکھتے ہیں خاص طور سے پیشہ ور ریٹائرڈ فوجی ہماری ترجیح ہوتے ہیں۔'' اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم گاہے بہ گاہے نئے ممبرز کو شامل کرتے رہتے ہیں' ہماری ریسرچ کے بعد تمہاری فائل اوپر آئی اور ہمارا خیال ہے کہ تم یہ معاملات طے کرنے پر رضامند ہوگے۔'' اس نے کہا اور میں سوچنے لگا کہ یہ بھی سفاکانہ قتل ہوگا فرق صرف یہ تھا کہ اس میں حکومتی رضامندی شامل تھی' سوال کرنے کی اجازت نہیں تھی اور جو کام دیا جاتا تھا وہ کرنا تھا' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مرنے والا کون ہوگا' کہاں رہتا ہوگا اور اسے کیوں مارا جانا تھا' یہ پوچھنے کی اجازت بھی نہیں تھی اور قتل کو شاید کوئی حادثہ دکھانا بھی مقصود ہو میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ بریڈ شاہ بول پڑا' شاید اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

''یہ کوئی پسندیدہ کام تو نہیں ہے میرا خیال ہے تم یہی سوچ رہے ہو لیکن ہماری سیکورٹی کے لیے ضروری ہے اور ہمارے ملک کے عوام کے لیے بھی۔' بریڈ شاہ نے کہا اس کا تعلق بھی ملٹری انٹیلی جنس سے تھا۔

''کام کیسے کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہیں خود سوچنا ہوگا۔'' بریڈ شاہ نے کہا۔ ''ہم پر اسائنمنٹ کے لیے تمہیں ایک معقول معاوضہ دیں گے اور اخراجات الگ ملیں گے۔'' اس نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا جس پر رقم لکھی تھی جو بہت مناسب تھی۔

''ٹھیک ہے۔''

'یہ رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے گی اس پر کوئی ٹیکس نہیں ہوگا' ہم اخراجات کا اندازہ لگا کر تمہیں ایڈوانس رقم دے دیں گے اور میرا ڈپارٹمنٹ باقی کے ضروری انتظامات اور اخراجات کا بھی ذمہ دار ہوگا ہر ممبر کو سال میں کم از کم دو اسائنمنٹ کرنا ہوں گے۔''

''رقم کچھ کم ہے۔'' میں نے اعتراض کیا مجھے اندازہ تھا کہ میں بے روزگار ہوں اور ٹام کے ساتھ رہ رہا ہوں۔

''ہاں ہمیں احساس ہے لیکن ہمارے زیادہ ممبران اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ یہ کام کرتے ہیں وہ زیادہ تر یہ کام اپنی ملازمت کی چھٹیوں کے دنوں میں کرتے ہیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم ان کے لیے اضافی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے ہمارا رابطہ کیسے رہے گا اور اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم تمہیں اپنی جدید کمیونیکیشن ڈیوائس دیں گے جو اسی مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اس کا براہ راست لنک برطانوی انٹیلی جنس سروس سیٹلائٹ سے ہوگا یہ بہت اہم ڈیوائس ہے۔''

''اور اگر کبھی کچھ غلط ہو گیا تو؟''

''ہم جسے اپنے کام کے لیے منتخب کرتے ہیں اس کا خیال بھی رکھتے ہیں پھر وہ سب تجربہ کار ہوتے ہیں۔ غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔''

''پھر بھی غلطیاں تو ہو سکتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ایسا ممکن ہے' ہر اسائنمنٹ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔'' اس نے اب بھی میری بات کا جواب نہیں دیا تھا چنانچہ میں نے مزید وضاحت چاہی۔

''فرض کرو میں کسی غیر ملک میں ایک لاش کے ساتھ پکڑا جاتا ہوں پھر.....؟ پھر کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسی صورت میں ہم اس ممبر کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔''

'کیسے؟''

''اس کے لیے ہم اپنے دوسرے ذرائع استعمال کریں گے۔''

''دوسرے ذرائع؟''

''اسائنمنٹ کرنے والے ممبرز خود کو سویلین ہی ظاہر کریں گے' ان کا کوئی تعلق برطانوی حکومت سے نہیں ہوگا' اگر تم پکڑے گئے تو تم خود کو برطانوی سیاح ظاہر کرو گے جسے حکومت نے نہیں بھیجا ہوگا' اس لیے ہم تمہارا اصلی نام استعمال کررہے ہیں تمہارا پاسپورٹ بھی اصلی ہوگا تمہاری شناخت ایک عام برطانوی شہری کی ہوگی اور میرا خیال ہے کہ اس سب کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ تم کوئی غلطی نہیں کرو گے اور پکڑے نہیں جاؤ گے' کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' میری بات کا جواب ون چسٹر نے دیا تھا میں نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرے ساتھ ایسا ہوا تو غیر ملک میں میری حیثیت صرف ایک عام برطانوی شہری کی ہوگی اور میں غیر محفوظ ہوں گا' میں نے ونچسٹر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''کوئی اور سوال؟'' بریڈشا نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں' میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرا انتخاب کیوں کیا گیا؟''

''اس کا جواب سر ون چسٹر نے دے دیا ہے کہ ہم ریٹائرڈ فوجی منتخب کرتے ہیں۔'' بریڈشا نے کہا۔

''لیکن خاص طور سے میں ہی کیوں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''تمہاری فائل کے مطابق اور تمہارے کچھ سنیئر ساتھیوں کی رائے کے مطابق تمہیں اپنے ایک سنیئر ساتھی کو زدوکوب کرنے پر آرمی سے نکالا گیا ہے اور تم ہر مقابلے میں اول آتے تھے۔''

''تم میرے ذریعے کسے ختم کروانا چاہتے ہو؟''

''کیا ہم یہ سمجھیں کہ تمہیں ہماری پیش کش منظور ہے؟'' ون چسٹر نے پوچھا۔

''ہاں سر ون چسٹر مجھے آپ کی پیشکش منظور ہے۔'' میں نے جواب دیا جو بریڈشا اور چیرلوٹ کی توقع کے عین مطابق تھا۔

''تمہیں جو اسائنمنٹ دیا جارہا ہے وہ ابھی اسی وقت سے شروع ہوتا ہے۔'' ونچسٹر نے پھر اپنی بات شروع کی۔ ''اب بریڈشا اور چیرلوٹ اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں گے اور تمہارے ساتھ تعاون کریں گے مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے اٹھ کر ہم تینوں سے مصافحہ کیا۔

''مجھے ایک ڈنر پر جانا ہے جو ہانگ کانگ کے سفیر کے ساتھ ہے اور وہ وقت کا بہت پابند ہے۔'' ونچسٹر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ونچسٹر کے جاتے ہی بریڈشا چیرلوٹ کی طرف مڑا تھا۔

''تو پھر ہم کام کا آغاز کریں؟'' اس نے کہا اور چیرلوٹ نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے لیدر کی ایک فائل نکالی اور اسے کھولنے لگی اس دوران میں نے اپنے لیے ایک کپ میں کافی نکال لی۔

''تمہارا ٹارگٹ ایک سفید فام برطانوی مرد ہے اس کی عمر تنتیس سال ہے اس کا تعلق آکسفورڈ سے ہے' لیکن آج کل وہ اسپینش آئس لینڈ نیٹی رف میں رہتا ہے' اس کا نام جافری بٹن ہے۔'' چیرلوٹ نے میری طرف ایک تصویر بڑھائی اس میں موجود شخص کے سر کے بال چمکیلے اور لمبے تھے آنکھیں چھوٹی اور چہرہ اور جسم بہت دبلا سا تھا۔

''وہ آئس لینڈ کے مغربی ساحل پر موجود منوعہ علاقے میں رہتا ہے ہمیں اس کی صحیح لوکیشن معلوم نہیں ہے لیکن تمہارے جانے سے پہلے ہمیں امید ہے کہ پتہ چل جائے گا۔''

''میرے جانے سے پہلے؟ تمہارا کیا مطلب ہے مجھے کب جانا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم نے کل صبح کی فلائٹ تمہارے لیے بک کرائی ہے جو تمہیں نیٹی رف لے جائے گی کیوں کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' چیرلوٹ نے پوچھا۔

''نہیں' کوئی مسئلہ نہیں۔''

''اس شخص نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ اسے اتنی خاص توجہ دی جارہی ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں تمہیں صرف اپنا کام کرنا ہے اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہے اور بس۔'' بریڈشا نے چیرلوٹ کی جگہ مجھے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''یاد رکھنا کہ ٹرنٹی یورپین یونین کا ممبر ہے اور ہمارا دوست ہے ہم چاہتے ہیں کہ موت قدرتی معلوم ہو اور اس پر کسی قسم کے شکوک وشبہات سر نہ اٹھائیں۔

''تمہارے ذہن میں کیا طریقہ ہے؟'' میں نے

ا پھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم خود اس کا مناسب جواب تلاش ر و گے اور کوشش کرو گے کہ موت قدرتی معلوم ہو۔'' یہ لوٹ نے کہا پھر اس نے اپنے بیگ سے پلاسٹک کا ایک ا بہ نکالا تھا۔

''یہ ایک کیمیکل ہے جو ہارٹ اٹیک جیسی موت سے ہمکنار کر دیتا ہے اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ تیار حالت میں مل جاتا ہے ایک سرنج میں جس کے ساتھ سوئی بھی لگی ہوتی ہے تمہیں بس اپنے ٹارگٹ کو یہ انجکشن لگانا ہوگا اسے ایسی جگہ لگایا جائے جہاں اس کا نشان بھی نظر نہ آئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے وہ پلاسٹک کا ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

''اس میں دو انجکشن ہیں انہیں احتیاط سے رکھنا۔'' چیرلوٹ نے کہا اور پھر بریڈشا کو اشارہ کیا کہ وہ اگر چاہے تو آگے بات کر سکتا ہے بریڈشا نے بھی اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک بکس نکالا جس میں کالے رنگ کی ایک ڈیوائس لگی تھی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میرا نیا فون ہے بریڈشا نے اسے آن کیا اس کا اسکرین روشن ہو گیا۔

''یہ K-160 ہے تمہاری رابطے کی ڈیوائس جو تمہیں ہم سے رابطے میں رکھے گی اسے ہر وقت آن رکھنا' چاہے تم کہیں بھی ہو اس کا چارجر اور دوسری چیزیں اس بکس میں موجود ہیں تم ٹرینٹی رف میں ضرورت سے زیادہ وقت مت گزارنا۔'' بریڈشا نے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے' کیا میں یہ ڈیوائس چیک کرنے کے لیے چیرلوٹ کو کچھ میسج بھیج سکتا ہوں؟'' میں نے شرارت سے کہا لیکن بریڈشا کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں آئی وہ مجھے ڈیوائس کے بارے میں سمجھاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے مجھے کچھ رقم دی تھی جو میرے اخراجات کے لیے تھی۔

''ہم نے وہاں تمہاری رہائش کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا ہے تمہیں ہوٹل میں رہنا نہیں پڑے گا۔'' چیرلوٹ نے مجھے بتایا۔ ''یہ گھر سمندر کے کنارے واقع ہے اور ایک مقامی پراپرٹی ڈیلر سے لیا گیا ہے اس کے پاس تمہارا کانٹیکٹ نمبر ڈی کورٹس سلور کے نام سے لکھا ہوا ہے جب تم ایئرپورٹ پر اترو گے تو وہاں ایک کار تمہاری منتظر ہوگی' تمہاری ڈیوائس میں ڈی کورٹس سلور اور اسٹیٹ ایجنٹ کا نمبر بھی سیو ہے' کار تمہارے اصل نام سے ہی کرائے پر لی گئی ہے۔ ڈی کورٹس سلور تم سے تمہارے گھر پر ملے گی اور تمہیں گھر کی چابیاں دے گی اور اطراف کے بارے میں معلومات دے گی۔''

بریڈشا ہدایات دینے کے بعد رخصت ہو گیا تھا اور میں نے چیرلوٹ کو بتایا تھا کہ میرے پاس کار نہیں ہے چنانچہ وہ مجھے شام کے فلیٹ تک چھوڑنے کے لیے رضامند ہو گئی تھی اور میں کچھ دیر مزید اس کے ساتھ گزار سکتا تھا وہ مجھے اچھی لگی تھی اس کے باتیں کرنے کا انداز دھیما دھیما اور دل کو مسحور کرنے والا تھا اس نے مجھے بتایا کہ وہ چھٹیوں پر جارہی ہے۔

''کل صبح ساڑھے سات بجے تمہاری فلائیٹ ہے اور فلیٹ سے تمہیں وہاں تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگے گا' میں تمہیں فلیٹ سے لوں گی اور ایئرپورٹ چھوڑ دوں گی میں صبح ساڑھے پانچ بجے لینے آؤں گی۔'' چیرلوٹ نے مجھے بتایا جب وہ مجھے شام کے فلیٹ پر چھوڑنے جارہی تھی۔

''اوہ تمہارا شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''تم فلیٹ پہنچ کر پیکنگ کر لینا اپنا پاسپورٹ ' ڈرائیونگ لائسنس' رقم اور گرمی کے کپڑے رکھنا مت بھولنا' ٹینی رف میں موسم گرم ہوگا اور وہاں K-160 کے ہرگز نہ بھولنا۔'' اس نے ہدایت کی۔

''فلیٹ پر تو شاید کھانا نہ ملے دیر ہو گئی ہے اور میرا دوست اور اس کی بیوی سو گئے ہوں گے' کیا ہم کہیں کھانا کھا سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''اتنے سارے بسکٹ اور کافی پینے کے بعد بھی تم بھوکے ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں' کیا تمہیں یہاں کوئی اچھا ریسٹوران نظر آرہا ہے؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں' ویسے مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی پھر ہم ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے تھے اور کھانے کا آرڈر دیا تھا۔

''تمہاری آرمی فائل میں لکھا ہے کہ تم کسی ناپسندیدہ عمل کی وجہ سے نکالے گئے تھے تم نے وجہ بتائی تھی لیکن

مجھے اس پر یقین نہیں ہے صحیح بات کیا تھی؟'' چیرلوٹ نے کھانے کے دوران پوچھا۔

''میں نے ایک سنیئر آفیسر کو تقریباً مار ہی دیا تھا۔'' میں نے اسے سچائی بتائی۔

''کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''وہ مجھے ایک مشن پر لے گیا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ میری ماں ایک اسپتال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑی ہے اس نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟''

''ہم میں فائٹنگ ہوئی تھی اور میں نے تقریباً اس کی گردن توڑ ہی دی تھی۔''

''ہوا کیا تھا؟''

''جب ہم مشن سے واپس آئے تو مجھے پتا چلا کہ میری ماں فوت ہوگئی ہے اور وہ جانتا تھا لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا اور مشن پر لے گیا۔''

''پھر؟''

''میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ اسے مرنا ہی تھا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے' یہ سن کر میں آپے سے باہر ہوگیا اور اسے مارنے لگا' ہمیں ہمارے دوسرے ساتھی نے الگ کیا تھا اور پھر مجھے آرمی سے نکال دیا گیا۔''

''تمہیں کھو کر ان کا نقصان ہوا' اور ہمارا فائدہ۔'' چیرلوٹ نے کہا۔

''ہاں' شاید۔''

''آرمی سے نکلنے کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''میں نے اپنے دوست ٹام سے رابطہ کیا وہ میرا اسکول کے زمانے کا دوست ہے اس نے میری مدد کی' آج کل میں اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتا ہوں۔'' میں نے کہا اس بار چیرلوٹ کے چہرے پر مجھے اطمینان نظر آیا' اب وہ خوش نظر آرہی تھی۔

''ونچسٹر کے ساتھ کام کرتے ہوئے تم کافی لوگوں سے ملی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' تم پہلے فرد ہو میں اس لائن میں نئی ہوں۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ کیا جافری بٹن کو یہ علم تو نہیں کہ وہ کسی کا نشانہ ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اسے میرے وہاں جانے کی خبر نہیں ہوگی۔''

''کیا تمہیں کوئی خوف محسوس ہو رہا ہے؟'' چیرلوٹ نے پوچھا اور میں نے ہنس کر بات کو وہیں چھوڑ دیا' میں جانتا تھا کہ وہ چالاک ہے اور کچھ باتیں مجھ سے چھپا رہی ہے لیکن مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ باتیں زیادہ اہم نہیں ہوں گی۔

''اس وقت جو معاشی اور مالیاتی صورت حال ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' کچھ دیر بعد چیرلوٹ نے پوچھا۔

''بعض لوگ بہت خودغرض اور لالچی ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہی معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

''ہاں وہ لوگ جو اپنی ملازمتیں اور گھر ان کی وجہ سے گنوا دیتے ہیں انہیں فرق پڑتا ہے دراصل بعض اوقات حکومت بھول جاتی ہے کہ معاشیات اصل میں لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کا علم ہے' صرف دولت کا نہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کیا چیزوں کو بہتر کیا جا سکتا ہے؟''

''ہاں' بالکل ایک اچھی اور ایماندار حکومت جسے اپنے سارے عوام کا خیال ہو اور اس کا معاملات پر پورا کنٹرول ہو وہ معاملات کو بہتر کر سکتی ہے۔''

کھانے کا بل میں نے چیرلوٹ ہی کو دینے دیا تھا واپسی پر اس نے مجھے فلیٹ پر چھوڑا تھا اور ایک بار پھر یاد دلایا تھا کہ وہ صبح ساڑھے پانچ بجے مجھے لینے آئے گی جب میں فلیٹ میں پہنچا تو ٹام اور اس کی بیوی سو چکے تھے میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی پیکنگ کرنے لگا پھر میں نے ان دونوں کے لیے ایک نوٹ لکھا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ صبح جب میں جاؤں گا تب وہ سو ہی رہے ہوں گے پھر جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میرے موبائل پر چیرلوٹ کا پیغام آیا تھا۔

''الارم لگانا مت بھولنا اور ٹھیک ساڑھے پانچ بجے باہر آجانا اب آرام کرو۔'' چیرلوٹ

سونے سے پہلے مجھے جافری بٹن کا خیال آیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیا جرم کیا تھا کہ وہ نشانہ بنے

جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

چیرلوٹ سوچ رہی تھی کہ اس نے درست شخص کا انتخاب کیا ہے اس نے بغور فائلیں چیک کی تھیں اور بہت احتیاط کے ساتھ انتخاب کیا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ یہ سب بہت عجلت میں کرنا پڑا تھا۔ اس نے بہت باریک بینی سے اس کا چہرہ پڑھا تھا اس کام میں چیرلوٹ کو مہارت حاصل تھی وہ بہت اعتماد کے ساتھ ونچسٹر سے باتیں کررہا تھا یہ ایک اچھی علامت تھی اس نے گھر پہنچتے ہی میری ویدر کو فون کیا تھا اور اسے دوسری طرف سے میری ویدر کی آواز سنائی دی تھی۔

''ہاں مائی ڈیئر سب کچھ ٹھیک ہوگیا؟'' میری ویدر نے پوچھا اور چیرلوٹ کو پھر خیال آ گیا کہ اسے میری ویدر کی آواز کسی انگلش اداکار سے ملتی ہوئی کیوں لگتی ہے۔

''ہاں' سب ٹھیک رہا...... وہ کل صبح ساڑھے سات بجے فلائی کرجائے گا۔''

''بہترین...... تم نے ٹھیک کیا...... یہ بتاؤ تمہیں یقین ہے کہ وہ واقعی جائے گا؟''

''میں اسے خود ایئرپورٹ چھوڑنے جاؤں گی۔''

''گڈ...... یہ ٹھیک ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں نے صحیح شخص کا انتخاب کیا ہے۔''

''فکر مت کرو...... میرا بھی یہی خیال ہے کیا بریڈشا نے کوئی مشکل سوالات کیے تھے؟''

''اس نے کوشش کی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا وہ کچھ مزید جاننا چاہتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں وہ ڈپریشن کا شکار ہے نہیں کہا جاسکتا کہ آگے چل کر اس کا رویہ کیا ہوگا' مجھے اس پر نظر رکھنا ہوگی۔''

''ہاں جو بھی صورت حال ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہیں کیا کرنا ہے تمہاری نظر ان معاملات پر گہری ہونا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

میری ویدر سے بات کرنے کے بعد چیرلوٹ مطمئن ہوگئی تھی اور وہ چیزوں کو جس طرف لے جارہی تھی وہ اس مقصد میں کامیاب تھی۔ پھر اس نے اپنے منتخب کیے ہوئے فوجی کو MSG کیا تھا اور اسے صبح ساڑھے پانچ بجے تیار رہنے کا کہہ کر خود بھی بیڈ پر چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

علی الصبح کافی سردی اور اندھیرا تھا لیکن میں ایک فوجی ہونے کے ناتے اس کا عادی تھا میں بیڈ سے اٹھا میں نے ایک کپ کافی بنا کر پی میں نے اپنے بیگ میں رکھی چیزوں کو ایک بار پھر چیک کیا' میرا پاسپورٹ' ڈرائیونگ لائسنس' میرا پرس اور K-160 اس میں موجود تھے میں نے K-160 کو اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالا' صبح کے پانچ بج کر انتیس منٹ ہوئے تھے میں ٹام کے فلیٹ سے نکل گیا' چند قدم کے فاصلے پر اپنے وعدے کے مطابق چیرلوٹ اپنی کار کے ساتھ میری منتظر تھی۔ میں نے اپنا بیگ پچھلی سیٹ پر ڈالا اور اس کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً ہی کار آگے بڑھادی تھی۔

''ہمیں وقت پر پہنچنا چاہیے کہیں فلائیٹ نہ نکل جائے۔'' اس نے کہا وہ اس وقت عام سا لباس پہنے ہوئے تھی۔ جینز کے ساتھ سلک کی ہلکی سی شرٹ' وہ اپنی عمر سے خاصی چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک پونی کی صورت میں پیچھے باندھا ہوا تھا۔

''آج تم مختلف لگ رہی ہو جینز تمہیں سوٹ کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہوں...... میں ڈرائیونگ کے دوران ایسا لباس پہننا پسند کرتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا آج وہ زیادہ پراعتماد نظر آرہی تھی لیکن پرسکون بھی تھی جیسے چیزیں اس کی مرضی کے مطابق ہورہی ہوں۔

''تمہیں جو سرنجیں دی ہیں وہ تم نے رکھ لی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں رکھ لی ہیں۔''

''انہیں استعمال کرنے کے بعد ضائع کردینا۔''

''ہاں میں جانتا ہوں مجھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا۔''

''ہاں یہی طریقہ کار ہونا چاہیے۔'' پھر اس نے کچھ دیر بعد میری طرف دیکھا تھا۔

''کیا تم نے ناشتہ کرلیا؟''

''ایک کپ کافی لی ہے۔''

''پیچھے سیٹ پر پیکٹ میں کچھ پیسٹریز ہیں میں آتے

ہوئے راستے میں ایک بیکری سے لیتی آئی ہوں۔'' اس کی بات پر میں نے پچھلی سیٹ پر پڑا پیکٹ اٹھالیا تھا۔

''کیا تم ایک لینا پسند کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید بعد میں لوں۔'' اس نے جواب دیا اور میں نے پیکٹ سے نکال کر پیسٹری کھانا شروع کردی' آہستہ آہستہ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور سڑک پر دوسری کاریں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

''میرے بیگ میں پانی کی بوتل بھی ہے۔'' چیرلوٹ نے کہا تو میں نے اس کے بیگ سے بوتل نکال کر چند گھونٹ لیے اور بوتل اس کی طرف بڑھادی اس نے چند گھونٹ لے کر بوتل پھر مجھے دے دی۔

''کیا تمہیں جافری بٹن کا ایڈریس ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں' جب مجھے ملے گا تو میں تمہیں تمہارے K-160 پر بھیج دوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں ایک بات میں کل بتانا بھول گئی تھی جب تم اس شخص کو ٹھکانے لگاؤ تو اس سے پہلے اس کی شناخت صحیح طور پر کرلینا کیونکہ ماضی میں ایسے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ غلط شخص نشانہ بن گیا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے لیکن ایسا ہونے کا امکان بہرحال رہتا ہے' احتیاط سے کام لینا۔''

''ٹھیک ہے میں غلط آدمی کو مارنے سے پرہیز کروں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں ایسی غلطیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ ہماری ساری محنت برباد ہوجاتی ہے۔''

''میرا خیال ہے تم اس کام میں نئی ہو چنانچہ میں تمہارے لیے اضافی کام نہیں بڑھاؤں گا۔''

''مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔'' اس نے کہا اب ہم ایئرپورٹ کے قریب پہنچ گئے تھے میں نے ایک اور سوال پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

''تم جیسی شخصیت جو سول سرونٹ ہو اس معاملے میں کیسے شامل ہوگئی؟ کہیں تم واقعی سیکرٹ انٹیلی جنس سروس کے لیے کام تو نہیں کرتیں؟''

''میں صرف ملٹری انٹیلی جنس کی مدد کررہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس تمہارا K-160 ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''اسے سارا وقت سوئچ آن رکھنا ہے بھولنا نہیں۔''

''ہاں تم نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا۔''

''کیا تمہارے پاس تمہارا اپنا فون بھی ہے؟''

''کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟'' میں نے پوچھا لیکن اس نے اس کا جواب نہیں دیا۔

''تمہارے K-160 میں میرا ڈائریکٹ نمبر محفوظ ہے اگر تمہارے پاس تمہارا اپنا فون بھی ہے تو اس نمبر کو اس میں بھی کاپی کرلو شاید تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے کسی وقت اس کی بھی ضرورت پڑ جائے۔''

''بھلا کیوں؟''

''بس' احتیاطاً۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور چیرلوٹ نے کار ڈپارچر بلڈنگ کے باہر روک دی۔

''لفٹ دینے کے لیے تمہارا شکریہ۔'' میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا اور اس نے اچانک ہی مجھے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا پھر اس نے میرے ہونٹوں پر بوسہ دیا تھا اور میں حیران رہ گیا تھا' میں ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا' میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے ویکٹسٹر اور بریڈشا کی طرح الوداع کہے گی لیکن اس کے اس عمل پر میں حیران رہ گیا تھا' پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا اس کے جواب میں میں بھی مسکرا دیا تھا اور کار سے باہر آ کر دروازہ بند کردیا تھا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر ڈپارچر انٹرنس سے ایئرپورٹ میں داخل ہوگیا تھا۔

میری فلائٹ ساڑھے چار گھنٹے کی تھی اور اس عرصے میں میں نے اپنی ہدایات والی فائل پڑھ لی تھی میرا K160 ایک عام موبائل کی طرح کام کررہا تھا اور میں نے اسے مستقل آن کررکھا تھا۔ میں چیرلوٹ کے بوسے کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا اور مجھے اس سے دوبارہ ملنے کا انتظار تھا۔

ٹینی رف پہنچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ڈی کورٹس سلور سے رابطہ کیا جس نے مجھے ایک رینٹ اے کار کمپنی سے کرائے پر کار دلوائی اور مجھے میرے گھر کی چابیاں اور اس شہر کا نقشہ فراہم کیا پھر میرے گھر پر مجھے چھوڑ کر وہ چلی گئی تھی اور جاتے جاتے مجھے ایک ریستوران

کا کارڈ دے گئی تھی جس کا نام Take a food تھا' کورٹس سلور گندمی رنگت والی الہڑ دوشیزہ تھی اس نے بہت مختصر لباس پہنا ہوا تھا اس کے گھنگھریالے بال اس کے چہرے پر بھی لہرا رہے تھے۔

مجھے رہنے کے لیے جو گھر ملا تھا وہ بہت خوبصورت تھا اور ساحل کے قریب واقع تھا اس کا فرش سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا' فرنیچر بھی سفید تھا اور کمروں سے الگ ایک ٹیرس میں کافی بڑا سوئمنگ پول بھی موجود تھا میں نے سب سے پہلے کمروں میں موجود تمام الماریوں کا جائزہ لیا تھا پھر اپنے سوٹ کیس سے سامان نکال کر بیڈروم کی الماری میں منتقل کر دیا تھا' میرے پاس ایک ہفتہ تھا مجھے اتنے ہی عرصے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا اور اس عرصے میں مجھے جافری بٹن کو تلاش کر کے اس کا کام تمام کرنا تھا میں نے سامان رکھنے کے بعد K160 سے چیرلوٹ کو MSG کیا کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں اس کے بعد میں اپنی کار لے کر نکل گیا اور قریبی مارکیٹ سے کچھ ضرورت کا سامان خرید کر لایا کیونکہ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی' پھر میں نے کچھ سینڈوچ کھائے اور کولڈ ڈرنک پی اس کے بعد میں سو گیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا K160 چیک کیا لیکن کوئی Msg نہیں آیا تھا اور مجھے جافری بٹن کے ایڈریس کا شدت سے انتظار تھا میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور سمندر کی لہروں سے لطف اٹھاؤں میں نے اپنا بڑا سا تولیہ لیا اور گھر کو لاک کر کے چہل قدمی کرتا ہوا ساحل کی طرف بڑھ گیا وہاں کچھ سیاح ہوا خوری کر رہے تھے اور کچھ سمندر میں نہا رہے تھے میں بہرحال ایک سیاح کے طور پر ہی یہاں آیا تھا اور جب تک مجھے جافری کا پتہ نہیں مل جاتا مجھے اپنا وقت گزارنا تھا' کچھ دیر نہانے کے بعد مجھے شدت کی بھوک لگنے لگی اور میں واپس گھر آ گیا' جہاں میں نے کپڑے تبدیل کیے اور کورٹس سلور کا دیا ہوا کارڈ لے کر ریستوران کے لیے روانہ ہو گیا' اس کارڈ کی پشت پر ریستوران تک پہنچنے کا نقشہ بنا ہوا تھا اور میں اپنے K-160 سے بھی مدد لیتا جا رہا تھا' راستہ بہت پرکشش تھا' سڑک کے دونوں اطراف ہریالی تھی' جھاڑیاں اور درخت کثرت سے لگے ہوئے تھے' کچھ ہی دیر میں میں Take a food پہنچ گیا تھا۔

''ہیلو سینیور'' بارمین نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟''

''کوکا کولا.....'' میں نے کہا اس نے ایک بڑا گلاس بھرا اور اس میں برف ڈال کر میری طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' میں نے گلاس لیتے ہوئے کہا اور اسی وقت مجھے کورٹس سلور نظر آئی۔

''اوہ آخر تم نے ہمیں ڈھونڈ ہی لیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اس وقت اس کے چہرے پر میک اپ تھا جو پہلی ملاقات میں نہیں تھا۔

''تمہارا ریستوران بہت اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا تمہیں بھوک لگی ہے تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... یہاں کیا ملے گا؟''

''آج تم میرے مہمان ہو دراصل یہاں ایک برتھ ڈے پارٹی ہے میں تمہیں اس میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہوں' چنانچہ کھانا میری طرف سے ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''بہت خوب۔''

''آؤ میں تمہیں تمہاری ٹیبل دکھاؤں۔'' وہ چند قدم آگے بڑھی اور میں نے اس کی تقلید کی اس نے مجھے ایک ایسی ٹیبل پر بٹھایا تھا جو کھڑکی کے قریب تھی اور جہاں سے سمندر کا منظر نظر آ رہا تھا اس میز کو دو لوگوں کے لیے سجایا گیا تھا۔ سمندر میں تیرتی ہوئی کشتیوں کی روشنیاں فضا میں جگمگا رہی تھی اور مسحور کن منظر پیش کر رہی تھیں۔

''تمہیں گھر پسند آیا؟'' اس نے میرے ہاتھ میں مینو تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... شکریہ..... اچھا ہے۔''

''تم اپنے قیام کے دوران یہاں کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''آرام کروں گا' کتابیں پڑھوں گا' تم جانتی ہو چھٹیوں پر آیا ہوا سیاح کیا کر سکتا ہے۔''

''لندن میں تم کیا کرتے ہو؟''

''میں ایک بینک میں ملازم ہوں' میں بینک کے

کار بوریٹ انویسٹمنٹ ڈپارٹمنٹ میں ہوں۔''

''انویسٹمنٹ تو کیا تم امیر ہو؟''

''نہیں' وہاں دوسرے لوگوں کی رقم ہوتی ہے مجھے تو تنخواہ ملتی ہے۔''

''تم دیکھنے سے بینکر تو نہیں لگتے۔''

''تو میں کیا لگتا ہوں؟'' میں نے پوچھا اور وہ مجھے بغور دیکھنے لگی۔

''مجھے نہیں پتہ..... تم کچھ اور لگتے ہو' شاید کوئی فوجی۔''

اس نے کہا میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور مینیو میز پر رکھ دیا تھا۔

''میں اسٹیک لوں گا اور ایک گلاس مزید کوک۔'' میں نے کہا اور کورٹس مینیو اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ اچانک میرے K-160 کی بیل ہوئی اور میں نے جیب سے فون نکال کر دیکھا چیرلوٹ کا وہ Msg آ گیا تھا جس کا مجھے انتظار تھا اس نے جافری کا ایڈریس بھیجا تھا اسکرین پر ایک گرین کلر کا ایئر ونظر آ رہا تھا جسے نیچ کرنے پر وہ مجھے جافری تک پہنچنے کا راستہ دکھا رہا تھا میں اسکرول کرنے میں محو تھا کہ مجھے کورٹس کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

''کیا گھر سے کوئی Msg آیا ہے؟'' اس نے میز پر آرڈر کی چیزیں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہاری بیوی تمہیں ڈھونڈ رہی ہے کہ تم کہاں ہو تم اسے بتا کر آئے ہو؟'' اس نے شرارتی لہجے میں کہا اور میں نے موبائل بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''میں شادی شدہ نہیں ہوں' یہ میرے باس کا Msg ہے جاننا چاہتا ہے کہ میں خوش ہوں۔'' میں نے کہا۔ کورٹس میری بات پر یوں مسکرائی جیسے اسے میری سچائی پر شک ہو۔

ڈنر کرنے کے بعد میں اپنی کار میں واپس آ بیٹھا تھا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جافری کی رہائش صرف مجھ سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھی میں نے پھر K160 نکالا اور اس تک پہنچنے کے راستے کا جائزہ لینے لگا پھر میں نے کار اسٹارٹ کی تھی اور جافری کی رہائش کی سمت بڑھ گیا تھا۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد میں مطلوبہ ایڈریس تک پہنچ گیا تھا بڑے سے گیٹ پر وہی ایڈریس لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے ''CCTV camaras oprration'' نظر نہیں آیا ویسے اندھیرا ابھی ہو چکا تھا میں چاہتا تو بلڈنگ میں داخل ہو کر اپارٹمنٹ 18 ڈھونڈھ لیتا اور جافری تک پہنچ کر اسے ختم کر دیتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا میں اپنے ساتھ وہ سرنجیں نہیں لایا تھا وہ تو میری رہائش گاہ پر تھیں چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج اتنا ہی کافی ہے یہ کام میں کل کروں گا چنانچہ میں واپس پلٹ آیا۔

گھر پہنچنے کے بعد میں ایک بار پھر پرسکون ہونے کے لیے ٹیرس میں بنے پول میں اتر گیا مجھے بہت سکون مل رہا تھا اور میں آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہا تھا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے جافری کو مارنے سے پہلے اس کو دیکھنا تو چاہیے نہ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ کام مجھے جتنا آسان لگ رہا تھا اتنا آسان نہیں تھا۔

اگلے روز میں پھر جافری کی تلاش میں اس بلڈنگ میں پہنچا وہاں میں نے اپارٹمنٹ 18 ڈھونڈ لیا لیکن اس بلڈنگ کے دوسرے رہائشی نے بتایا کہ جافری بٹن نام کا ایک شخص وہاں رہتا ضرور تھا لیکن کئی ماہ پہلے یہاں سے چلا گیا ہے ویسے اپارٹمنٹ اب بھی اس کی ملکیت ہے میں حیران تھا کہ چیرلوٹ نے مجھے جافری کا درست ایڈریس کیوں نہیں بھیجا یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کی معلومات اتنی ناقص ہوں کہ اسے جافری کے ایڈریس کے بدل جانے کا علم ہی نہ ہو جبکہ وہ کئی ماہ پہلے وہ جگہ چھوڑ چکا تھا میں پھر اس بلڈنگ سے ناکام واپس آ گیا واپسی پر میں Take afood میں جا بیٹھا اور اپنے لیے کافی کا آرڈر دے کر K106 پر چیرلوٹ سے رابطہ کرنے لگا۔

''لندن سے مجھے مارنے آئے ہو میری تلاش میں ہو۔'' کسی نے مجھ سے کہا میں نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا وہ وہی تھا..... جافری بٹن..... میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا اس کے لمبے سیاہ بال اس کے شانوں تک پھیلے ہوئے تھے وہ منحنی جسم اور چہرے والا شخص بہت کمزور اور سیدھا سادا سا لگ رہا تھا بھلا اسے مارنے کے لیے ایک ریٹائرڈ آرمی انٹیلی جنس کی کیا ضرورت تھی اچانک ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا وہ اپنے ہاتھوں میں کالے رنگ کا ایک بیگ پکڑے ہوئے تھا جسے اس نے سختی سے اپنے سینے سے چمٹایا ہوا تھا جیسے اسے اس بیگ کے چھن جانے کا خطرہ ہو وہ مجھے بہت بے ضرر لگا۔

''تمہیں مجھے مارنا نہیں بلکہ مجھے بچانا ہے۔'' اس نے

کہا۔

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں چیرلوٹ نے یہاں مجھے بچانے کے لیے بھیجا ہے مارنے کے لیے نہیں' تم اس سے فون پر پوچھ لو۔'' اس نے کہا اور میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے K106 سے اس کے کہنے پر چیرلوٹ کا نمبر ملانا چاہا۔ اس عرصے میں کورٹس نے میری کافی میز پر لا کر رکھی تھی وہ عجیب نظروں سے مجھے اور جافری کو دیکھ رہی تھی لیکن کچھ بولے بغیر کافی رکھ کر چلی گئی تھی۔

''بیٹھو۔'' میں نے جافری سے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں تمہیں مارنے آیا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے چیرلوٹ نے بتایا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس نے تمہیں یہ کیوں بتایا ہے؟''

''دراصل وہ مجھے مارنا نہیں چاہتی' اس نے کہا تھا کہ تم بہت سے سوالات کرو گے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں کہوں کہ تم خود کال کر کے اس سے بات کر لو۔'' جافری نے کہا۔

''اوہ' کیا واقعی؟ اس نے ایسا کہا تھا؟' میں نے حیرت سے کہا اور پھر چیرلوٹ کا نمبر ملانے لگا۔

''چیرلوٹ نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں منع کروں کہ تم اپنا فون مت استعمال کرنا اس نے کہا تھا کہ تم کوئی عام فون استعمال کرنا یہ بہت ضروری ہے۔''

''واقعی؟'' میں نے کہا لیکن میں نے K106 سے ہی چیرلوٹ کا نمبر ملا لیا جافری حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے جافری سے کہا تھا کہ وہ تمہیں K106 استعمال نہ کرنے دے فوراً فون بند کرو۔'' چیرلوٹ نے غصے سے کہا۔ اس کی آواز سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پریشان بھی ہے اور غصہ میں بھی ہے۔

''چیرلوٹ کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ فون بند کرو اور مجھ سے کسی اور pay phone سے بات کرو۔'' چیرلوٹ نے پھر کہا۔

''مجھے بتاؤ..... ابھی بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔''

''تمہیں وہاں میں نے جافری کو بچانے کے لیے بھیجا ہے مارنے کے لیے نہیں اور تم بہت خطرے میں ہو۔'' چیرلوٹ نے کہا اور فون بند کر دیا' مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے وہ بہت پریشان لگ رہی تھی اس نے جس طرح سے کال کاٹی تھی مجھے لگا کہ کوئی ہم تک پہنچنے والا ہے میں الرٹ ہو گیا اور میں نے فکرمندی سے جافری کی طرف دیکھا اسی وقت ایک تیز رفتار کار ریستوران کے باہر آ کھڑی ہوئی اس کے بریک ایک تیز آواز کے ساتھ چرچرائے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس میں سے تین افراد باہر آئے تھے میں کھڑکی سے یہ منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا وہ سلور کلر کی کار تھی مجھے احساس ہوا کہ وہ ہمارے لیے ہی یہاں آئے ہیں میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی میں اس موقع کے لیے تیار تھا۔

''یہ تینوں ہماری تلاش میں ہیں ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا' چلو پچھلے راستے سے نکلتے ہیں سمجھے۔'' میں نے جافری کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹا وہ میری بات سمجھ گیا تھا پچھلے حصے میں جو باورچی کام کر رہے تھے انہوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا تھا لیکن کچھ کہا نہیں تھا ہم تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ پچھلی طرف کی سڑک ہم سے خاصے فاصلے پر تھی ہم نے تیزی سے وہاں پہنچنے کے لیے دوڑ لگا دی۔ ایک گرین کلر کی بس اسی روز پر چلی آ رہی تھی میں جافری کے ساتھ دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا میں نے عقب کے شیشے سے دیکھا ان تینوں نے ہمیں بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا چند ہی لمحوں بعد ان کی سلور کلر کی کار ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔ میں موقع کی تلاش میں تھا کہ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر راستے میں جافری کے ساتھ اتر جاؤں اور کسی نہ کسی طرح اسے بہ حفاظت اپنے گھر تک لے جاؤں' پھر میں نے بس میں سے دیکھا اگلا اسٹاپ جہاں تھا وہاں ایک ہوٹل اور کچھ رہائشی مکانات بنے ہوئے تھے میں نے اندازہ لگایا کہ ہوٹل تک پہنچنے کے لیے ہمیں بس سے اتر کر ایک راستے سے گزرنا ہوگا جس کے دونوں اطراف میں دکانیں کھلی ہوئی تھیں' اسٹاپ پر دس کے قریب افراد کھڑے تھے ہم ان کی اوٹ میں اتر کر بھاگ سکتے تھے میں نے منصوبے سے جافری کو آگاہ کیا' سلور کار ہم سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔

جافری نے میری ہدایت کے مطابق بس سے اتر کر درمیانی راستے سے ہوٹل کی طرف دوڑ لگا دی تھی سیاہ بیگ اب بھی اس کے سینے سے لگا ہوا تھا پھر وہ ہوٹل میں داخل

ہوگیا تھا لیکن غلطی سے پچھلے دروازے سے باہر نکلنے کے بجائے لفٹ میں سوار ہوگیا تھا جو اوپر جارہی تھی میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تاکہ اگر ان تینوں پیچھا کرنے والوں میں سے کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو میں مزاحمت کرسکوں میں بھی اس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہوگیا تھا۔

''گڈ.....تم ٹھیک جارہے ہو۔'' میں نے جافری کی ہمت بندھائی۔

''مجھے بیک ڈور نظر نہیں آیا' میں جلدی میں لفٹ میں سوار ہوگیا۔'' اس نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا میں نے دیکھ لیا تھا کہ دوسری لفٹ میں تعاقب کرنے والوں میں سے ایک شخص اوپر آرہا تھا اور دوسرا نیچے ہی موجود تھا میں نے اپنی لفٹ کا گراؤنڈ فلور پر جانے والا بٹن دبادیا تھا اور جافری سے مخاطب ہوا تھا' لفٹ واپس نیچے جانے لگی تھی۔

''سنو' گھبرانا نہیں جب لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکے گی تو ہمیں اسی راستی سے واپس جانا ہے جس سے ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اور واپس اس سڑک تک جانا ہے جہاں بس سے اترے تھے۔''

''اور اگر نیچے ان کا ساتھی موجود ہو؟'' جافری نے پوچھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا لفٹ رک گئی اور اس کا دروازہ کھل گیا تعاقب کرنے والوں میں سے ایک شخص تیزی سے لفٹ میں داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا اس نے ماہرانہ انداز میں جافری پر وار کیا تھا' جافری نے جھک کر خود کو بچایا تھا اور میں نے ایک زوردار گھونسہ اس کی کمر میں گردے کی جگہ مارا تھا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا تھا دوسرا وار میں نے اچھل کر اس کے پھیپھڑوں کی جگہ پر کیا تھا اور اپنی کہنی عین درمیان میں گھمادی تھی اس کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں اس وار کے نتیجے میں حریف چند منٹوں کے لیے اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کی تلاشی لی تھی اس کی جیب سے 10mm کا پستول نکلا تھا جو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا' اس کا چاقو بھی میں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا ان چیزوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ تعاقب کرنے والے پروفیشنل کلرز تھے اس کی جیب سے اس کا پاسپورٹ ملا جو یوکرائن' کا تھا اور اس کا نام والڈمیر تھا یعنی اس کا تعلق روس سے تھا میں جافری کے ساتھ لفٹ سے باہر آیا تھا اور ہوٹل کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے تھے ان میں سے ایک نیچے انتظار کررہا تھا۔'' میں نے جافری سے کہا۔

''تم ایک اچھے فائٹر ہو' تم نے کتنی مہارت سے اسے بے ہوش کردیا۔'' جافری نے میری تعریف کی۔

''تمہیں پتہ ہے یہ روسی تمہارا تعاقب کیوں کررہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا اور اسی وقت میری نظر سلور کلر کی کار پر پڑی جو سڑک پر ایک جانب کھڑی تھی اس میں بیٹھا تیسرا شخص مجھے دیکھ کر کار سے نکلنے لگا لیکن میں نے اسے مہلت نہیں دی اور کھلا ہوا دروازہ تیزی سے اس پر ہی دے مارا جو اس نے کار سے نکلنے کے لیے کھولا تھا اس کا ایک ہاتھ اور آدھا دھڑ دروازے اور کار کے بیچ میں سختی سے دب گیا تھا اور اس کی چیخ نکل گئی تھی پھر میں نے اپنی جیب سے اس کے ساتھی کا پستول نکال کر اس کا بٹ اس کی کنپٹی پر مارا تھا اور وہ ایک طرف لڑھک گیا تھا پھر میں نے تیزی سے ان کی کار کی چابی نکال لی تھی اور جافری کو لے کر ایک قریب کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا تھا جسے میں نے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتایا تھا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا جافری کے ہاتھ میں اس کا بیگ تھا جسے اب بھی اس نے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی تھی۔

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ کاغذات۔''

''اچھا یہ بھی رکھ لو' میں نے چھینا ہوا پستول' اپنا پاسپورٹ' K106 اور شناختی کارڈ اسے دے دیا تھا جسے اس نے بیگ میں رکھ لیا تھا اپنی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی رکوائی تھی اور جافری کے ساتھ اتر گیا تھا۔ ٹیکسی واپس چلی گئی تو میں جافری کے ساتھ اپنے گھر کیطرف بڑھا پھر اسے اندر لے جانے سے پہلے میں نے اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا اور اندر جا کر اچھی طرح گھر کی بھی تلاشی لی تھی پھر تمام دروازے اندر سے لاک

کر لیے تھے' ہم اب محفوظ تھے۔

''تم کچھ کھاؤ گے؟'' میں نے جافری سے پوچھا۔

''ایک کپ چائے۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے فرج سے کچھ سینڈوچ نکالے تھے اور چائے بنا کر اس کے ساتھ شیئر کی تھی' ہم دونوں کو صورتحال کا اچھی طرح اندازہ تھا میرے لیے ایک قتل کرنے والے سے بچانے والا بننا حیرت کا باعث نہیں تھا میری حیثیت بدل چکی تھی۔ اب واقعی اس صورت حال میں میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ انہوں نے ایک ریٹائرڈ فوجی کا انتخاب کیوں کیا تھا یہاں واقعی میرے جیسے ٹرینڈ فوجی کی ضرورت تھی اور مجھے جس چیز کی ضرورت تھی وہ انفارمیشن تھی کہ میں جانسکوں کہ میرا مقابلہ کن لوگوں سے ہے اور مجھے ان کا سامنا کس طرح کرنا ہے جس کے لیے مجھے ایک پلان بنانے کی ضرورت تھی لیکن پہلے مجھے انفارمیشن چاہیے تھی۔

''تم جو کچھ بھی جانتے ہو مجھے بتاؤ۔'' میں نے جافری سے کہا۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ تین دن پہلے جب میں آکسفورڈ میں تھا تو میری زندگی خطرے میں تھی جب میرے سے گورنمنٹ کا ایک آدمی ملنے آیا اور مجھے وارننگ دی تب میں یہاں بھاگ آیا تھا۔''

''گورنمنٹ کا آدمی.....؟ کون .....؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے اپنا نام میری ویدر بتایا تھا۔'' جافری نے کہا۔

''اس نے تمہیں جو کچھ بتایا تم نے اس پر کیوں یقین کر لیا؟''

''میں نہیں جانتا لیکن اس کے بات کرنے کا انداز ہی ایسا تھا۔''

''تم کیا کرتے ہو' تمہارا پیشہ کیا ہے؟''

''میں آکسفورڈ میں ایک پبلشر کے لیے کام کرتا ہوں وہ ایجوکیشنل اور اکیڈمک کتابیں چھاپتا ہے جن میں زیادہ تر معاشیات یا مالیات کے بارے میں ہوتی ہیں۔''

''تم ان کے لیے کیا کام کرتے ہو؟''

''میں پروف ریڈر ہوں۔''

''گویا تم سارا دن معاشیات کی کتابیں پڑھتے ہو اور چیک کرتے ہو کہ ان میں کوئی غلطی تو نہیں؟''

''ہاں' ایسا ہی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔'' جافری نے کہا۔

''پھر یہ تین روسی تمہیں مارنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے یہی وہ خطرہ ہے جس سے میری ویدر نے مجھے خبردار کیا تھا۔''

''ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا اور پھر میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا۔ ''تم چیرلوٹ کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں اسے نہیں جانتا..... میں اس سے کبھی ملا بھی نہیں اس نے کل شام میرے فون پر کال کی تھی اور خود کو میری ویدر کی ساتھی بتایا تھا اس نے بتایا تھا کہ لندن سے ایک شخص مجھے قتل کرنے یہاں آ رہا ہے' اس نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات دی تھیں اور مجھے کہا تھا کہ میں تم سے Take afood ریستوران میں مل سکتا ہوں' تم مجھے وہاں بیٹھے ملو گے' اس نے کہا تھا کہ میں تم سے اپنے آپ کو متعارف کراؤں اور بتاؤں کہ دراصل تمہیں مجھے قتل کرنے نہیں بھیجا گیا بلکہ تم چیرلوٹ سے فون پر بات کرلو ایک سادا فون پر جو pay phone ہی ہو سکتا ہے جس کی کال کا کوئی ریکارڈ نہ ہو اس نے خاص طور سے ہدیت کی تھی کہ تم K106 استعمال نہ کروں کیونکہ اس کی کال ہر جگہ ٹریس کی جا سکتی ہے۔'' جافری نے کہا اور مجھے احساس ہوا کہ جافری نے بھی مجھے ریستوران میں K106 استعمال کرتے دیکھ لیا تھا اور وہیں وہ تینوں روسی بھی ہم سے ٹکرائے تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ انہیں ہماری پوزیشن پتہ لگ گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے K106 کی وجہ سے انہیں ہماری پوزیشن پتہ لگی۔'' میں نے جافری سے کہا اور اس نے اپنے بیگ سے k106 نکالا۔

''ہاں' جب تم اسے استعمال کرتے ہو تو اس سے نکلنے والا ایک سگنل تمہاری درست پوزیشن بتاتا ہے کہ تم کہاں موجود ہو۔'' جافری نے کہا۔

''پھر ہمیں تو اسے سوئچ آف رکھنا چاہیے اور استعمال نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور جافری نے فوراً اس کو آف کر کے واپس بیگ میں رکھ دیا۔

''چیرلوٹ نے تمہارے فون پر تمہیں کال کی وہ محفوظ کیسے تھی؟''

''میرا فون ایک عام فون ہے' میں فون کرتا ہوں تو کال کی پے منٹ ہوتی ہے اس کا نمبر رجسٹرڈ نہیں ہے جس کی وجہ سے اسے ٹریس کرنا ناممکن ہے۔'' جافری نے کہا اور میں سوچنے لگا کہ یہی وجہ تھی کہ چیرلوٹ نے مجھ سے اپنا ذاتی فون ساتھ رکھنے کے لیے کہا تھا گویا وہ اس بات سے واقف تھی کہ ہماری کالز ٹریس کی جاسکتی ہیں اور جب سے وہ روسی ہمارا تعاقب کررہے تھے وہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔

''اب تم کیا کروگے؟'' جافری نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم نے مجھے نہیں بتائی ہے؟'' میں نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میرا خیال نہیں کہ کوئی ایسی بات ہو۔''

''اچھا میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جارہا ہوں اور pay phone سے چیرلوٹ سے بات کروں گا تم یہاں اندر ہی رہنا میں دس منٹ میں آجاؤں گا کوشش کرنا کہ کھڑکیوں یا کھلی ہوئی جگہ کے قریب نہ جاؤ تمہیں کوئی باہر سے نہ دیکھے۔'' میں نے جافری سے کہا پھر اس کے بیگ سے پستول نکال کر میں نے اسے دیا تھا جو میں نے روسی سے چھینا تھا۔

''اگر کوئی آئے تو بلاجھجک فائر کردینا۔'' میں نے کہا پھر جافری کے بیگ سے اپنے سارے کاغذات نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے تھے اور اپنا پرس بھی' اس بار میں نے چاقو بھی اپنے پاس رکھا تھا مجھے خطرے کی بوُ محسوس ہورہی تھی اور مجھے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑسکتی تھی۔

گھر سے باہر جانے کے بعد میں کچھ فاصلے پر واقع بازار کی طرف نکل گیا وہاں سے ساحل صاف نظر آرہا تھا۔ میں ناریل کے درختوں سے گزرتا ہوا ساحل کی طرف چلا گیا اور کھلے آسمان کے نیچے pay phone سے چیرلوٹ کا نمبر ملایا۔

''کیا ہوا؟ کیا جافری زندہ ہے؟' دوسری طرف سے پریشانی میں ڈوبی چیرلوٹ کی آواز سنائی دی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں کال کررہا ہوں؟''

''میرا فون بتارہا ہے کہ کال کہاں سے آرہی ہے..... کیا جافری ٹھیک ہے؟'' چیرلوٹ نے پھر پوچھا۔

''ہاں وہ زندہ ہے اور ٹھیک ہے میں اسے ابھی اپنی رہائش گاہ پر چھوڑ کر آیا ہوں اور اسے ایک لوڈیڈ ستول بھی دے کر آیا ہوں میں زیادہ دور نہیں ہوں اور تم سے pay phone پر بات کررہا ہوں۔''

''پستول..... کیسی پستول؟'' چیرلوٹ نے پوچھا۔

''اب اسائنمنٹ تبدیل ہوچکا ہے۔'' اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''اب تمہیں جافری کو مارنا نہیں بچانا ہے کسی بھی قیمت پر۔''

''کسی بھی قیمت پر کیا مطلب؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''تم جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے تمہیں اس کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑے کرو۔''

''چاہے مجھے لوگوں کو مارنا پڑے؟''

''ہاں اگر مارنا مجبوری ہو تو تم کرسکتے ہو۔''

''مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی ایک طرف تو تم اس کو مارنے کے لیے مجھے بھیجتی ہو اور دوسری طرف اسے ہر قیمت پر بچانے کی درخواست کرتی ہو؟''

''چیزیں تبدیل ہوگئی ہیں حالات تیزی سے رخ بدل رہے ہیں۔''

''یہ کوئی جواب نہ ہوا'' میں نے کہا لیکن اس نے میری بات کو نظرانداز کردیا۔

''تمہیں مجھے دوبارہ فون کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمارا واسطہ تین ایسے افراد سے پڑگیا تھا جو نہیں چاہتے تھے کہ جافری اپنا اگلا برتھ ڈے منائے ویسے اس کی سالگرہ کب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا تھا؟'' چیرلوٹ نے پھر میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

''جیسا کہ تمہارا شک تھا وہ قریب ہی موجود تھے اور میری سیٹلائٹ فون کال سے انہیں میری پوزیشن کا پتہ چل گیا تھا' اب میں نے اسے سوئچ آف کردیا ہے اور وہ جافری کے پاس ہے تمہاری کال کٹتے ہی وہ ہم تک پہنچ گئے تھے وہ تین تھے اور روسی پروفیشنلز تھے میں نے دو کو

جالیا تھا۔"
"کیا انہیں مار دیا؟" چیرلوٹ نے پوچھا۔
"نہیں میں نے انہیں بے ہوش کر دیا تھا تب مجھے پتہ نہیں تھا کہ اگر میں چاہوں تو انہیں مار بھی سکتا ہوں کیونکہ مجھے ہر قیمت پر جافری کو بچانا ہے۔"
"ان کے بارے میں اور کوئی تفصیل؟"
"پہلے کا نام والڈ یسمر تھا اور دوسرے کا فر......؟ دونوں کے پاسپورٹ یوکرائن کے تھے ان کے پاس پستولیں اور چاقو تھے اور وہ جافری کا تعاقب کر رہے تھے میرا نہیں انہیں صرف اور صرف جافری کی تلاش تھی۔"
"وہ اب کہاں ہیں؟"
"میں انہیں دھوکا دے کر آ گیا تھا لیکن میرا خیال ہے انہیں ہم تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ کیا تم جانتی تھیں کہ وہ لوگ جافری کو ڈھونڈ رہے ہیں؟"
'ہاں میں جانتی تھی۔' اس بار چیرلوٹ نے صحیح جواب دیا تھا۔
"آخر روسی جافری کو کیوں مارنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"اگر تم ان لوگوں کو دوبارہ دیکھو تو یہ بات ان سے پوچھ لینا۔" مجھے چیرلوٹ کے جواب پر کھسیانی ہنسی آئی تھی۔
"چیرلوٹ یہ کوئی جواب نہ ہوا۔"
"سنو جافری کو زندہ رکھنا بہت ضروری ہے اور تم......"
"تم نے مجھے غلط ایڈریس کیوں دیا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔
"میں تمہیں بتاتی ہوں شاید اس سے تمہیں کوئی مدد مل سکے۔"
"ہاں بتاؤ۔"
"تمہیں ایک غلط ایڈریس دیا گیا تا کہ تم جافری کو نہ مار سکو ہم یہی چاہتے ہیں۔"
"میں سمجھ گیا...... دیکھو چیرلوٹ اگر تم چاہتی تھیں کہ میں جافری کو نہ ماروں تو مجھے بتا سکتی تھیں اگر کوئی اور بات ہے تو مجھے ابھی بتا دو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھے اندھیرے میں رکھو اور اس کی وجہ سے میں جافری کو نہ بچا سکوں اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہو گا کہ تمہارے لیے کیا زیادہ ضروری ہے تمہارا راز یا جافری کی زندگی۔" میری اس بات پر چیرلوٹ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔
"تم جانتے ہو جو رقم تمہیں دی گئی ہے وہ اسے مارنے کے لیے تھی اب اگر تم اسے زندہ رکھ سکو گے تو ہم یہ رقم دوگنی کر دیں گے۔"
"تم بار بار 'ہم' کا استعمال کر رہی ہو کیا تمہارا مطلب ہے تم، ونچسٹر اور بریڈشا؟"
"نہیں میرا مطلب ہے......"
"اور تمہارا مطلب ہے میری ویدر؟ یہ میری ویدر کون ہے چیرلوٹ؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
"وہ میرا باس تھا اور جب میں 'ہم' کہتی ہوں تو اس کا مطلب میں اور میری ویدر ہوتے ہیں۔"
"تم کس کے لیے کام کرتی ہو؟"
"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں ایک سول سرونٹ ہوں۔"
"نہیں ایسا نہیں ہے تم ایک سول سرونٹ سے زیادہ کچھ ہو۔" میں نے جواب دیا میری بات پر وہ خاموش رہی تھی میں نے اس سے بحث نہیں کی تھی اب جافری کی جان بچانا میرے لیے چیلنج بن گیا تھا اور پھر چیرلوٹ نے میری رقم ڈبل کرنے کے لیے بھی کہا تھا چنانچہ اس کام میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔
"ہم نے تمہیں 116 لوگوں میں سے منتخب کیا ہے ہم نے ایک لسٹ بنائی تھی کہ ہمیں کن خصوصیات کے حامل افراد چاہئیں اور کمپیوٹر سے Data چیک ہونے کے بعد تمہارا نام سرفہرست آیا۔"
چیرلوٹ سے بات کرنے کے دوران میں نے سڑک پر اور بازار پر نظر رکھی تھی میں نے اپنے کپڑے بھی تبدیل کیے تھے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی لگایا ہوا تھا مجھے امید تھی کہ تعاقب کرنے والے اگر ادھر آئے تو مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔
"تم نے مجھے بوسہ کیوں دیا تھا؟" میں نے چیرلٹ سے پوچھا۔
"تم مجھے اچھے لگے تھے اور بس۔" اس نے ایک وقفے کے بعد جواب دیا۔
"تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تم مجھے ایک خطرناک مشن

پر بھیج رہی تھی جہاں میں موت کے منہ میں بھی جا سکتا تھا۔''

''نہیں' میں صرف اور صرف جافری کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے اگر وہ تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہے تو وہ اس وقت زندہ ہے وہ میری رہائش گاہ پر ہے اس کے ہاتھ میں ایک بھری ہوئی گن ہے اور وہ میرا انتظار کر رہا ہے تم یہاں کی لوکل پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کرتیں؟ میں انہیں زندہ جافری حوالے کرتا ہوں اور وہ باحفاظت اسے تم تک پہنچا دیں گے۔'' میں نے کہا چیرلوٹ پھر خاموش ہوگئی تھی میرے پاس زیادہ رقم نہیں تھی میں لمبی کال نہیں کر سکتا تھا' میں نے ایک بار پھر بازار کی طرف نظر دوڑائی مجھے وہ روسی اب بھی نظر آ رہا تھا وہ سڑک پر اور کاروں میں جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا تھا اس وقت وہ مجھ سے سو گز کے فاصلے پر موجود تھا' وہ والڈ میئر تھا وہ پیدل ہی تھا کیونکہ ان کی کار کی چابی میرے پاس تھی۔

''کیا میرے استعمال کے لیے جافری کا فون محفوظ رہے گا؟' میں نے چیرلوٹ سے پوچھا۔

''ہاں..... محفوظ رہے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں تمہیں پھر کال کروں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پھر میں آہستہ آہستہ چلتا ناریل کے درختوں کی اوٹ لیتا ہوا اور خود کو والڈ میئر کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگا' میں درختوں کی اوٹ سے والڈ میئر کو بھی دیکھتا جا رہا تھا' مجھے اس کے باقی دو ساتھی نظر نہیں آ رہے تھے پھر جیسے ہی میں اس جگہ سے دور نکلا تھا میں نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور گھر میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔

''جافری..... جافری.....'' میں نے اسے کئی بار پکارا لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا پھر میں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا لیکن جافری وہاں نہیں تھا۔

چیرلوٹ کے الفاظ میرے ذہن میں ابھی تک گونج رہے تھے۔

''سنو' جافری کو زندہ رکھنا بہت ضروری ہے تمہیں جو بھی کرنا پڑے کرو۔''

میں نے دوبارہ پورے گھر کی تلاشی لی وہ وہاں نہیں تھا میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا اگر کوئی میری غیر موجودگی میں وہاں آیا تھا تو وہ اسے مار کر جا سکتا تھا ایسی صورت میں جافری کو مردہ حالت میں وہاں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں تھا پھر میں نے سوچا ممکن ہے انہیں اس سے کچھ معلومات یا کوئی اہم چیز حاصل کرنا ہو اور وہ اسے زندہ اغوا کر کے لے گئے ہوں یا پھر وہ خود ہی یہاں سے چلا گیا ہو لیکن اس کے ایسا کرنے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی میں ایک بار پھر باہر چلا گیا اور وہاں دور دور تک نظریں دوڑا کر جافری کو تلاش کرنے لگا لیکن وہ کہیں نہیں تھا مجھے ساحل کے پاس والڈ میئر پھر نظر آیا وہ کسی کو ڈھونڈ رہا تھا یقیناً وہ بھی جافری کو ڈھونڈ رہا تھا اگر اس کو وہ مل گیا ہوتا تو وہ اسے لے کر یہاں سے جا چکا ہوتا' میں ایک بار پھر گھر میں واپس آ گیا اور ایک بار پھر گھر کی تلاشی لی کہ شاید میرے ہاتھ کوئی ایسی نشانی لگ جائے جس سے مجھے اندازہ ہو سکے کہ جافری کے ساتھ کیا ہوا میں نے نوٹ کیا اس کا بیگ بھی گھر میں موجود نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ K106 اور ریوالور بھی اس کے پاس موجود تھا میں پھر گھر لاک کر کے بازار کی طرف گیا مجھے ہر حالت میں چیرلوٹ کو نئی صورت حال سے آگاہ کرنا تھا اور میں اپنے ذاتی فون کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا' میں نے ایک بار پھر کال فون سے چیرلوٹ سے رابطہ کیا۔

''تم نے کال کیوں کاٹ دی تھی؟'' چیرلوٹ نے مجھ سے پوچھا۔

''جافری غائب ہے۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جب گھر واپس پہنچا تو وہ ہاں نہیں تھا۔'' دوسری طرف خاموشی تھی میں نے پھر بات آگے بڑھائی۔

''میرا خیال ہے اسے اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود گیا ہے..... کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''نہیں' میں نہیں جانتی۔'' چیرلوٹ نے کہا۔

''تم اسے اس کے فون پر کال کرو دیکھو وہ جواب دیتا ہے یا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں..... ٹھیک ہے۔'' چیرلوٹ نے جواب دیا۔

''تم اسی کال فون پر مجھے جواب دینا۔'' میں نے کہا اور کال فون کا نمبر اسے لکھوا دیا۔

''ٹھیک ہے میں جافری کو فون کرنے کے بعد تمہیں کرتی ہوں۔'' چیرلوٹ نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں وہیں اس کے دوبارہ فون کرنے کا انتظار کرتا رہا تھا اور اردگرد پر بھی نظر رکھی ہوئی تھی پھر کچھ دیر بعد اس کا فون آیا تھا۔

''وہ آج کل جہاں ٹھہرا ہوا ہے اسی اپارٹمنٹ میں واپس گیا ہے وہ اپارٹمنٹ اس کے کسی دوست کے والدین کا ہے۔'' چیرلوٹ نے بتایا۔

''کیوں؟ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہے اسے تین روسی تلاش کر رہے ہیں اور وہ خطرے میں ہے اور ایسی صورت حال میں وہ خود اکیلا نکل پڑا ہے؟''

''اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز وہاں بھول گیا تھا اسے ہی لینے گیا ہے۔''

''اس نے میری واپسی کا انتظار کیوں نہیں کیا؟''

''اس کا خیال تھا کہ تم اسے ایسا نہیں کرنے دو گے وہ کہہ رہا تھا کہ تم بہت سخت گیر ہو اس نے تمہاری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھایا کیونکہ شاید تم اسے ایسا نہ کرنے دیتے اور پھر اسے ایسا موقع کبھی نہ ملتا۔''

''ایسی بھی کیا اہم چیز ہو سکتی ہے جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا؟''

''میں نہیں جانتی'' چیرلوٹ نے کہا لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں تھا' میرا خیال تھا کہ وہ اس کے بارے میں جانتی ہے میں نے سوچا کہ اگر میں صحیح وقت پر جافری تک پہنچ گیا اور وہ زندہ ہوا تو میں اس بارے میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔

''کیا تم ٹینی رف پولیس سے رابطہ کرو گی؟ میں بھی جانتا ہوں کہ مقامی پولیس اسٹیشن کہاں ہے میں اسے بہ حفاظت ان تک پہنچا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ صورت حال خطرناک ہے جتنی جلدی ہو تم جافری تک پہنچو اور اسے زندہ رکھنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو کیا تم میرے لیے یہ کر سکتے ہو؟'' چیرلوٹ نے کہا۔

''مجھے اس کا ایڈریس دو اور راستہ سمجھاؤ میں کوشش کروں گا کہ کسی اور کے اس تک پہنچنے سے پہلے خود اس تک پہنچ جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے لیے میں تمہاری مشکور ہوں اس کا اپارٹمنٹ تم سے زیادہ دور نہیں ہے وہ ایک کمپلیکس میں واقع ہے اور صرف پانچ منٹ کی واک پر موجود ہے۔'' چیرلوٹ نے کہا پھر اس نے مجھے راستہ سمجھایا تھا جسے میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

''ٹھیک ہے جیسے ہی کوئی نئی پیش رفت ہوئی میں تمہیں کال کروں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا اور پھر چیرلوٹ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک کمپلیکس کے سامنے موجود تھا میں حیران تھا کہ چیرلوٹ اور اس کے باس میری ویدر کے لیے جافری اتنی اہمیت کیوں رکھتا تھا اور چیرلوٹ اور اس کا باس کس کے لیے کام کر رہے تھے میرے ان سوالوں کا جواب چیرلوٹ نے نہیں دیا تھا۔

میں مطلوبہ اپارٹمنٹ تک پہنچا اور اس کی بیل بجائی لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا میں نے ایک بار پھر بیل بجائی لیکن اس بار بھی جواب نہیں ملا' میں کسی کی توجہ حاصل کیے بغیر اپارٹمنٹ میں داخل ہونا چاہتا تھا مجھے ابھی تک اندازہ نہیں تھا کہ جافری اندر موجود ہے یا نہیں' میں چکر کاٹ کر کمپلیکس کی پشت پر پہنچ گیا میں نے اندازہ لگایا کہ جافری کے اپارٹمنٹ کی بالکونی کون سی ہو سکتی تھی اس کے دروازے کھلے ہوئے تھے چنانچہ میں نے چڑھ کر اوپر پہنچنے کا منصوبہ بنایا۔

مجھے اس بالکونی میں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی میں نے دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا لیکن وہاں مکمل خاموشی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اندر کوئی موجود نہ ہو میں چند قدم آگے بڑھا سامنے ایک کمرہ تھا جس میں ایک میز کے گرد چار کرسیاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پر جافری بیٹھا تھا۔ وہ جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا میں اور آگے بڑھا وہ اب بھی میری موجودگی سے بے خبر تھا میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ریوالور سے دروازے پر چوٹ ماری اور جافری نے چونک کر اس طرف دیکھا پھر مجھے وہاں پا کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

''تم یہاں کیسے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میں کسی بھی وقت کہیں بھی پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' جافری حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی بالکنی کی

طرف دیکھ رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس راستے سے بھی اندر آ سکتا تھا اور مجھے اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں کیسے پتہ چل گیا تھا پھر وہ بالکنی کی طرف بڑھا تھا اور جھانک کر اندازہ لگانے لگا تھا کہ میں کس طرح اوپر چڑھا ہوں گا میں نے اسے پکڑ کر تیزی سے پیچھے کھینچا تھا۔

''کیا تم واقعی مرنا چاہتے ہو پہلے تو تم اکیلے چل کر یہاں آئے اور اب یہاں سے باہر جھانک رہے ہو آخر کیا چاہتے ہو؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''سوری۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''وہ تینوں روسی یہاں تفریح کرنے نہیں آئے ہیں وہ موقع ملتے ہی تمہیں مار ڈالیں گے۔''

''سوری۔'' جافری نے پھر کہا۔

''تم نے دروازے کی گھنٹی بجنے پر دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ میں نے دو بار گھنٹی بجائی تھی۔''

''میں نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی تھی۔'' جافری نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں سنی؟''

''میں کام کر رہا تھا۔'' اس نے کہا اور میں نے میز پر رکھے کاغذات اور قلم کی طرف دیکھا۔

''کیا تم اس کے لیے ہی یہاں واپس آئے ہو؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ میں ان کاغذات کو دیکھوں اس نے سارے کاغذات جمع کر کے اپنے بیگ میں ڈال لیے۔

''یہ کیا ہے؟ تم کیا لکھ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

پھر اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مجھے جافری کے چہرے کی حیرت کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ اسے کسی کا انتظار نہیں تھا چنانچہ میں دروازے کی طرف بڑھا میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ روسی ہمارے تعاقب میں وہاں پہنچ گئے ہوں گے اور ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جافری کو زندہ رکھنے کے لیے میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کا بیرونی دروازہ گراؤنڈ فلور پر تھا اور ہم اس وقت دوسری منزل پر تھے۔ دروازے

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ماہنامہ آنچل کراچی

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

چاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تحریر جو آپ کی دل کی دنیا میں جل تھل کر دے

معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا فاخرہ گل کا ناول جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کر دے گا

خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقرا صغیر کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کر دے

AANCHALNOVEL.COM

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (021-35620771/2)

کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

''اب ہم کیا کریں؟'' جافری نے پریشانی سے پوچھا۔

''چیک کرلو تمہیں جو کچھ چاہیے تھا تم نے سب لے لیا ہے؟ ہم اب یہاں واپس نہیں آئیں گے۔'' میں نے کہا اور جافری نے اپنا بیگ اٹھا کر فوراً اپنے کاندھے پر لٹکا لیا۔

''میں نے تمہیں جو ریوالور دیا تھا وہ تمہارے پاس ہے؟'' میں نے جافری سے پوچھا تو اس نے ریوالور میری طرف بڑھا دیا میں نے اسے چیک کیا وہ فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

''اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا خوفزدہ مت ہونا' بس فائر کرتے چلے جانا اور ایک بات ذہن میں رکھنا میرے قریب رہنے کی کوشش کرنا۔'' میں نے کہا تو جافری نے اثبات میں سر ہلایا۔

اب کوئی زور زور سے دروازے کو دھکے مار رہا تھا۔

وہ چند لمحوں ہی میں اندر داخل ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہیں رہنا اور اگر کوئی اندر داخل ہو اور تمہیں مارنے کی کوشش کرے تو بلا تاخیر فائر کر دینا دیکھو مجھ پر فائر نہ کر دینا اوسان درست رکھنا۔'' میں نے کہا اور کمرے سے نکل کر راہداری میں چلا گیا دروازے پر اب بھی دھکے مارے جا رہے تھے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا جہاں دو بند دروازے تھے پھر مجھے ایک دروازے کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور یوں محسوس ہوا کہ دو آدمی اندر داخل ہوئے ہوں وہ بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے شاید سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے وہ گراؤنڈ فلور کو چیک کر رہے تھے' میں ان کے اوپر آنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ انہیں نشانہ بنا سکوں پھر مجھے ایک شخص کی آواز سنائی دی۔

''ممکن ہے وہ یہاں نہ ہو؟'' یہ الفاظ جس لہجے میں ادا کیے گئے وہ روسی نہیں تھے اس بات نے مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے روک دیا۔ مجھے حیرت تھی بولنے والا برطانوی تھا میں نے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

''میں تمسلح باڈی گارڈ ہوں اپنی شناخت کراؤ اور یہاں آنے کی وجہ بتاؤ۔'' میری آواز پر دونوں رک گئے تھے اب خاموشی تھی۔

''ہم ٹریڈ ویل اور بینس ہیں ہمارا تعلق برطانوی سفارت خانے سے ہے ہم جافری بٹن کی تلاش میں ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''یہاں آنے کی وجہ بتاؤ۔'' میں نے کڑک کر کہا۔

''ہم اسے باحفاظت سفارت خانے لے جانے آئے ہیں۔'' اسی آواز نے جواب دیا۔

''کیا تم مسلح ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں؟''

''تمہارے پاس تمہاری شناخت کے کاغذات ہیں؟''

''ہاں ہیں۔'' جواب دیا گیا اور میں سوچنے لگا کہ میں ان پر یقین کروں یا نہ کروں۔

''کیا تم وہاں موجود ہو؟'' اس بار مجھ سے پوچھا گیا۔

''تم کس کے کہنے پر یہاں آئے ہو؟'' میں نے ان کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''قونصلیٹ جنرل جرمی ڈیون پورٹ کے کہنے پر۔''

''سامنے آؤ اور اپنی شناخت کراؤ اپنے شناختی کارڈ اونچے کر کے پکڑنا تاکہ میں بالکنی سے انہیں دیکھ سکوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا یہ ضروری ہے؟'' پوچھا گیا۔

''جیسا کہا ہے ویسا کرو۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا اور مجھے ان دونوں کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی میں تیزی سے اوپر جافری کے پاس پہنچ گیا میں سمجھ گیا تھا کہ آنے والے کوئی چال چلیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی شناخت نہیں کروائی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' جافری نے فکرمندی سے پوچھا۔

''تم اپنا ریوالور لے کر صوفے کے پیچھے چھپ جاؤ۔'' میں نے تیزی سے کہا اور خود کمرے کے دروازے کے پیچھے یوں کھڑا ہو گیا کہ دروازے کھلے تو میں اس کی آڑ میں ہوں اور آنے والے مجھے نہ دیکھ سکیں یوں میں اسے آسانی سے قابو کر سکتا تھا پھر ایسا ہی ہوا تھا پہلے آنے والے کو میں نے ایک ہی وار میں زیر کر لیا تھا وہ لڑکھڑا کر ایک سمت گرا تھا میں نے اپنی ریوالور کا بٹ اس کی کنپٹی پر زور سے مارا تھا جس سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے کے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی تھی۔

''بوب..... بوب.....'' شاید وہ دوسرا ساتھی اپنے ساتھی کو آواز دے رہا تھا پھر آہستہ سے دروازہ کھلا تھا اور دوسرا شخص اندر داخل ہوا تھا وہ ابھی آدھے راستے ہی میں تھا کہ میں نے دروازہ زور سے اس کے منہ پر دے مارا تھا اور پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے دروازہ کھول کر اسے زمین پر گرا لیا تھا اور خود اس پر چڑھ گیا تھا میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت اس کے گلے پر سخت ہوتی گئی تھی اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔

''کیا یہ مر گئے؟'' اس نے پوچھا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا میں ان دونوں کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔

مجھے ان کی جیبوں سے دو برطانوی پاسپورٹ ملے ایک رابرٹ ٹریڈویل کے نام کا تھا اور دوسرا اینڈریو بینس کے نام کا لیکن مجھے تو نصلیٹ کی کوئی شناخت نہیں ملی لیکن مجھے اس کے علاوہ ایک دلچسپ چیز ملی ان دونوں کے پاس سے K106 نکلے تھے۔

''تم فوراً اپنا حلیہ بدلو کوئی دوسرے کلر کی شرٹ پہن لو سر پر کوئی ہیٹ اور آنکھوں پر چشمہ لگا لو تاکہ تمہاری شناخت مشکل ہو جائے۔'' میں نے جافری سے کہا جو حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے جلد ہی میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔

''اب فوراً یہاں سے نکلو۔'' میں نے جافری سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا باہر آنے سے پہلے میں نے وہ تمام چیزیں جو دونوں برطانوی حملہ آوروں کے پاس سے نکلی تھیں جافری کے بیگ میں رکھوا دی تھیں میں جافری کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا واپس اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

''وہ کیسے کاغذات ہیں جنہیں لینے کے لیے تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے اپارٹمنٹ گئے۔'' میں نے جافری سے راستے میں پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں' یہ میرا مشغلہ ہے میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کتاب کس موضوع پر ہے؟''

''کچھ خاص نہیں بس..... مالیات' معاشیات اور دولت کے بارے میں۔'' جافری نے کہا۔

''دولت..... دولت تو بڑا دلچسپ موضوع ہے..... ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں..... کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔''

''دولت سے تو دنیا کی ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے لیکن محبت نہیں۔'' میں نے کہا میری بات کا جافری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس نے اپنا بیگ بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا میں جب سے اپارٹمنٹ سے نکلا تھا میرا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں ٹریڈ ویل اور بینس کے بارے میں سوچ رہا تھا کیا وہ واقعی جافری کو قتل کرنے آئے تھے یا وہ اسے باحفاظت قونصلیٹ لے جانا چاہتے تھے انہیں کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا میں چیرلوٹ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید وہ اس بارے میں مجھے کچھ بتا سکے۔ میں جافری کے ساتھ چلتا ہوا مارکیٹ میں آ گیا تھا اور ایک Sony کی شاپ میں چلا گیا تھا وہاں میں نے جافری کو ایسی جگہ کھڑا کیا تھا کہ اسے باہر سے آسانی سے نہ دیکھا جا سکے اور خود شاپ کیپر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''مجھے ایک pay phone چاہیے۔''

''ہاں' ایسا موبائل فون جسے فوراً استعمال کیا جا سکے جس میں کریڈٹ موجود ہو۔''

''اوہ..... ہاں ہاں میرے پاس ایسے موبائل ہیں۔''

''ٹھیک ہے پیسوں کی فکر مت کرو' مجھے مہنگے سے مہنگا موبائل دو لیکن اس کی کارکردگی اچھی ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا پھر اس نے مجھے ایک موبائل دیا تھا میں نے اسے چیک کیا تھا وہ مجھے پسند آیا تھا اور میں نے اس کی قیمت ادا کر دی تھی۔ اب میں آزادی سے چیرلوٹ سے جب چاہتا بات کر سکتا تھا اس کی کال کو ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا میں جافری کو لے کر بہت محتاط انداز سے اپنے رہائشی ٹھکانے تک آیا تھا' میں نے خیال رکھا تھا کہ ہم کسی کی نظر میں نہ آئیں لیکن جب میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر دروازے کو چابی سے کھولنے ہی والا تھا تو میرے دماغ میں ایک اور سوال ابھرا تھا۔ اگر روسی ایجنٹ میرے K106 کی کال ٹریس کر کے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں تو یقیناً ان کے لیے یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ اب تک میرا نام اور میری رہائش کے بارے میں بھی جان چکے ہوں اور اندر میرے منتظر ہوں'

اور انہیں امید ہو کہ میں جافری کو لے کر یہاں واپس آؤں گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے گھر میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا' میری نظریں تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی پیلے رنگ کی اس کار پر جمی تھیں جو روسی ایجنٹس کی تھی اور جس کی چابیاں میرے پاس تھیں وہ اسے کسی طرح اسٹارٹ کر کے یہاں تک لے آئے تھے۔

'کیا ہوا؟'' جافری نے پوچھا۔

''یہاں خطرہ ہے۔'' میں نے جواب دیا پھر اس سے پہلے کہ جافری کچھ بولتا..... پیلی کار میں سے ایک روسی نکلا تھا اور اس نے چاقو سے مجھ پر حملہ کیا تھا یہ فرنیس برنی تھا میں نے اس کے پاسپورٹ پر اس کا نام پڑھا تھا' جو مجھے یاد تھا میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا اپنی جیب میں موجود پیلی کار کی چابیاں جافر کی طرف اچھالیں' ''تم کار میں بیٹھو اور اسے اسٹارٹ کرو اور یہاں سے بھاگنے کے لیے تیار رہو۔'' اس نے میری بات پر عمل کیا تھا اور میں فرنیس سے بھڑ گیا تھا وہ بار بار مجھ پر چاقو سے حملہ کر رہا تھا اور میں اس سے بچ رہا تھا آخر ایک لمحے کے لیے میری گرفت اس کی کلائی پر ڈھیلی پڑی تھی اور اس نے تیزی سے مجھ پر پھر حملہ کیا تھا اس کا تیز دھار چاقو میرے دائیں پہلو کی شرٹ کو کاٹتا ہوا میری پسلیوں کو چھوتا دوسری طرف نکل گیا تھا' فرنیس بہت جوش میں تھا جافری نے کار اسٹارٹ کر لی تھی' میں نے ایک زوردار مکہ فرنیس کے جبڑے پر مارا تھا وہ لڑکھڑا کر گرا تھا اور میں دوڑ کر کار میں بیٹھ گیا تھا جافری نے تیزی سے کار آگے بڑھا دی تھی۔ اس عرصے میں دوسرا روسی گھر سے برآمد ہوا تھا اور اس نے کار کی سمت فائر کیا تھا کار کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور میں نے خود کو نیچے جھک کر بچایا تھا' پھر اس نے دوسرا فائر کیا تھا لیکن کار آگے بڑھ گئی تھی وہ کچھ دور کار کے پیچھے بھاگے تھے لیکن جافری نے اسپیڈ بڑھا دی تھی اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

''اوہ..... تمہارے جسم سے خون نکل رہا ہے۔'' اچانک جافری نے کہا میں نے دیکھا میری شرٹ خون سے تر تھی۔ میں نے شرٹ اٹھا کر دیکھی میری دائیں پسلی سے نیچے بڑا زخم لگا ہوا تھا جسے ٹانکے لگوانے کی ضرورت تھی۔

''زخم کیسا ہے؟'' جافری نے پوچھا۔

''زیادہ خطرناک نہیں۔'' میں نے کہا اور اپنی شرٹ اتار کر اسے بنڈیج کی طرح زخم کے گرد لپیٹ کر گرہ لگا دی ہم اس وقت ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے اور بندرگاہ کے قریب آ گئے تھے جگہ جگہ لانچیں کھڑی تھیں میں اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اپنے زخم کو ٹانکے لگواؤں اور پھر چیرلوٹ سے بات کروں ایک محفوظ جگہ دیکھ کر میں نے جافری سے کار روکنے کے لیے کہا تھا' کار روکنے کے بعد ہم اس میں ہی بیٹھے رہے تھے۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' جافری نے فکرمندی سے پوچھا میں ابھی اس کے سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر کورٹس سلور پر پڑی وہ نہانے کا مختصر لباس پہنے تھی اور اس کے کاندھے پر ایک بیگ لٹک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

''اوہ..... تم ساحل پر گھومنے آئے ہو۔'' اس نے مجھے دیکھ کر خوشی سے کہا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

''اوہ..... تم تو زخمی ہو۔'' اس کی نظریں میری خون آلود شرٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں میرے ساتھ کچھ حادثہ ہو گیا ہے میں فرسٹ ایڈ کٹ کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟ کیا ہمیں کہیں قریب سے کوئی فرسٹ ایڈ بکس مل سکتا ہے؟''

''کیا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟'' اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ میرے پاس لانچ میں ایک فرسٹ ایڈ کٹ ہے۔'' اس نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر مجھے اترنے میں مدد دی تھی۔ جافری بھی کار سے باہر آ گیا تھا اور وہ ہمیں اپنی لانچ میں لے گئی تھی' جو بہت خوبصورت تھی اور اس پر لانچ کا نام Dancing Brave لکھا ہوا تھا۔

''یہ میرا دوست ہے۔'' میں کورٹس سے جافری کا تعارف کروایا۔

''کیا یہ تمہاری بوٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ میرے والد کی ہے میں اسے کل کے لیے تیار

گرہی ہوں۔‘ اس نے جواب دیا اس نے ایک دراز سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا تھا اور اس کا جائزہ لے رہی تھی پھر اس نے مجھے ایک اسٹول پر بٹھا دیا تھا‘ میں نے زخم سے اپنی شرٹ کھولی تھی خون رک گیا تھا اس عرصے میں کورٹس گرم پانی لے آئی تھی‘ فرسٹ ایڈ بکس میں میری ضرورت کا سارا سامان موجود تھا میں نے گرم پانی سے اپنے ہاتھ دھوئے تھے اور اپنے زخم کو ٹانکے لگائے تھے کورٹس اور جافری حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”اگر چاہو تو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاسکتی ہوں۔“ کورٹس نے کہا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا پھر میں نے زخم پر پٹی لپیٹی تھی اور دو گولیاں درد کی کھائی تھیں اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب ہم واپس کار میں بھی نہیں جائیں گے اور آج رات میں کسی ہوٹل میں گزاروں گا جہاں سے چیرلوٹ کو فون بھی کروں گا پھر کورٹس کے روکنے کے باوجود میں جافری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا تھا راستے میں میں اپنے اطراف کا میں سختی سے جائزہ لے رہا تھا ہر ہر چیز پر میری نظر تھی‘ مجھے وہ تینوں روسی کہیں نظر نہیں آئے تھے پھر اچانک ہی جافری کے فون کی بیل ہوئی تھی۔

”چیرلوٹ کا فون ہے۔“ اس نے فون میری طرف بڑھایا۔

”سنو‘ فون بند مت کرنا‘ میری بات غور سے سنو۔“ دوسری طرف سے چیرلوٹ بول رہی تھی۔ ”ہمیں ایک اہم اطلاع ملی ہے چائنیز نے ایک پیشہ ور کلر کو ہانگ کانگ سے بھیجا ہے تاکہ وہ جافری کو قتل کردے‘ ہمیں صرف اتنا پتہ ہے کہ آنے والی ایک عورت ہے اور دو دن پہلے ہانگ کانگ سے روانہ ہوئی ہے وہ اب تک یہاں پہنچ چکی ہوگی اور وہ اپنے کام کی بہترین ماہر ہے۔“

”واؤ بہت خوب۔“ میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”پہلے تین روسی‘ پھر دو برطانوی ٹریڈ ویل اور بینس اور اب ایک چینی عورت مزید کس بات کی امید رکھی جائے؟“

”ٹریڈ ویل اور بینس؟ کیا مطلب“ ”چیرلوٹ نے پوچھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق برطانوی سفارت خانے سے ہے اور انہیں قونصلیٹ جنرل جری ڈیون پورٹ نے بھیجا ہے‘ وہ جافری کے لیے اس کے اپارٹمنٹ پر آئے تھے جہاں وہ میرے پاس سے جا کر چھپا ہوا تھا اور میں اسے لینے وہاں گیا تھا۔“ میں نے کہا میری بات کا جواب چیرلوٹ نے کچھ دیر بعد دیا تھا۔

”سفارت خانے میں جری ڈیون پورٹ تو ہے لیکن ٹریڈ ویل اور بینس کون ہیں؟ وہاں اس نام کا کوئی شخص نہیں ‘کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ؟“

”وہ برطانوی ہیں اور وہ جافری کو مارنے وہاں گئے تھے ان دونوں کے پاس K106 تھے۔ آخر معاملہ کیا ہے مجھے بتاؤ چیرلوٹ......“ میں نے کہا۔

”سنو کچھ بھی ہو تمہیں ہر حالت میں جافری کی حفاظت کرنا ہے اسے زندہ رکھنا ہے میں ٹریڈ ویل اور بینس کے بارے میں معلومات جمع کرتی ہوں پھر تمہیں بتاؤں گی۔“ چیرلوٹ نے کہا۔

”میں نے ایک pay phone خریدا ہے اس کا نمبر نوٹ کرلو تم اس نمبر پر مجھے کال کرسکتی ہو۔“ میں نے کہا اور چیرلوٹ کو نمبر نوٹ کروادیا۔

”چیرلوٹ چاہے کچھ بھی ہو جلد از جلد معلومات جمع کرو اور ہمارے لے حالات بہتر کرو میں نہیں جانتا کہ میں کب تک......؟“

”میں جانتی ہوں لیکن یہ یاد رکھو کہ تم ایک سو سولہ لوگوں میں سے بہترین ہو۔“ چیرلوٹ نے کہا اور فون بند کردیا۔ جافری ہماری گفتگو سن رہا تھا میرا آخری جملہ سن کر اس کے چہرے پر نا امیدی جھلک رہی تھی۔ میں نے اس کا فون اسے واپس کیا۔

”جافری پریشان مت ہو یاد رکھو میں اپنے وعدے پورے کرتا ہوں اور میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں باحفاظت اور زندہ یہاں سے نکال لوں گا میرا بھروسہ کرو۔“ میں نے کہا اور اس کے چہرے پر مجھے پھر زندگی کی امید نظر آنے لگی۔

(جاری ہے)

بازگشت

عرفان رامے

اس شخص کی روداد جو خود موت کا متلاشی تھا اور بخوشی موت کو گلے لگانا چاہتا تھا مگر موت اس سے دامن بچا رہی تھی۔

قارئین افق کیلئے بطور خاص

وہ بہت دیر سے خالی دیوار پر نظریں جمائے کسی غیر مرئی وجود کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سنجیدگی تھی اور اُداس آنکھوں سے چھلکنے والا کرب چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور سانسوں کی سرسراہٹ کے علاوہ زندگی کی کوئی دوسری علامت محسوس نہیں کی جاسکتی تھی۔

آج وہ اپنے فلیٹ میں بالکل تنہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے کام کو یکسوئی اور ہمت سے انجام دینے کے لیے اس نے اکلوتے ملازم بہادر کو بھی چھٹی پر گاؤں بھیج دیا تھا۔

کافی دیر تک یونہی گم صم دیوار کو گھورنے کے بعد اس نے بے اختیار جھرجھری لیتے ہوئے خود کو تلخ یادوں سے آزاد کرایا اور پھر گردن گھما کر سائیڈ ٹیبل پر پڑے ریوالور کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اپنے مرحوم باپ کی اس خوفناک نشانی کو ہاتھ میں تولنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ریوالور کی نالی کو اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

موت کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس کو محسوس کرتے ہی اس کے وجود میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی تھی۔ خود کو فنا کردینے کے خیال نے اس کے چہرے کی رنگت دھلے ہوئے کپڑے کی سی کردی تھی۔

موت کے دھانے پر پہنچتے ہی زندگی ریوائنڈ کی جانے والی فلم کی طرح ذہن کے پردے پر تیزی سے منظر بدلنے لگی اور آنکھوں میں بسا کرب پانی بن کر جھلملانے لگا.... مگر اس مرتبہ وہ ہرگز پیچھے ہٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہر صورت اس سسکتی زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ ہمت کر کے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کی گرفت ریوالور کے دستے پر مضبوط کی.... اور پھر بنا تاخیر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

فائر کا حکم ملتے ہی ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں ٹریگر نے اپنا فرض ادا کردیا.... اور نلکی کی ہلکی سی آواز کمرے کے سہمے ہوئے سکوت کو پارہ پارہ کرگئی۔ اب ریوالور اس کے کانپتے ہاتھ سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔

ٹریگر دب چکا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ چیمبر فل ہونے کے باوجود گولی نہیں چل سکی تھی۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں کے دوران ٹریگر دبانے کی یہ دوسری کامیاب کوشش تھی جو فائر نہ ہونے پر ناکام ثابت ہوئی تھی۔

موت کی دہلیز سے واپسی کے بعد اس نے حسب سابق گہری سانس لیتے ہوئے بے ترتیب دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش کی۔ پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کے قطرے اپنی آستین سے صاف کرنے کے بعد وہ قریب پڑی بیساکھی کے سہارے اٹھ کر بیڈ پر جالیٹا۔ بیڈ پر گرتے ہی وہ یوں تیز تیز سانس لینے لگا تھا جیسے میلوں کی مسافت پیدال طے کر کے آیا ہو۔

خودکشی میں آج کی ناکامی کے بعد اس کے دل و دماغ نے برسوں پہلے کہی ایک نجومی کی بات کا مکمل یقین کرلیا تھا کہ تمہاری موت غیر طبعی ہوگی اور تمہیں قتل کیا جائے گا۔ تمہیں قدم قدم پر سنگین حادثات کا سامنا رہے گا۔ یہاں تک کہ ایسے مواقع بھی آئیں گے جب زندگی تمہارے

لیے بوجھ بن جائے گی۔ تم خود کو ختم کرنے کی کوشش بھی کرو گے، مگر ناکامی ہوگی۔ کیوں کہ ابدی نیند تمہیں صرف ایک جانا پہچانا نہایت عزیز دوست ہی سلا سکے گا۔

یہ پیشن گوئی کافی حد تک درست ثابت ہوئی تھی۔ ڈپریشن حد سے زیادہ بڑھنے کے باعث وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ماہ قبل جب اس نے بھاری مقدار میں نیند کی گولیاں کھا کر خود کو زندگی کے جھنجھٹ سے آزاد کرنا چاہا تو بھی نہ جانے اس کے ملازم بہادر کو کیسے خبر ہوگئی اور اس نے فوراً ایمبولینس منگوا کر اسے اسپتال پہنچادیا۔ اس کے بعد وہ کئی مرتبہ ریلوے لائن پر گیا مگر کبھی ٹرین کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا نہ ہوسکا.... اور اب جب کہ وہ ریوالور بھی استعمال نہیں کرسکا تھا تو نجومی کی کہی ہوئی بات پر مکمل یقین آگیا تھا۔

ٹریفک کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو کر زندہ بچ جانا اس کے نزدیک یقیناً ایک معجزہ تھا۔ مگر یہ معجزہ اسی روز اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا جب وہ اپنا رنگ روپ گنوا کر پہلی مرتبہ لوگوں کے سامنے آیا۔

لوگوں کی نظروں میں اس کے لیے صرف ہمدردی تھی اور قابل رحم رویوں نے اس سے جینے کا حوصلہ چھین لیا تھا.... پھر زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اسے ذہنی مریض بنادیا تھا۔

اب وہ ہر صورت مرجانا چاہتا تھا.... لیکن اس مرحلے پر پہنچ کر احساس ہوا تھا کہ مرجانا بھی آسان نہیں۔

”تو کیا خود کو زندگی نامی اس اذیت سے نجات دلانے کے لیے مجھے کسی کرائے کے قاتل کو ڈھونڈنا پڑے گا۔“

یہ نیا خیال ذہن میں آتے ہی وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا.... اگلے ہی لمحے ایک سفاکانہ مسکراہٹ اس کے خشک ہونٹوں پر رقص کرنے لگی تھی۔

.....☆.....

ریحان کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو بچپن ہی میں اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ ہوش سنبھالا تو ماں ہی اس کا واحد سہارا تھی۔ وہ بیٹے سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بھری جوانی میں بیوہ ہو جانے کے بعد اس نے صرف اپنے بیٹے کی خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی... اس کو مرے اب بیس سال گزر چکے تھے۔ مگر آج بھی وہ اپنی ماں کو یاد کر کے اکثر آبدیدہ ہو جاتا تھا۔

جب ریحان کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کی خالہ اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ گو خالہ کے شوہر اس کی آمد سے خوش نہیں تھے اور اس نو وارد بچے کو اپنے بچوں کے حق پر ڈاکا تصور کر رہے تھے، مگر بیوی کے اصرار پر خاموش رہے۔ والدین نے اس کے لیے کافی اثاثہ چھوڑا تھا۔ مگر پھر بھی تنہائی ان سب آسائشات پر حاوی رہی اور وہ کم گو لوگوں میں شمار کیا جانے لگا۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اصرار کر کے گریجویشن کرنے کے لیے کراچی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ہاسٹل لائف میسر آئی تو اسے کچھ راحت نصیب ہوئی۔ اب اسے اپنے وجود کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں تھا۔ کسی کی نفرت بھری آنکھیں اس کے تعاقب میں نہیں رہتی تھیں۔ بالغ ہونے کے بعد اس کے والدین کا اثاثہ بھی اس کے نام منتقل کر دیا گیا تھا۔

گاؤں میں چند ایکڑ زمین کے علاوہ کچھ بینک بیلنس بھی اس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش میں معاون ثابت ہوا تھا۔ اب وہ اپنی تمام توجہ صرف حصول علم پر دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ فیصل آباد میں اپنی خالہ سے ملنے بھی بہت کم جاتا تھا۔

ان کے خاندانی وکیل نے اس کے والدین کی وصیت کے مطابق تمام جائیداد کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے تھے.... اب وہ اپنی مرضی سے پر پھیلا کر اڑنے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ چند قریبی دوستوں سے مشورے کے بعد ایڈورٹائزنگ کا شعبہ اختیار کیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد گاؤں کی زمین بیچ کر ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لی۔

رنگ و نور کی دنیا کا حصہ بننے کے بعد اس نے ایک نئے انداز میں جینا شروع کر دیا تھا۔ ماڈلنگ کی دنیا میں وارد ہونے والی ہر لڑکی اس سے تعلقات کی خواہاں دکھائی دے رہی تھی جس کی ایک بڑی وجہ اس کی پرکشش شخصیت تھی۔

چنانچہ کاروبار کے ابتدائی دور ہی سے اس کے بہت سی پریوں سے مراسم قائم ہو گئے لیکن یہ تعلقات کسی ایک منزل سے بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکے۔ ریحان جانتا تھا کہ یہ لڑکیاں اس کی دولت اور معاشرتی مقام پر مرتی ہیں.... وہ جنم جنم سے محبت کا پیاسا تھا اور اسی خواہش سے ان کی جانب بڑھتا تھا مگر انہیں تو جیسے صرف ایک دولت مند عاشق کی تلاش تھی۔

اس کی عمر چالیس کے قریب تھی لیکن وہ ابھی تک کنوارا تھا.... پھر ایک پارٹی میں اس کی ملاقات ماریا سے ہوئی۔ ماریا کی عمر ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا اور وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔ ماریا نہایت دلکش اور نازک اندام حسینہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔

پارٹی ختم ہوئی تو دونوں اچھے دوست بن چکے تھے۔ اب ان کی ملاقاتیں باقاعدگی سے ہونے لگیں.... اور پھر ایک کینڈل نائٹ ڈنر کے دوران ریحان نے اسے شادی کے لیے پرپوز کر دیا۔

ماریا اس کی بات سن کر یکدم خاموش ہو گئی اور وعدہ کیا کہ بہت جلد سوچ کر جواب دے گی۔ ریحان کو یقین تھا کہ وہ مہلت صرف اسے ستانے کے لیے مانگ رہی ہے۔ ورنہ اس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے چچا کے ہاں پرورش پائی تھی جو اب دنیا میں نہیں رہے تھے۔

ماریا سے ملنے کے بعد اس کی زندگی مزید خوب صورت ہو گئی تھی اور وہ پھر سے جینے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ماریا نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا۔ اس روز سر شام ہی وہ ماریا کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ ماریا نے اسے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا تھا اور خصوصی درخواست کی تھی کہ گاڑی

لے بجائے موٹر بائیک پر آئے۔ ماریا کو موٹر بائیک پر گھومنا
ان کی حد تک پسند تھا۔ ریحان نے صرف اس کی خواہش
مدنظر رکھتے ہوئے ایک ہیوی بائیک خرید لی تھی اور
نوں اکثر خوشگوار شاموں میں سرد ہواؤں سے کھیلتے لمبی
ر پر جایا کرتے تھے۔

وقت مقررہ پر ریحان گھر سے نکلا تو موسم ابر آلود تھا۔
ر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ سڑکوں پر پھسلن بڑھتی
ں جارہی تھی۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک
ئیں طرف سے موڑ کاٹنے والی ایک تیز رفتار جیپ نے
سے کسی بدمست بھینسے کی مانند ٹکر ماری اور وہ ہوا
ں قلابازیاں کھاتا کئی میٹر دور جا گرا۔

زمین پر گرتے ہی ریحان نے ٹکر مارنے والی قاتل
پ کو دیکھا تو ڈرائیور اُسے بغور دیکھنے کے بعد وہاں سے
ار ہو گیا تھا۔

.....☆.....

جانے کتنی دیر بعد ریحان کو ہوش آیا تو اس کا سارا جسم
دیں میں جکڑا ہوا تھا اور چہرے کی کئی ہڈیاں اس طور ٹوٹ
ں تھیں کہ وہ کسی پچکی ہوئی گاڑی کا فریم محسوس ہو رہا
، یہاں تک کہ مقابل پہلی نظر میں اسے دیکھتے ہی خوف
وس کرنے لگتا تھا۔

طویل بے ہوشی کے بعد آنکھ کھلی تو ماریا ایک ہمدرد
ست کی حیثیت سے اسپتال میں موجود تھی۔ وہ خود کو اس
ں حالت کا ذمہ دار سمجھ کر روئے چلی جارہی تھی۔ ریحان
ے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے اسے اس احساس
م سے نجات دلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ دن رات
ں کی خدمت میں مصروف رہی۔

قریباً ایک ماہ بعد اسے اسپتال سے گھر منتقل کر دیا
گھر پہنچنے کے بعد ماریا نے اس سے شادی کا ارادہ ظاہر
یا تو ریحان نے انکار کر دیا۔

''آخر کیوں....؟ میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی
ں۔''

''میں نہیں چاہتا کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر
ں کھائیں.... میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور
ی جانتا ہوں کہ تم خود کو قصوروار سمجھتے ہوئے اپنی محبت کا

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ حجاب کراچی

شائع ہو گیا ہے

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ''حجاب'' آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

غریب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں
021-35620771/2
0300-8264242

کفارہ ادا کرنا چاہتی ہو۔ مگر میں اتنا خود غرض نہیں کہ تمہیں حاصل کرنے کیلئے کوئی گھٹیا راستہ اختیار کروں.... ویسے بھی جس رشتے کی بنیاد ہمدردی ہو وہ زیادہ دیر نہیں چل پاتا۔''

''مگر میں ایسا نہیں سوچتی....؟'' ماریا نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''لوگ تو سوچیں گے ناں.... تمہیں اس غلط فیصلے پر ملامت بھری نظروں سے دیکھیں گے اور مجھے مجرمانہ سوچ کا مالک تصور کر کے مزید نفرت کرنے لگیں گے۔ میرے لیے یہی بہت بڑا اثاثہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میں اس تعلق کو دوستی سے زیادہ کوئی نام دینے کے لیے تیار نہیں۔''

ریحان کا حتمی فیصلہ سن کر ماریا نے مزید کچھ نہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں مانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا ہے مگر یقین کرو میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں.... اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تمہاری حالت سنبھلتے ہی ہم دونوں شادی کرلیں گے۔'' وہ بھی اپنی بات پر ڈٹ گئی تھی۔

''اس کا فائدہ؟'' ریحان مسکرایا۔

''محبت میں فائدے نہیں دیکھے جاتے۔''

''محبت میں گھاٹے کا سودا کرنا بھی دانشمندی نہیں۔ ابھی تم جذباتی ہو۔ چند روز بعد ٹھنڈے دماغ سے میری باتوں پر غور کرو گی تو اپنا فیصلہ احمقانہ محسوس ہونے لگے گا۔''

.....☆.....

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ماریا نے شادی کا بہت اصرار کیا مگر ریحان نے صاف انکار کردیا۔ ابتدائی چند ہفتے تو وہ بلاناغہ آفس سے اس کے ہاں آتی رہی.... مگر دھیرے دھیرے اس روٹین میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔

اب وہ دوسرے تیسرے دن آنے لگی تھی اور درمیان میں کبھی کبھار فون کرلیتی تھی۔ وہ اپنی بدلی ہوئی روٹین کی وجہ دفتر میں کام کی زیادتی بتایا کرتی تھی۔

ریحان نے بھی ماریا کی اس بدلتی عادت کا خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ اسے اپنی حالت کا احساس تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماریا اس کی خاطر اپنی زندگی برباد کرے۔ پھر ایک روز ماریا نے اسے بتایا کہ کمپنی نے اس کا ٹرانسفر کراچی کر دیا ہے۔

ماریا کی بات سن کر ریحان کے دل کو دھچکا ضرور لگا مگر اس نے کسی طور یہ احساس نہ ہونے دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماریا اس کی خاطر اپنی زندگی برباد کرے.... شاید ماریا نے بھی یہی سوچ کر شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی محبت سے ماریا کو الوداع کہا۔

کراچی جانے کے بعد کچھ عرصہ تک ماریا نے اس سے بھرپور رابطہ رکھا اور پھر نا صرف اپنا فون نمبر بدل لیا بلکہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔

ریحان کو ماریا کے اس رویے نے بہت بے چین کر دیا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

بہت دنوں بعد اسے ماریا کی جانب سے ایک خط موصول ہوا.... اس نے محبت میں بے وفائی پر معذرت کرتے ہوئے اپنی شادی کا انکشاف کیا تھا۔ ریحان کو ماریا کی اس بے اعتنائی سے بہت دکھ پہنچا مگر اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے خود کو تسلی دی کہ ماریا کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے بہتر انداز میں سوچے۔

ریحان کی ٹانگوں کا پلاسٹر کھل گیا تھا۔ وہ کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل بھی ہوگیا تھا مگر چال میں مستقل لنگڑا پن آگیا تھا۔ ساتھ ہی دوسرا نہایت کربناک احساس اس کے چہرے کی بدصورتی تھی۔ ملنے والوں نے اسے اس حد تک احساس کمتری میں مبتلا کردیا تھا کہ نوبت خودکشی تک پہنچ گئی تھی۔

.....☆.....

خودکشی کی اس آخری کوشش کے بعد اب وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اسے موت کی نیند سلا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر ان جگہوں کے چکر لگایا کرتا تھا جہاں اس کی دانست میں جرائم پیشہ افراد کا آنا جانا تھا۔

ایک روز وہ چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے جا بیٹھا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ ارد گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے پڑھ رہا تھا کہ قریبی میز پر بیٹھے دو افراد کو دیکھتے ہی ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ان کے

چہروں سے مفلسی ٹپک رہی تھی۔صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں نشہ کرتے ہیں۔ان میں سے ایک کی عمر پینتیس اور دوسرے کی بمشکل پچیس کے قریب تھی۔

اپنے لباس اور بیٹھنے کے انداز سے وہ جاہل نہیں لگ رہے تھے....مگر یہ حقیقت بھی عیاں تھی کہ وہ نشے کے لیے پیسوں کے متلاشی تھے۔اس بات کا اندازہ ریحان کو اس وقت ہوا جب وہ اپنے اپنے گھروں سے مال چوری کر کے نشہ کرنے کی باتیں بڑی ڈھٹائی سے سنا رہے تھے۔

ہال میں گاہک نہ ہونے کے برابر تھے اور مکمل خاموشی ہونے کے باعث وہ ان کی سرگوشیاں واضح طور پر سن سکتا تھا۔

پھر بڑی عمر کا شخص جسے ہاشم کہہ کر پکارا جا رہا تھا دوسرے ساتھی ناصر کو ہدایت دینے لگا کہ انہیں جلد از جلد کہیں ہاتھ مار کر پیسہ حاصل کرنا ہوگا کیوں کہ اب ادھار سگریٹ ملنا بند ہو گئے تھے۔

ان کی باتیں سن کر ریحان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بیساکھی سنبھالی اور بلا اجازت ان کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے تم بیٹھ چکے ہو؟“ ہاشم نے منہ بنایا۔

”میرا نام ریحان ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروانا چاہا۔

”تم ریحان ہو یا فرمان ہمیں تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔صرف مطلب کی بات کرو۔ہم ذرا مصروف ہیں۔“ ناصر نے منہ بنایا۔انہیں ریحان کا یوں اچانک ٹپک پڑنا اچھا نہیں لگا تھا۔

”بلا اجازت آپ کے درمیان مخل ہونے پر معذرت چاہتا ہوں.....باقی دلچسپیاں تو ملنے سے ہی پیدا ہوتی ہیں ناں۔ممکن ہے مجھ سے ملاقات آپ دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔“ ریحان نے مسکرا کر نرمی سے کہا۔

اس کی بات سن کر ہاشم نے غور سے اس بدصورت چہرے والے شخص کی جانب دیکھا اور پھر جھرجھری لیتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کی

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈریس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

ایک بھی ہڈی اپنی صحیح جگہ پر قائم نہ رہی ہو۔

''تم شاید کسی حادثے میں اپنی یہ درگت بنوا بیٹھے ہو۔'' وہ اس کی چہرے سے نظریں ہٹا کر ہمدردانہ لہجے میں بولا:

''ہاں۔ بس سانس ہی بچی تھی اُس بھیانک حادثے میں۔''

''تو آپریشن کروالیتے۔۔۔ میں نے تو سنا ہے آج کل تو پلاسٹک سرجری سے گدھوں کو بھی انسان بنا دیا جاتا ہے۔ تم تو پھر بھی کہیں کہیں سے انسان دکھتے ہو۔'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں جگت لگائی اور پھر خود ہی کھی کھی کرنے لگا۔

''کوشش کی تھی میں نے لیکن ڈاکٹروں نے کہا کہ چہرہ بہت بری طرح مسخ ہو چکا ہے۔ شاید ہی انیس بیس کا فرق پڑے گا۔ ویسے میری ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی ہے اور اس میں پتھر کا ڈیلافٹ کر کے کارروائی پوری کر دی گئی ہے۔ سوچتا ہوں اگر نتائج کی توقع نہیں تو کیا فائدہ خود کو مزید اذیت دینے کا۔'' ریحان نے اس کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اذیت سے تو تم اب بھی گزر رہے ہو میرے دوست.... ہمت ہے تمہاری جو ہر روز ملنے والے بے شمار لوگوں کا سامنا کرتے ہو۔ قسم سے تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس کرب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودسوزی کر چکا ہوتا۔'' ہاشم نے ایک بار پھر جھرجھری لی۔

''اپنے ہاتھوں اپنی جان لینا بھی تو آسان نہیں ہے۔'' ریحان نے دلیل پیش کی۔

''تو پھر اس کا ایک ہی حل ہے کہ تم کسی دور دراز تفریحی مقام پر نکل جاؤ اور کسی خوبصورت جگہ پر اچھا سا گھر بنا کر باقی زندگی وہیں گزار دو.... قیمتی لباس سے لگتا ہے تمہارے پاس دولت کی بھی کمی نہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کوئی بھی حسین لڑکی پیسے کے لالچ میں تمہاری تنہائی دور کر دے گی.... میرے مشوروں پر عمل کرو، عیش کرو گے باقی زندگی۔'' ناصر کافی باتونی تھا۔

''اگر دنیا کی ہر آسائش دولت ہی سے حاصل ہو سکتی تو لوگ بے بسی کے عالم میں نہ مرتے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو جیتنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمام عمر اپنی کمزوریوں کو شکست دی ہے اور آج بھی اپنی اسی بدصورتی کو شکست دینے کے لیے میدان میں اترا ہوں۔'' ساتھ ہی ریحان نے کھانے کا آرڈر دے دیا جس پر ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

کھانے کے بعد ریحان نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا اور پھر بل کے ساتھ بھاری ٹپ سے بھی نواز دیا۔

ہاشم اور ناصر اب اس سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ وہ ریحان کا نوٹوں سے بھرا بٹوا اور سخاوت دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ اب وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اس تگڑی اسامی کو قابو کرنے کا پیغام دینے لگے۔ ان کے لہجے میں مٹھاس لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد ناصر مسکین صورت بنا کر بولا:

''آج کل ہمارا ہاتھ پیسے کے معاملے میں کچھ تنگ ہے۔ کیا تم ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تنخواہ ملتے ہی تمہاری رقم شکریہ کے ساتھ واپس لوٹا دیں گے۔''

''کب ملے گی تنخواہ؟'' ریحان نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔

''جیسے ہی نوکری ملی.... اس کے ایک ماہ بعد۔'' ناصر نے فٹ سے جواب دیا۔

''یعنی آج کل تم دونوں فارغ ہو۔''

''ہاں بالکل۔ بس یوں سمجھو حالات کے مارے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا پر مکمل بھروسہ ہے۔ دیکھنا بہت جلد ہمارے حالات بدل جائیں گے۔ ویسے بتا دوں ہم دونوں کا تعلق اچھے گھرانوں سے ہے۔ ہم کوئی گرے پڑے لوگ نہیں۔ بس خودداری زیادہ ہے۔ خوانخواہ کسی کے سامنے اپنے حالات کا رونا نہیں روتے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے.... مگر میں معافی چاہتا ہوں کہ تم دونوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ تم لوگوں کا کام دھندا تو ہے نہیں۔ میں اپنے ادھار کی وصولی کے لیے کہاں تلاش کرتا پھروں گا تمہیں....'' ریحان نے ٹکا سا جواب دیا۔

''یقین کرو ہم برے لوگ نہیں ہیں۔'' ہاشم نے کہا۔

''تم لوگ اتنے شریف بھی نہیں لگتے.... مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی مجبور اور کمزور شخص تمہارے ہتھے چڑھ جائے

تو تم اسے کبھی معاف نہیں کرو گے۔''

یہ کہہ کر ریحان نے چند لمحے توقف اختیار کیا اور ان دونوں کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے بولا: ''فرض کرو اگر میں کسی سنسان راستے میں مل جاتا اور میرے پاس نقدی ہوتی تو تم دونوں میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

''تمہاری سوچ سے بھی بھیانک۔'' ہاشم اس کی بات سن کر غصے سے کھول اٹھا۔

''لیکن شاید تم دونوں یہ نہیں جانتے کہ ان کاموں کے لیے بڑی جرات اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ریحان نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''ایسی بات ہے تو آزما کر دیکھ لو۔'' ہاشم نے پہلو بدلا۔

''سوچ لو....''

''بھوک اور مایوسی میں انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ہم تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے کہیں بھی جاسکتے ہیں۔'' ناصر کسی صورت شکار کو بچ نکلنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ بے وقوف اور بدصورت آدمی جوش میں ہوش کھو کر ان ہتھے چڑھ گیا تو کافی دنوں کا خرچہ پانی نکل آئے گا۔

ریحان نے ان کا جوش و خروش دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور بیساکھی سنبھال کر ان کے ہمراہ دروازے کی جانب چل پڑا۔

جب وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر سڑک پر پہنچے تو وہ ریحان کی ثابت قدمی دیکھ پریشان ہوگئے۔

''کہاں چلنا ہے؟'' ہاشم نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

''کسی سنسان جگہ.... جہاں کوئی نہ ہو۔''

''مگر کیوں؟'' ناصر حیرت سے بولا۔

''تاکہ تم دونوں سکون سے اپنی ہمت کا مظاہرہ کر سکو۔''

''تم شاید مذاق کر رہے ہو؟''

''ہمارے درمیان مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ ڈر گئے ہو۔'' ریحان کے لہجے میں طنز تھا۔

''ایسی بات نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر

AANCHALPK.COM

تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ماہنامہ آنچل کراچی

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

چاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تحریر جو آپ کی دل کی دنیا میں ہل تحمل کر دے

معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا فاخرہ گل کا ناول جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کر دے گا

خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقرا صغیر کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کر دے

AANCHALNOVEL.COM

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (021-35620771/2)

تم چاہتے کیا ہو۔ بظاہر تم ایک معذور آدمی ہو اور تم میں ایسی کوئی صلاحیت دکھائی نہیں دیتی کہ ہم دونوں پر حاوی ہو سکو .... پھر اس سارے ڈرامے کا مقصد کیا ہے؟'' ناصر معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

''میں چاہتا ہوں تم لوگ مجھے قتل کر دو۔'' ریحان نے پرسکون لہجے میں جواب دیا تو دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

''تم یقیناً پاگل ہو....'' ہاشم تھوک نگل کر بمشکل یہی کہہ پایا تھا۔

''نہیں میں بالکل ہوش میں ہوں.... اور یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے قتل کر کے میرے والٹ میں موجود رقم دو حصوں میں بانٹ لو۔ یقین مانو اس وقت میرے پرس میں اتنی رقم موجود ہے کہ تم پورا مہینہ سکون سے خرچ کر سکتے ہو۔''

''کیوں مرنا چاہتے ہو تم.... خدا گواہ ہے ہمارا مقصد قطعاً تمہیں جان سے مارنا نہیں تھا۔ ہم تو صرف تمہیں دھمکانے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ورنہ ہم دونوں کوئی پیشہ ور قاتل یا لٹیرے نہیں ہیں۔'' ہاشم نے اسے سمجھانا چاہا۔

''مگر میں ہرگز مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی مرنا چاہتا ہوں۔ میں عاجز آ چکا ہوں اپنی زندگی سے جس میں میرے لیے سوائے نفرت کے اب کچھ نہیں بچا.... میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس اذیت سے نجات حاصل کرنے میں میری مدد کرو۔'' ریحان نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ پھر آخری وقت میں اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' ہاشم نے منہ بنایا۔

''اگر مجھ میں خودکشی کرنے کی ہمت ہوتی تو کب کا کر چکا ہوتا۔ ویسے بھی یہ قتل نہیں مدد ہے۔ اور میں اپنی مرضی سے مرنا چاہتا ہوں۔'' ریحان نے جواز پیش کیا۔

''کچھ بھی کہہ لو پولیس اسے قتل ہی کہے گی۔ ایسے میں اگر ہم ایک مرتبہ قانون کے ہتھے چڑھ گئے تو بلا تاخیر سولی پر جھولتے دکھائی دیں گے۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ ابھی وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ناصر نے اس کی بات کاٹی:

''ہم یہ کام ضرور کریں گے۔۔۔ اور اتنی صفائی سے کریں گے کہ پولیس کا باپ بھی ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔'' اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک لحہ بہ لحہ تیز ہو چلی جا رہی تھی۔ یہ کہہ کر وہ ہاشم کے جواب کا انتظار کیے بغیر ریحان سے مخاطب ہوا:

''یہ بتاؤ! تم کس طرح مرنے میں سہولت محسوس کرو گے؟''

''ریوالور سے.... میں اپنا ریوالور ہمراہ لایا ہوں۔ میرا یقین کرو تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ پیسہ کمانے کا اس سے آسان طریقہ تم دونوں نے کبھی نہیں سوچا ہوگا۔'' ریحان ہر صورت انہیں قائل کرنا چاہتا تھا۔

''یعنی تم بھرپور تیاری سے آئے ہو.... خیر پسٹل تو ہمارے پاس بھی ہے.... یہ بتاؤ چلنا کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے تم کہاں مرنا پسند کرو گے۔'' ناصر اب یوں ڈیل کر رہا تھا جیسے دکاندار اور گاہک کے درمیان مکالمہ چل رہا ہو۔

''میں تو روزانہ ہی تیاری سے نکلتا ہوں، کبھی کوئی ڈھنگ کا آدمی ملا ہی نہیں تھا۔''

''ناصر ہوش کرو.... یہ شخص پاگل ہے۔ خود تو مر جائے گا لیکن جاتے جاتے ہمارے لیے بھی قبریں کھدوا جائے گا۔'' ہاشم نے اسے ٹوکا۔

''کم ان یار! یہ بے چارا تو پہلے ہی مجبور ہے۔ ہم مفلسوں کو ایسے مجبوروں کی مدد کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے جو ہمیں فائدہ پہنچانے والے ہوں۔ مجھے یاد ہے یہ بات ایک بار تم نے ہی کہی تھی۔ اس لیے اب مین پیچھے ہٹنے والا نہیں.... میرے نزدیک یہ محض کاروباری ڈیل ہے.... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ خود سوچو اس کی جیب میں پچاس ہزار روپے ہیں۔ جو ہم جیسے کنگلوں کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ ریحان کی جانب پلٹا:

''تم نے اپنی موت کے لیے یقیناً کسی خاص جگہ کا انتخاب بھی کر رکھا ہوگا۔ وہ بھی بتا دو تاکہ کام جلد از جلد نمٹایا جا سکے۔''

''کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔ جہاں تم لوگوں کو سہولت ہو۔''

ہاشم، ریحان کی باتیں سن کر حیرت سے آنکھیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ کوئی شخص یوں بھی اپنی موت کے بارے ڈیل کرسکتا تھا۔ وہ تمام معاملات یوں خوش دلی سے طے کررہا تھا جیسے مرنے نہیں ہنی مون کے لیے جانے والا ہو۔ یہ اس کی زندگی کے ناقابل فراموش لمحات تھے۔

''اچھا اب باتیں ختم، کام شروع۔ میں سامنے پارکنگ سے گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ تم لوگ چوک کراس کر کے دائیں سڑک پر مڑ جاؤ۔ میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔'' ریحان ایک بیساکھی کے سہارے پھدکتا ہوا کار پارکنگ میں جا گھسا۔ جب کہ ناصر، ہاشم کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

''ہمیں اس مسئلے میں نہیں الجھنا چاہیے۔ یہ پاگل لگتا ہے۔ دیکھنا ہمیں بھی لے ڈوبے گا۔'' ہاشم نے ایک بار پھر ناصر کو سمجھانا چاہا۔

''تم تو خوامخواہ پریشان ہورہے ہو۔ ویسے بھی اگر یہ پاگل ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا ہی دانش مندی کا تقاضا ہے.... خود سوچو اگر ہم اس پاگل سے ڈر کر پچاس ہزار روپے گنوا دیں گے تو کون عقل مند کہے گا ہمیں۔ حوصلہ کرو۔ دیکھنا کام ختم ہونے کے فوراً بعد جیسے ہی گرما گرم نوٹ تمہاری جیب میں منتقل ہوں گے سارا خوف ہرن ہو جائے گا۔'' ناصر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا تو وہ نیم رضامندی سے آگے بڑھ گیا۔

.....☆.....

کچھ دیر بعد وہ تینوں فارسٹ گارڈن کی جانب اڑے چلے جارہے تھے جس کا انتخاب انہوں نے باہمی مشورے سے کیا تھا۔

فارسٹ گارڈن شہر کے بڑے پارکوں میں سے ایک تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلے اس پارک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہاں دن میں بھی ویرانی چھائی رہتی تھی اور ایسے بہت سے گوشے موجود تھے جہاں کسی بھی شخص کو موت کے گھاٹ اتار کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا جاسکتا تھا۔

ریحان ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود اعتماد سے کار چلا رہا تھا کیوں کہ کار میں ایسے خصوصی آلات موجود تھے جو معذور لوگوں کی سہولت کے لیے لگائے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی کار شہر کی مصروف شاہراہ کو خیرآباد کہہ کر نسبتاً پرسکون سڑک پر مڑی ریحان نے ڈیش بورڈ کھول کر ایک چمکتا ہوا ریوالور نکالا اور ہاشم کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا:

''احتیاط سے پکڑنا۔۔۔ لوڈڈ ہے۔''

وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر ہمیں یہ فیصلہ بھی تو کر لینا چاہیے کہ تم پر فائر کون کرے گا؟'' وہ ریوالور تھام کر ہچکچاتے ہوئے ناصر سے مخاطب ہوا۔

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر تم گھبرا رہے ہو تو یہ نیک کام میں کر دوں گا۔ تم تو ویسے بھی پیدائشی بزدل ہو۔'' ناصر کو اس کی بات سن کر سخت کوفت محسوس ہوئی تھی۔ وہ کسی صورت ریحان کے سامنے خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تم نے کب مجھے بزدلی کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔'' ہاشم بھی اپنی عزت پر حرف آتا دیکھ کر غرایا۔

''بارہا.... بلکہ تم تو اپنی بیوی کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہو۔ پھر کسی دوسرے کے سامنے کیسے بول سکتے ہو۔'' وہ اس کے راز اگلنے لگا۔

''تو کیا تم اس کی بیوی کے بارے میں بھی جانتے ہو۔'' ریحان نے قہقہہ لگایا۔

''اس کے بارے کون نہیں جانتا۔'' ناصر نے چٹخارہ لیا۔

''مگر میں تو نہیں جانتا ناں۔'' ریحان نے اس کی ہمت بندھائی۔

''تو مرنے سے پہلے تمہاری آخری کوشش بھی پوری کیے دیتے ہیں.... میرا یہ دوست خود جتنا لگڑ بگڑ دکھائی دیتا ہے اس کی بیوی اتنی ہی پٹاخہ ہے۔ اگر تم ایک بار اسے دیکھ لو تو گولی سے مرنے کے بجائے اس پر مرمٹنے کو ترجیح دو.... اور قتل ہونے کے بجائے اس منحوس کا کام تمام کردو جسے اپنی ہیرے جیسی بیوی کی قدر نہیں ہے۔ سچ کہتا ہوں وہ تو پری ہے پری.... ایک بڑی فیکٹری میں استقبالیہ کلرک ہے اور نائٹ ڈیوٹی کو ترجیح دیتی ہے.... بس یار کیا کیا سنو گے، کیا کیا بتاؤں۔۔۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ رات کے پچھلے پہر جب سارا جگ سو جاتا ہے تو وہ اکثر ڈیوٹی کے دوران اپنی سیٹ سے غائب پائی جاتی ہے۔''

ناصر نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنے دل پر ہاتھ رکھا تو غصے سے بے قابو ہاشم نے ہاتھ میں پکڑا ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''اس سے زیادہ ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو دماغ میں سوراخ کردوں گا تمہارے۔''

''اتنی غیرت کب سے جاگ اٹھی تمہارے دل میں .... مت بھولو کہ تم اسے جوئے میں ہار چکے ہو میرے پاس اور اگر پرسوں تک رقم ادا نہ کی تو ایک ہفتے کے لیے میرے حوالے کرنا پڑے گا اسے۔'' موقع ملتے ہی ناصر نے بھی جیب سے پسٹل نکال کر ہاشم پر تان لیا۔

ریحان اطمینان سے سنسان سڑک پر کار بھگائے چلا جا رہا تھا جب کہ پچھلی سیٹ میدان جنگ بن چکی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے احسانات جتانے کے بعد آپس میں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ کار سبک رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں تھی کہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں ٹائر آتے ہی زوردار جھٹکا لگا اور گاڑی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔

گولی کی آواز سن کر ریحان نے جلدی سے گاڑی روکی اور پلٹ کر پچھلی سیٹ کی جانب دیکھا۔ ناصر کے ماتھے سے لکیر کی صورت میں بہتا ہوا خون ناک تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے وہ سوچ بھی نہ سکتا ہو کہ ہاشم اس پر گولی بھی چلا سکتا ہے۔

ادھر ہاشم کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' ریحان نے سخت لہجے میں کہا۔

''مم.... میں نے جان بوجھ کر نہیں مارا۔ گاڑی کو ایک دم جھٹکا لگا تو ٹریگر پر میری انگلی کا دباؤ بڑھ گیا.... میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ بس ذرا دھمکا رہا تھا۔ یہ تو میرا بہت عزیز دوست تھا۔'' وہ اس کا سر گود میں رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

''خیر.... اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ یوں ٹسوئے بہانے سے وہ واپس نہیں لوٹ آئے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے بھی پارک کے کسی گمنام گوشے میں دبا دیں گے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اب پچاس ہزار ملنے والے ہیں۔ جو آدھی رقم وہ تم سے ہتھیانے والا تھا وہ بھی اب تمہیں ملے گی۔ یعنی پچاس ہزار روپے تم سے صرف ایک کلومیٹر دور ہیں.... کیوں کہ فارسٹ گارڈن کا فاصلہ بھی یہاں سے ایک کلومیٹر ہے۔''

''نہیں چاہیے مجھے پچاس ہزار.... میں بے موت نہ مرنا چاہتا۔ میں اپنے دوست کی موت کے الزام میں سز نہیں چڑھنا چاہتا.... میں ایک قتل مزید نہیں کر سکتا۔''

اس سے قبل کہ ریحان اس کی بات سمجھ پاتا وہ تیز سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور بھاگتا ہوا درختوں جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

.....☆.....

رات گئے ریحان واپس اپنے فلیٹ پر لوٹا تو بہت تھ چکا تھا۔ ناصر کی لاش ٹھکانے لگانے کے چکر میں اس کپڑوں پر جا بجا خون کے دھبے لگ چکے تھے۔ اپنے فلیٹ میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور کھانا کھا کر بستر گھس گیا۔

لاش کو ٹھکانے لگانے سے قبل ریحان نے اس جیبوں کی تلاشی بھی لے لی تھی جن میں سے ایک پسٹل چند روپے اور اور ایک چھوٹی سی ڈائری ملی تھی جس میں ہا کا فون نمبر اور ایڈریس بھی موجود تھا۔ کچھ دیر سوچ بچار بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہاشم کے گھر پہنچ کر اسے آ کرے اور یہ ادھورا مشن ہر صورت اسی کے ہاتھوں پ کروائے۔

ریحان کی حالت اس ذہنی مریض کی سی ہو کر رہ گئی جو ہر صورت مرنا چاہتا ہو۔ وہ رات اس نے آنکھوں گزاری اور دوسرے روز صبح سویرے اس کے گھر پہنچ گ وہ ایک متوسط علاقے میں رہتا تھا۔ گھر ڈھونڈنے اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

دروازے پر دستک دی تو کچھ ہی دیر بعد کسی قدموں کی مدہم چاپ قریب آتی محسوس ہوئی.... اور جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ مقابل کو دیکھ کر ریحان ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیوں کہ دروا کھولنے والا خود ہاشم تھا۔ ادھر ہاشم کی آنکھیں بھی حیر اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

''تم اور یہاں....''

''ہاں میں نے سوچا تمہیں گھر سے پک کر لوں ریحان نے اطمینان سے کہا۔

''تمہیں میرے گھر کا ایڈریس کس نے بتایا؟''

''یہ سب فضول باتیں ہیں.... ہمیں کام کی بات کرنی چاہیے۔ ویسے تمہارے ہاں مہمان نوازی کا رواج نہیں ہے.... میرا مطلب ہے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

''ٹھیک ہے آجاؤ....'' وہ اسے ایک سادہ سے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور پھر بنا توقف تیز لہجے میں بولا:

''دیکھو تمہیں مجھ سے جو بات بھی کرنی ہے شام کو اسی ریسٹورنٹ میں آجانا۔ اس وقت میں بہت پریشان ہوں.... ویسے بھی میری بیوی رات بھر ڈیوٹی کر کے واپس لوٹنے والی ہے۔ میں اسے گھر پہنچتے ہی پریشان نہیں کرنا چاہتا.... کیوں کہ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ فریہاً گڑگڑا رہا تھا۔

''اگر اس سے اتنی محبت کرتے ہو تو پھر اپنی محبت کا حق ادا کرنا بھی سیکھو.... یہ کیسی محبت ہے کہ تم مرد ہو کر گھر میں پڑے رہتے ہو اور وہ عورت ہو کر بھی تمہارا پیٹ پالنے کے لیے راتوں کو کام کرتی ہے۔ تھوڑی غیرت کھاؤ اور چلو میرے ساتھ۔'' ریحان نے اسے جوش دلایا۔

''آخر تم میرے ہاتھوں ہی کیوں مرنا چاہتے ہو.... میں نے کیا گنوایا ہے تمہارا۔''

''تم نے ہی تو سب کچھ گنوایا ہے میرا.... تم ہی تو ذمہ دار ہو میری اس حالت کے۔''

''کک.... کیا کہنا چاہتے ہو تم۔'' ہاشم ہکلایا۔

یاد کرو چند سال پہلے تمہاری جیپ ایک موٹر سائیکل سوار پر چڑھ دوڑی تھی.... تم نشے میں دھت تھے اور اس زخمی شخص کو اسپتال پہنچانے کے بجائے تڑپتا چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔''

''کون ہو تم.... اور کیسے جانتے ہو یہ سب....'' ہاشم نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''میں وہی بدقسمت موٹر سائیکل سوار ہوں.... جو کبھی تمہارا چہرہ نہیں بھلا پایا۔ تمہاری بے حسی نے مجھے اس لمحے اتنی تکلیف نہیں پہنچائی تھی جتنا کرب میں نے صحت یاب ہونے کے بعد جھیلا ہے۔ تم ہی وہ جلاد ہو جس نے مجھے سسک سسک کر مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا... جیسے ہی اس روز تم مجھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے دکھائی دیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب تم ہی مجھے موت کے گھاٹ اتار کر اس کہانی کو انجام تک پہنچاؤ گے۔'' ریحان کے لہجے میں نفرت اور بے بسی کا امتزاج تھا۔

''میں یہ سب نہیں کر سکتا....'' ہاشم نے دوٹوک جواب دیا۔

''اگر تم نے مجھے قتل نہ کیا تو میں تمہیں جان سے مار کر یہیں پر خودکشی کر لوں گا.... تمہیں قتل کرتے ہی موت میرے لیے آسان ہو جائے گی اور میں سکون سے خودکشی کر لوں گا.... چلو شاباش۔ نکالو میرا ریوالور اور کر و فائر۔''

ریحان نے اسے بچے کی طرح پچکارا مگر وہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا:

''جلدی کرو.... میں صرف تین تک گننے کے بعد تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔'' وارننگ دے کر ریحان نے چند لمحے توقف اختیار کیا اور پھر سرد مہری سے پسٹل تان کر الٹی گنتی گننے لگا:

''تین.... دو.... ایک....''

جیسے ہی اس کے زبان سے ایک کا لفظ نکلا گرفت پسٹل پر سخت ہوتی چلی گئی، مگر اس سے قبل کہ وہ ٹریگر دبا کر اپنے مشن کو انجام تک پہنچاتا اچانک اس سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ضرب اتنی اچانک اور شدید تھی کہ ریحان کو اپنا دماغ لہو بن سر سے بہتا محسوس ہوا.... پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر پڑا تھا۔

جب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر حملہ آور کا چہرہ دیکھنے کے لیے پلٹا.... تو لوہے کا راڈ تھامے ماریا پر نظر پڑتے ہی اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔

برسوں پہلے نجومی کا کہا جملہ ایک بار پھر بازگشت بن کر اس کے کانوں میں گونج اٹھا تھا....

''یاد رکھو! تمہارا قاتل نہایت قریبی دوستوں میں سے ہوگا....''

جرم

مہتاب خان

اس کے پاس زندگی کے چند لمحات باقی تھے اور ان چند لمحات میں وہ ملک کے صدر مملکت کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک ماں کے آنسوؤں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

ایک قانون دان کی روداد

اسے بیوی کے قتل پر پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی

گو کہ بیرسٹر ناصر شاہ کی اس کہانی کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن لوگوں کے ذہنوں میں یہ آج بھی تازہ ہے خاص طور پر وکلا برادری اور قانون دان طبقہ کے ذہنوں میں روز اول کی طرح تازہ ہے۔

ہوا یوں تھا کہ شہر کے مشہور و معروف بیرسٹر ناصر شاہ کی بیوی کو کسی نے ان کے گھر میں گھس کر قتل کر دیا تھا۔ نیوز چینلو کی بریکنگ نیوز اور اخباروں کی شہ سرخیوں میں جب یہ سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تو سارا شہر ہی صدمے میں ڈوب گیا۔

بیرسٹر صاحب کی شہرت بہت اچھی تھی۔ وہ ایک نیک نام اور ہر دل عزیز شخص تھے۔ لوگوں کی ہم دردیاں ان کے اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ تھیں۔

پولیس پوری تندہی سے نامعلوم قاتل کی تلاش میں لگی ہوئی تھی کہ دو دن بعد ایک اور خبر نے شہر میں تہلکہ مچا دیا۔

ناصر شاہ کو پولیس نے اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس خبر کو پڑھنے اور سننے والوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی' خاص طور پر وکلا برادری اور قانون دان طبقہ اس خبر سے حیران و پریشان رہ گیا تھا' کورٹس اور بار روم وغیرہ میں اسی قتل کے حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔

ہر کوئی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسی سراسیمگی کے ماحول میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تھی' لوگوں کا خیال تھا کہ مقدمہ کافی طول پکڑے گا اور فیصلہ جلدی نہیں آئے گا' لیکن عدالت میں مقدمہ چلنے کے بعد ہی تیسری خبر بھی شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ عدالت نے ناصر شاہ کو اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سنا دیا ہے اور بیرسٹر صاحب نے اس فیصلے کے خلاف کسی قسم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

بیرسٹر ناصر شاہ کے بارے میں آنے والی خبروں نے لوگوں کے ذہنوں میں کئی سوالات پیدا کر دیئے تھے لیکن ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک شخص تھا جس کے پاس ان معاملات کا جواب تھا وہ شخص تھا بیرسٹر ناصر شاہ جو خاموش تھا۔ اس نے اپنی زبان پر قفل ڈال رکھا تھا۔

بیرسٹر ناصر شاہ تقریباً پچاس برس کا ایک باوقار اور وجیہہ شخص تھا۔ ان کی بیوی پینتالیس سال کی ایک خوبرو عورت تھیں۔ ان کی شادی کو پچیس سال ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا' بیٹی کی شادی ہو چکی تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک مقیم تھی جبکہ بیٹا غیر شادی شدہ تھا۔

بیوی کی رفاقت میں پچیس سال کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد بیرسٹر صاحب کا اپنی بیوی کو قتل کر دینا ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات تھی۔ انہوں نے عدالت میں اپنے دفاع میں ایک لفظ نہیں کہا تھا بلکہ بھری عدالت میں اقبال جرم کر لیا تھا اور اس طرح عدالت نے انہیں پھانسی کی سزا سنا دی تھی۔

عدالت کے فیصلے پر عمل درآمد میں دو دن باقی تھے اس دوران حسب روایت پھانسی کی سزا پانے والے قیدی سے اس کی آخری خواہش کے بارے میں پوچھا جاتا ہے بیرسٹر صاحب سے بھی جب ان کی آخری خواہش کے بارے میں پوچھا گیا تو ان کے ہونٹوں پر اچانک ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی اور انہوں نے پوچھا کیا واقعی میری آخری خواہش پوری کی جائے گی؟"

ان کے سامنے بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ اور جیلر کا خیال تھا کہ بیرسٹر صاحب اپنی وصیت یا وارثوں کے بارے میں کچھ کہیں گے یا پھر کسی قریبی عزیز یا دوست سے ملنے کی خواہش کا اظہار کریں گے۔

مجسٹریٹ نے کہا "اس کا انحصار آپ کی خواہش پر ہے۔ ایسی خواہش جو اندرون ملک چوبیس گھنٹوں میں پوری ہو سکتی ہو اس پر ضرور عمل درآمد کیا جائے گا۔"

"پھر تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ میں ایک معزز شخص کے ساتھ ان کے گھر میں ڈنر کرنا چاہتا ہوں' بس یہی میری آخری خواہش ہے۔"

مجسٹریٹ کو قیدی کی یہ خواہش بہت عجیب لگی' کیونکہ اب تک کسی بھی سزائے موت کے مجرم نے ایسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس نے ایک نظر جیلر پر ڈالی اور پھر ناصر شاہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے اس شخص کا نام بتا دیں جس کے ساتھ آپ ڈنر کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں اس ملک کے صدر صاحب کے ساتھ ڈنر کرنا چاہتا ہوں۔" بیرسٹر ناصر شاہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو مجسٹریٹ اور جیلر دونوں ہی چونک پڑے۔

ناصر شاہ نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ میری یہ آخری خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔"

مجسٹریٹ کو حیرت تو ہوئی تھی مگر اس نے سوچا کہ مجرم کی خواہش انوکھی تو ضرور ہے مگر ناقابل عمل نہیں ہے' یہی سوچ کر اس نے اپنے رجسٹر میں مجرم کی آخری خواہش نوٹ کر لی اور اس پر ان کے دستخط لے کر چلا گیا۔

عدالت کے حکم پر فوری طور پر صدر مملکت کو پھانسی کی سزا پانے والے قیدی کی آخری خواہش کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا' اور صدر محترم نے بھی قیدی کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوسرے دن رات کا کھانا قیدی کے ہمراہ کھانے کی منظوری دے دی۔

رات کے نو بجے تھے صبح پانچ بجے مجرم کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ صدر محترم کی رہائش گاہ میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی ڈشیں رکھی جا چکی تھیں' صدر محترم اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تھے تبھی بیرسٹر ناصر شاہ کو سیکورٹی گارڈز اندر لے آئے۔

قیدیوں کے مخصوص لباس میں ملبوس اپنے ہم عمر شخص کو دروازے سے اندر آتے دیکھ کر صدر محترم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مہمان کا استقبال کیا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد ناصر شاہ نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتارا اور پھر اسے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگا لیا

اور سامنے بیٹھے ہوئے صدر محترم کو بغور دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟'' صدر صاحب نے کہا۔

''ان طویل سالوں میں آپ میں بہت کم تبدیلیاں آئی ہیں۔ آپ شاید مجھے نہیں پہچانے.....'' بیرسٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم.....کون ہو تم؟''

''میں ناصر شاہ ہوں۔ آپ اپنے خلاف ہونے والے مقدمہ قتل کے وکیل کو بھول گئے۔'' ناصر شاہ بول رہا تھا اور صدر محترم آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہو تم۔'' صدر صاحب نے بھویں چڑھا کر غصے سے کہا۔ ''آخر کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔ ''آپ اپنی یادداشت پر زور ڈالیں تو میں آپ کو یاد آجاؤں گا۔'' وہ چند لمحے ٹھہر کر بولا۔

''ویسے بیس پچیس سال کا عرصہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ اس عرصے میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔''

''مجھے کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' صدر صاحب نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''چپ چاپ کھانا کھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''آپ شاید بھول گئے ہیں کہ میں عدالت کے حکم پر آپ کا مہمان بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' بیرسٹر نے پرسکون اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں جب تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھالیتا اس وقت تک مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔''

''لیکن عدالت نے تمہیں ان فالتو باتوں کے لیے نہیں بھیجا۔ چپ چاپ کھانا کھاؤ اور جاؤ یہاں سے۔ میرا تم سے اور تمہارے ماضی سے کوئی واسطہ نہیں۔''

''واسطہ تو بہت ہے مگر آپ شاید سچ کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے ہیں۔'' ناصر شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کی موجودہ بیوی بہت خوبصورت ہے۔ ان کی خاطر ہی آپ نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کیا تھا۔''

''بکو مت۔'' صدر صاحب غصے میں کھڑے ہو گئے۔ وہ آگے کچھ نہیں بول سکے پھر وہ ہاتھ ملتے ہوئے کچھ سوچ کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

بیرسٹر ناصر شاہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''گھبرائیے نہیں' اب آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وقت آپ کی مٹھی میں ہے' جبکہ میرا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ میری زندگی کے محض چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ پھر اس زمین پر میرا وجود بھی نہیں رہے گا۔ جبکہ آپ اسی شان وشوکت سے اپنے اس محل میں عیش کرتے رہیں گے لیکن یاد رکھیے آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں اللہ نے مجھے ہی ذریعہ بنایا تھا۔''

''تم کیا بکواس کر رہے ہو مجھے نہیں پتا۔'' صدر صاحب نے غرا کر کہا۔

''وہ میرے کیریئر کا آغاز تھا۔'' بیرسٹر ناصر شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پچیس سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے' لیکن اس زمانے کی ایک ایک بات مجھے اچھی طرح یاد ہے' میں آپ کے مقدمہ قتل کا سرکاری وکیل تھا۔

''آپ کی ماں کے کپکپاتے ہونٹ اور ان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی گرمی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ گرم آنسو اس وقت میرے ہاتھوں پر گرے تھے جب انہوں نے میرے ہاتھ تھام کر روتے ہوئے مجھ سے آپ کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔

میں ان کے لاچار چہرے کو دیکھ کر کانپ گیا تھا۔ ایک ماں کے آنسوؤں نے میرے فرض پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا تھا کہ آپ ان کے گھر کے واحد چراغ ہیں' اگر آپ کو سزا ہو گئی تو وہ کہیں کی نہیں رہیں گی۔ ان کی باتیں سن کر اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے رحم آ گیا تھا اور تب میں نے سوچا تھا کہ عدالتوں میں روزانہ ہی قتل' اقدام قتل' چوری' ڈکیتی اور دہشت گردی کے سیکڑوں مقدمات سنے جاتے ہیں اور عدالت کے کمرے میں سرکاری وکیل اور وکیل صفائی ڈرامائی انداز میں اپنے اپنے دلائل دیتے ہیں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے۔

ایک جانب سے ملزم کو بے گناہ اور دوسری جانب سے
ملزم ٹھہرانے کے لیے طرح طرح کے ثبوت اور گواہ
یے جاتے ہیں اور یہ گواہ بھری عدالت میں قرآن پاک
اٹھا رکھ کر قسم کھاتے ہیں کہ جو کچھ کہیں گے سچ ہی کہیں گے
اس حلف کے بعد وہ بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتے
جاتے ہیں۔ دونوں جانب کے وکیل مقدمہ جیتنے کے
جھوٹے ثبوت اور گواہ پیش کرتے ہیں اور انصاف کی کرسی
بیٹھا ہوا جج بھی ان پیشہ ور گواہان سے آشنا ہونے کے
جود ان کے بیانات پر یقین کرنے پر مجبور ہوتا ہے' جس
تیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل مجرم عدالت سے باعزت بری
جاتا ہے۔''

اتنا کہہ کر بیرسٹر ناصر شاہ ذرا دیر کے لیے رکے پھر ایک
ر صدر صاحب کی طرف ڈال کر بولے۔ ''لیکن صدر
حب آپ کے کیس میں آپ کے بری ہو جانے کی قطعی
ئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ آپ کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود
ے' جنہیں دنیا کی کوئی عدالت جھٹلا نہیں سکتی تھی لیکن میں نے
یا ایک ماں کے آنسوؤں نے میرے دل میں اچانک رحم
جذبہ پیدا کر دیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ جب سیکڑوں
رم سارے ثبوتوں کے ہوتے ہوئے بھی عدالت سے
زت بری ہو کر شہر کی سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں تو ایک
ر سہی۔ یہی سب سوچ کر میں نے عدالت میں وہ سارے
وت پیش نہیں کیے اور جان بوجھ کر اپنے دلائل کمزور رکھے
کہ آپ کے وکیل کو فائدہ پہنچے اور وہ مقدمہ جیت جائے اور
ر ابھی یہی مقدمہ آپ کا وکیل جیت گیا اور آپ اپنی بیوی
کے قتل کے جرم سے بری کر دیئے گئے۔''

ناصر شاہ نے رک کر ایک بار پھر صدر صاحب کو بغور
یکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ میری وکالت کے پیشے
ں پہلی ہار تھی' لیکن اس ہار کے باوجود میں جیت
لیا تھا۔ کیونکہ یہی تو میں چاہتا تھا کہ آپ بری ہو جائیں' وہ
مرے پیشے کا ابتدائی دور تھا اور آپ بھی اپنی عملی زندگی کے
ابتدائی دور سے گزر رہے تھے اور سیاست کے میدان میں
قدم جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ نے ایک مشہور
اور دولت مند سیاست دان کی اکلوتی اپاہج اور خود سے کئی گنا
بڑی لڑکی سے شادی کی تھی' اس سے شادی کر کے آپ اپنے
مقاصد میں کامیاب رہے تھے' پھر آپ کو اپنی موجودہ بیوی
سے محبت ہو گئی' ایسے میں اگر آپ دوسری شادی کرتے یا اپنی
بیوی سے علیحدگی حاصل کرتے تو آپ کے سیاسی کیریئر کو
نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ اس کی دولت سے بھی محروم رہ
جاتے۔

''اس لیے آپ کو اسے راستے سے ہٹانا ضروری
ہو گیا تھا۔ لہٰذا آپ نے ایک دن موقع پا کر اسے راستے سے
ہٹا دیا۔'' ناصر شاہ نے یہاں تک ہی کہا تھا کہ تب اچانک
صدر صاحب نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس کرو تمہاری فضول باتیں برداشت سے باہر ہیں۔''

''یہ فضول باتیں نہیں ہیں۔'' ناصر شاہ نے بدستور دھیمے
لہجے میں کہا۔

''لیکن اب پچیس سال پرانی باتیں سنا کر تم کیوں میرا
وقت ضائع کر رہے ہو' میں تو کہتا ہوں ان باتوں کا کوئی فائدہ
نہیں' اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی سزا کی بات کرو' کیا تم مجھ
سے معافی کی اپیل کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' ناصر شاہ نے کہا۔

''تو کیا تم پچھلی باتیں دہرا کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتے
ہو۔'' صدر صاحب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''اگر بلیک میل کرنا ہوتا تو میں بہت پہلے کر چکا ہوتا۔''
ناصر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میرے پاس
بلیک میل کرنے کا بہت اچھا موقع تھا' جب آپ صدارت کی
کرسی پر بیٹھنے والے تھے اور میرے سامنے بھی زندگی کے کئی
جوان سال پڑے تھے۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو آپ کو
بلیک میل کر کے عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا لیکن اب تو
میری زندگی کے صرف آخری چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں۔
ایسے میں بھلا آپ کو بلیک میل کر کے میں کیا کروں گا۔''

''تو پھر تمہاری ان فضول باتوں کا مقصد کیا ہے؟'' صدر
صاحب نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں دنیا سے جاتے جاتے آپ کو ایک بڑے پتے کی بات بتانا چاہتا ہوں' جو انسان ظاہر میں جیسا نظر آتا ہے اندر سے وہ ایسا نہیں ہوتا' اس کے لیے میں آپ کو آپ کی ہی مثال دیتا ہوں کہ آپ اس وقت ملک کے سب سے معزز اور انتہائی قابل احترام شخصیت ہیں' کروڑوں لوگوں کی قسمت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے لیکن سچ پوچھیے تو آپ ایک قاتل ہیں اور اس عہدے کے اہل نہیں ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم۔'' صدر صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔ ''اپنی زبان کو لگام دو ورنہ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔''

''آپ یقیناً صرف اپنے ایک اشارے پر میری زبان اور میری کھال کھینچ سکتے تھے لیکن اس وقت آپ ایسا کچھ نہیں کر سکتے' کیوں کہ میں اس وقت اس وقت انصاف اور قانون کی ایک امانت کے طور پر یہاں موجود ہوں' اس لیے آپ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے' اب آپ دھیان سے میری بات سنیے میں کیا کہہ رہا تھا کہ ملک کے صدر کو ایک ایماندار' مخلص اور دیانت دار شخص ہونا چاہیے' ایسا شخص جس کا ماضی اور حال برائیوں سے پاک ہو' جبکہ آپ کے دامن پر خود اپنی بیوی کے خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاست کے اس کھیل میں بھی آپ نے نہ جانے کتنے لوگوں کو قربانی کا بکرا بنایا ہوگا اور کتنے ہی مخالفین کو موت کی نیند سلایا ہوگا۔''

''سیاست کے کھیل میں یہ سب چلتا ہے' بیرسٹر صاحب۔'' صدر صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کسی مقام پر پہنچنے کے لیے لوگوں کو قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ اپنی بیوی کے قتل کا الزام مجھ پر ثابت نہیں ہوا تھا اور عدالت نے مجھے باعزت بری کر دیا تھا۔ جب کہ تم اس وقت ایک سزا یافتہ مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھے ہو اور چند گھنٹوں کے بعد تمہیں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا' اب بتاؤ مجرم تم ہو یا میں۔''

''یہی تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں' جو شخص ظاہر میں جو نظر آتا ہے وہ اندر سے ویسا نہیں ہوتا بیرسٹر ناصر شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ مجرم ہوتے ہوئے بھی مجرم نہیں ہیں اس میں اپنی بیوی کا قاتل نہ ہوتے ہوئے بھی قاتل ہوں۔''

''کیا مطلب.....؟ اگر تم قاتل نہیں ہو تو تمہیں عدالت نے سزا کیوں دی ہے۔ تم تو نامی گرامی وکیل ہو تم اپنا دفاع کیوں نہیں کیا؟'' صدر نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمہارے دل میں چور تھا' تم جانتے تھے کہ تم بھری عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکو گے' اسی لیے تم نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔''

''آپ اور یہ دنیا چاہے جو بھی سوچے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنا یہ مقدمہ بھی میں نے ہی جیتا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا تو صدر صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔

''کمال ہے پھانسی کی سزا پانے کے بعد بھی یہ کہہ رہے ہو کہ تم اپنا مقدمہ جیت گئے ہو۔''

بیرسٹر ناصر شاہ نے کہا۔ ''لوگوں نے صرف مجھے مقدمہ ہارتے دیکھا ہے لیکن اس ہار کے پیچھے چھپی ہوئی میری جیت کو نہیں دیکھا۔ میں ہر قیمت پر اپنی من چاہی جیت چاہتا تھا..... جو میں نے حاصل کر لی۔''

''ٹھیک ہے۔'' صدر صاحب بولے۔ ''میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری جیت ہوئی ہے لیکن اس جیت کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ تمہیں تو اس کے باوجود پھانسی ہونے والی ہے اور تمہاری موت کے بعد تمہاری اولاد کو سوائے بدنامی اور رسوائی کے اور کیا ملے گا؟''

یہ سن کر بیرسٹر کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔ ''میرے ہارے ہوئے مقدمے کے پیچھے چھپی ہوئی میری جیت صرف محسوس کرنے کی چیز ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار مقدمے لڑے ہیں' جن میں صرف دو مقدمات ہی ایسے ہیں جو میں نے جان بوجھ کر ہارے ہیں لیکن میں انہیں بھی اپنی ہار نہیں مانتا' کیونکہ ان کا فیصلہ میری مرضی کے عین مطابق ہوا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ یہ

ں مقدمات میں نے دو عورتوں کے آنسوؤں کے سیلاب
بہہ کر ہارے ہیں اور یہ بھی اتفاق ہے کہ وہ دونوں مائیں
ں۔"

"کیا مطلب؟" صدر صاحب چونکے۔

"مطلب یہ کہ ان میں سے ایک عورت آپ کی ماں تھی
رو رو کر مجھ سے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی مانگ رہی تھی
دوسری بدنصیب عورت میرے اکلوتے بیٹے کی ماں تھی
ی میری بیوی جو مجھ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی رہی کہ اس کی
ت کی ذمہ داری اس کے اکلوتے بیٹے پر عائد نہ ہو۔"

"اوہ.....!" صدر صاحب نے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ
کہ تمہارا بیٹا اپنی ماں کا قاتل ہے اور اسے بچانے کے لیے
نے یہ جرم اپنے سر لیا ہے۔"

"نہیں نہ ہی میرا بیٹا اپنی ماں کا قاتل ہے اور نہ ہی میں
نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔" ناصر شاہ نے کہا۔

"تو پھر تم نے اعتراف جرم کیوں کیا؟" صدر صاحب
نے کہا۔ "تم تو ایک بہت قابل وکیل ہو عدالت میں تم اپنی
را اپنے بیٹے کی بے گناہی ثابت کر سکتے تھے۔"

"وہ ایک حادثہ تھا' حالات اور واقعات میرے بیٹے
و قاتل ثابت کر رہے تھے' اس لیے میں نے قتل کا جرم اپنے
ر لے لیا' تا کہ میرے بیٹے پر قتل کا الزام ثابت نہ ہو۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔" صدر صاحب نے کہا۔ "جب
ہاری بیوی کی موت ایک حادثہ تھی تو تمہارے بیٹے پر اس
تل کا الزام کیوں عائد ہوتا۔"

"اس حادثے نے اچانک ہی کچھ ایسے حالات اور
فاقات پیدا کر دیئے تھے کہ میری بیوی کی اتفاقیہ موت قتل
کا رخ اختیار کر گئی۔ ناصر شاہ نے دھیرے سے کہا۔ "اور اس
تل کے جرم میں میرے بیٹے کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس
کو کافی ثبوت بھی مل جاتے' جس کی وجہ سے اسے سزا سے
چانا میرے لیے شاید ناممکن ہو جاتا اور اسی لیے اسے بے
اغ رکھنے کے لیے میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟" صدر صاحب نے پوچھا۔
"وہ کیا حادثہ تھا؟"

"میں یہ بات کسی کو بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن سوچتا ہوں
کہ جب میری زندگی کے صرف چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں
تو آپ کو وہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" یہ کہہ کر
ناصر شاہ نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔

"اولاد کا دکھ بہت بڑا دکھ ہوتا ہے اولاد کی ہٹ دھرمی اور
ضد اکثر اوقات ماں باپ کی موت کا سبب بھی بن جاتی
ہے۔ میرے بیٹے کی یہی ہٹ دھرمی میری بیوی کی موت
کا سبب بن گئی۔ لاڈ پیار میں پلے بڑھے ہمارے بیٹے نے
جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو برے دوستوں کی صحبت میں
پڑ گیا اور ایک بدنام زمانہ کال گرل کی محبت میں گرفتار ہو گیا'
ان کے پیار و محبت کی کہانی جب ہمارے کانوں تک پہنچی تو ہم
نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا' اس
آوارہ لڑکی نے اس پر کچھ ایسا جادو چلایا تھا کہ وہ ماں باپ اور
خاندان کی عزت کی پروا کیے بغیر اس سے شادی کرنے کی ضد
کرنے لگا اور اس روز تو اس نے اپنی ماں کو دھمکی دی کہ اگر ہم
لوگوں نے اسے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کی اجازت نہ دی
تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا' جس پر اس کی ماں نے اس کی
منت سماجت کی لیکن جب وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تو اس کی
ماں غصے میں کچن سے چاقو اٹھا لائی اور بیٹے کو دھمکی دی کہ
اگر اس نے ضد نہیں چھوڑی تو وہ ابھی اور اسی وقت خودکشی
کر لے گی۔"

"اس وقت تم کہاں تھے؟" صدر صاحب نے پوچھا۔
کیا یہ سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا؟"

"نہیں میں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔" بیرسٹر نے
کہا۔

"ٹھیک ہے اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں جب گھر واپس آیا تو میری بیوی کمرے کے فرش
پر خون میں لت پت پڑی تھی اور ایک خون آلود چاقو دو فٹ
کے فاصلے پر زمین پر پڑا تھا۔"

"کیا اس وقت تمہارا بیٹا وہاں موجود نہیں تھا؟" صدر
صاحب نے پوچھا "اور کیا تمہاری بیوی مر چکی تھی؟"

"نہیں اس وقت میری بیوی اپنی زندگی کی آخری

سانسیں لے رہی تھی اور میرا بیٹا میری کار کی آواز سن کر اور خون آلود چاقو وہیں پھینک کر کھڑکی کے راستے بھاگ نکلا تھا۔'' ناصر شاہ نے دھیرے سے کہا۔ ''میری بیوی نے اپنی آخری سانسوں کے دوران مجھے قسم کھا کر یہ بتادیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خودکشی کی دھمکی دے کر اپنی بات منوانا چاہتی تھی اور بیٹا اپنی ماں کی دھمکی سے گھبرا کر اس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ چاقو پھینک دے' وہ اس کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہے لیکن ماں کو اس کے پچھلے وعدوں کی طرح اس وعدے پہ بھی اعتبار نہیں آرہا تھا' اسی لیے وہ اس پر مزید دباؤ ڈالنے کے لیے چیخ کر بولی نہیں تو جھوٹ بول رہا ہے اور بس اسی درمیان میں وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں ٹیبل سے ٹکرا کر گر پڑی اور اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تیز دھار چاقو اس کے پیٹ میں گھس گیا۔'' یہاں تک کہہ کر بیرسٹر زرار کا تو صدر صاحب نے فوراً کہا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''میرا بیٹا اپنی ماں کو فرش پر گرتے دیکھ کر گھبرا گیا۔'' بیرسٹر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''اصل میں نہ تو وہ اپنے ماں باپ کا دشمن تھا اور نہ ہی خاندان کی عزت کا وہ تو صرف ہم پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوانا چاہتا تھا لیکن ماں کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ اپنی ماں کو بچانے کے لیے لپکا' اس نے اپنی ماں کے پیٹ میں گھسے ہوئے چاقو کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور ماں سے لپٹ کر رونے لگا' اس سے معافیاں مانگنے لگا اور کہنے لگا کہ ماں تم ٹھیک ہو جاؤ گی میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا' یہ سب میری ضد کی وجہ سے ہوا ہے مجھے معاف کردو اب میں ایسی ضد نہیں کروں گا' کبھی اس لڑکی سے نہیں ملوں گا' بولتے بولتے بیرسٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

تبھی میری کار کی آواز سن کر وہ گھبرا گیا اور اپنی ماں سے یہ کہہ کر کہ پاپا مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مجھے جیل بھجوادیں گے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' اور پھر ماں کے روکنے کے باوجود وہ کھڑکی سے لان میں کود کر بھاگ نکلا۔

جب وہ کھڑکی سے لان میں کود رہا تھا تو اس وقت میں سامنے کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تھا' میں اسے کھڑکی کے راستے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا' لیکن اس پیچھے جانے کی بجائے میں نے اپنی بیوی کی طرف دھ دیا تھا جس کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں اور اس نے مجھے تھا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور اس کا بیٹا بے قصور ہے۔ نے مجھے قسم دی کہ اس کے بیٹے پر کوئی آنچ نہ آئے' اس قتل کا الزام بیٹے پر عائد نہ ہو ورنہ اس کی پوری زندگی ہو جائے گی۔''

''تو یہ جرم تم نے قبول کرلیا' مگر کیوں؟'' صدر صاحب نے کہا۔

''کیونکہ میں ایک باپ ہوں۔ میں نے اپنی دم توڑتی ہوئی بیوی سے یہ آخری وعدہ کیا تھا کہ ہمارے اکلوتے بیٹے کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

مجھ سے یہ وعدہ لے کر میری بیوی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی میں بڑی دیر تک سکتے کی حالت میں وہیں بیٹھا رہا' ایک طویل رفاقت کے بعد میری بیوی زندگی کے سفر میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی' ان سالوں میں وہ میری زندگی اور میرے وجود کا لازمی جز بن چکی تھی' اس کے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے دشوار تھا' میں سوچ رہا تھا اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

پھر میں نے اس چاقو کی طرف دیکھا جس کے دستے میرے بیٹے کی انگلیوں کے نشان تھے' جب اس نے ماں کے پیٹ سے چاقو باہر نکال کر پھینکا تھا تو اس کی انگلیوں کے نشان اسے قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔'' اتنا کہہ کر ناصر شاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولا صدر صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر کیا کیا تم نے؟''

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' ناصر شاہ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''اپنی بیوی سے کیا ہوا آخری وعدہ نبھانے کے لیے میرے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو شک کے دائرے میں نہ آنے دوں' اس لیے میں نے اس چاقو

سے اس کی انگلیوں کے نشانات مٹا دیئے' اپنی ماں کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے اس کے جوتے بھی خون آلود ہو گئے تھے' اور جب وہ میری گاڑی کی آواز سن کر گھبرا کر بھاگا تھا تو اس کے جوتوں میں لگے ہوئے خون کے دھبے فرش سے ہوتے ہوئے کھڑکی کی چوکھٹ پر بھی پڑ گئے تھے' میں نے گیلے کپڑے کی مدد سے وہ سارے داغ دھبے صاف کر دیئے۔

کھڑکی کے باہر لان میں جس جگہ وہ کود اتھا وہاں بھی اس کے جوتوں کے نشانات تھے' میں نے بڑی احتیاط سے وہاں کی مٹی کو بھی برابر کر دیا تھا۔

پھر لان میں ہی ایک گڑھا کھود کر خون آلود چاقو اور کپڑے کے اس ٹکڑے کو جس سے میں نے فرش وغیرہ کو صاف کیا تھا' اسی گڑھے میں دفن کر دیا' اس کے بعد میں گھر کے اندر آ گیا۔

سارے ثبوت ضائع ہو چکے تھے' میں چاہتا تو مجھے اتنی محنت کی ضرورت ہی نہیں تھی' ہاتھ میں خون آلود چاقو لے کر میں سیدھا خود کو پولیس کے حوالے کر کے اقرار جرم کر لیتا لیکن تفتیش کے دوران پولیس میرے بیٹے کو گرفتار کر لیتی کیونکہ تمام حالات اسے قاتل ثابت کر رہے تھے۔

پولیس کو اطلاع میں نے ہی دی تھی' اور انہیں یہ بتایا تھا کہ میری اور میرے بیٹے کی غیر موجودگی میں کسی نامعلوم شخص نے یہ کارروائی کی ہے۔''

پولیس نے حسب معمول لاش کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی تصاویر بنائیں' پھر جائے وقوع کا معائنہ کیا اور آلہ قتل تلاش کرنے کے علاوہ کمرے میں کسی تیسرے شخص کی انگلیوں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی پھر مجھ سے چند سوالات کرنے کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

میرا بیٹا بہت ڈرا ہوا تھا' اس نے رو رو کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کی اور وہی کچھ بتایا جو اس کی ماں مجھے بتا چکی تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بے قصور ہے اور ہر حال میں اسے پولیس کے شک سے دور رکھنا تھا۔ پھر دوسرے دن جب پولیس تفتیش کا رخ اس کی جانب موڑنے والی تھی' میں نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر خود اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف کر لیا اور ثبوت کے طور پر میں نے وہ خون آلود چاقو جس پر میری انگلیوں کے نشانات موجود تھے' پولیس کو پیش کر دیے۔

پولیس کو اس سے بڑا ثبوت اور کیا ملتا' مجھے گرفتار کر لیا گیا اور میرا بیٹا محفوظ رہا' میری بیوی کی خواہش یہی تھی کہ اس کا بیٹا محفوظ رہے۔''

یہاں تک کہہ کر بیرسٹر ناصر شاہ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر بولا۔

''میں اب چلتا ہوں' میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا مجھے آپ کو یہ بتانا تھا کہ ایک ماں کے آنسوؤں میں کتنی طاقت ہے۔''

یہ کہہ کر بیرسٹر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

صدر صاحب آنکھیں پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

دوسرے دن نیوز چینلز اور اخبارات میں بیرسٹر ناصر شاہ کے بارے میں ایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والی خبر چاروں اطراف پھیل گئی' وہ یہ تھی کہ.....!

صدر مملکت نے بیرسٹر ناصر شاہ کی سزا نہ صرف معاف کر دی بلکہ ان کی فوری رہائی کا حکم بھی دے دیا تھا۔

لوگ حیران ہو رہے تھے کہ بیرسٹر صاحب نے کسی بھی ذریعے سے صدر صاحب سے معافی کی درخواست نہیں کی تھی۔ ان سے رحم کی کوئی اپیل نہیں کی تھی' اس کے باوجود صدر محترم نے انہیں معاف کر کے آزاد کر دیا تھا' اور یہی بات موضوع بحث بنی ہوئی تھی کہ آخر صدر مملکت نے ایسا کیوں کیا؟

مگر اس کیوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 13

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جارہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہورہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہورہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کرسکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر.....وہ خوف.....تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

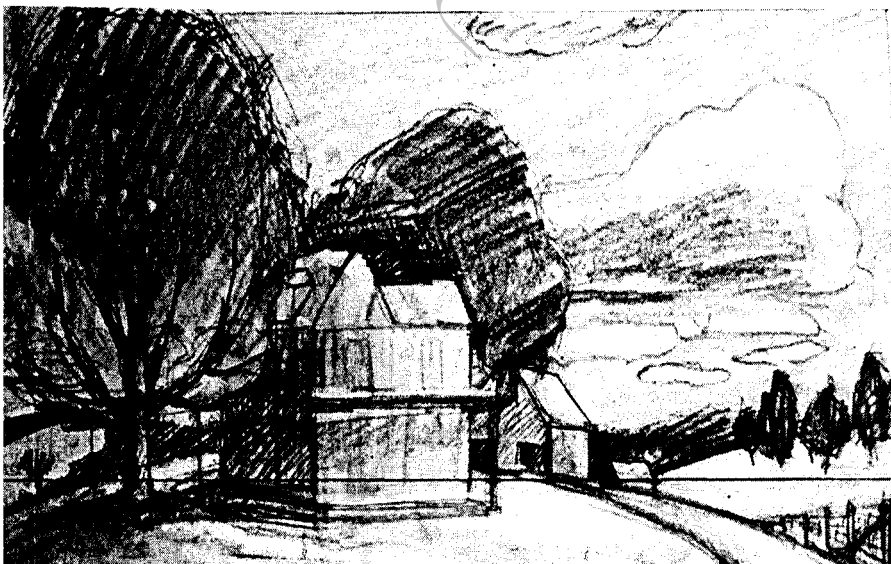

تیمور بہادر یار جنگ ان کی سمت خاموشی سے دیکھ رہا تھا نظروں میں تحفظ اور اس کے گرد اطمینان میں لپٹی ایک خاص کیفیت تھی مگر شہاب کو دیکھ کر وہ تیمور کی موجودگی کو جیسے لمحہ بھر کو بھول گئی تھی۔

''تم کیوں آئے یہاں پر جاؤ یہاں سے۔'' وہ بولنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق سے آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی اس نے کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

تیمور اس کی آنکھوں کا خوف محسوس کر کے مڑا تھا اور اس نے شہاب کی سمت دیکھا تھا شہاب اس کی آنکھوں کے غیض وغضب سے ڈر کر اپنے قدم واپس لینے لگا تھا اور مڑ کر وہاں سے نکل گیا تھا تب تیمور نے تسلی کر کے اس کی سمت دیکھا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے عین سے پوچھا تھا کہ وہ خوفزدہ تو نہیں اور اس نے اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے اپنے اندر ایک گہرا اطمینان محسوس کیا تھا تیمور نے قدم بڑھا کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا اب، خوف زدہ تو نہیں؟'' اس کا بھاری لہجہ بھرپور تحفظ کا احساس دیتا تھا۔

''اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کسی خوف کے زیر اثر ہوں؟'' عین نے مدہم لہجے میں پوچھا تھا تیمور نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی نظریں خاموشی میں بہت کچھ جتاتی لگتی تھیں۔

''اور تم جانتے ہو میں مشکل میں ہوں تو دور کیوں جاتے ہو؟'' عین نے تب شکوہ کرتے ہوئے پوچھا تھا تیمور نے سر ہلایا تھا۔

''میں دور نہیں جاتا مجھے علم ہے آپ اکیلی ہیں جب تک آپ میری ذمہ داری ہیں میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

''مگر تم تو کھو گئے تھے اس ٹرین میں مجھے تنہا چھوڑ کر۔'' اس نے شکوہ کیا تھا تیمور نے سر ہلکے سے نفی میں ہلایا تھا۔

''میں کھویا نہیں تھا نواب زادی آپ کے آس پاس تھا میں دور رہ کر نظر رکھے ہوئے تھا مجھے احساس تھا کہ آپ کو سہارے کی ضرورت ہے۔'' وہ جتاتے ہوئے بولا تھا عین نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا پھر بولی تھی۔

''تیمور تمہیں ساتھ رہنا چاہیے یہ کوئی جواز نہیں کہ تم ساتھ ہوا اور دکھائی نہیں دیتے تم ساتھ ہو تو تمہیں دکھائی بھی دینا چاہیے مجھے اس طور یہ تعلق الجھا دکھائی دیتا ہے تم ڈھال جیسے ہو مضبوط نہ ڈرنے والے نہ جھکنے والے اتنے مضبوط کہ تمہیں دیکھ کر ہر خطرہ دم دبا کر بھاگ جائے تم خطرات کو ڈر کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہو تیمور، تمہارے ساتھ رہ کر ڈر کا احساس جاتا رہتا ہے۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھی، تیمور نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا اس کی آنکھوں کی چمک حیران کن تھی وہ مضبوط دکھائی دینے والا شخص اس کا ہاتھ تھامے جھکا ہوا تھا۔

''آپ سے سفر میں ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا نواب زادی میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔'' بھاری آواز عین کے گرد پھیلی تھی۔

''تم وعدہ خلاف نہیں ہو تیمور تم وعدہ خلافی نہیں کر سکتے اس بات کا یقین ہمیں ہے مگر ہم جانے کیوں پریشان ہو جاتے ہیں آپ آس پاس نہیں ہوتے۔''

''اور میں آپ کو اس دوری میں بھی طاقتور دیکھنا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں آپ نرم و نازک جھولتی ہوئی بیل بنیں جس کو اپنی مضبوطی کے لیے کسی تناور درخت کو تلاش کرنا پڑے آپ اتنی کمزور نہیں ہیں عین النور دیکھیے آپ نے شہاب سے اپنے طور پر نمٹ کر جتا دیا نا کہ آپ کتنی مضبوط ہیں۔'' تیمور نے سمجھایا تھا۔

''اور میں بیل جیسی نرم و نازک بھی نہیں ہوں تیمور مجھے اپنی طاقت کا اندازہ کرانے کے لیے تشکرات، میں نے اپنی چھپی ہوئی ہمتوں کو مجتمع کرنا تم سے سیکھا ہے تم نے یقیناً مجھے زندگی کا گہرا راز دیا ہے۔'' عین نے کہا

تھا۔

''یہ راز ہمیشہ سے آپ کی مٹھی میں موجود تھا عین میں نے صرف آپ کو احساس دلایا ہے میں نے آپ کی مٹھی کی طاقت سمجھائی ہے بنا آپ کی مٹھی کھولے اور دکھائے کہ اس میں کیا راز دبا ہے۔'' اور عین اس کی آنکھوں میں چپ چاپ جھانکنے لگی تھی۔

''تیمور۔'' اس نے خاموشی سے پکارا تھا۔

تیمور اس کی سمت دیکھتا رہا تھا اور وہ جیسے اپنی سوچوں کی نفی کرتی ہوئی سر انکار میں ہلاتی ہوئی بولی تھی۔

''بہر حال کوئی شے ہے جو اپنا ادراک کراتی ہے۔'' وہ جیسے الجھ کر بولی تھی۔

''اور وہ شے کیا ہے عین؟ کیا آپ الجھنوں کا شکار ہیں؟''

''نہیں میں الجھنوں کا شکار نہیں ہوں، تم دکھائی دیتے ہوا الجھنوں کے غول بھی جیسے معدوم ہونے لگتے ہیں؟'' عین نے بنا جھجکے کہا تھا۔

''الجھنوں کے بگولوں سے خوفزدہ ہونا ٹھیک نہیں عین، میں آپ کو ہر صورت میں مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مگر میں مضبوط نہیں ہوں تیمور ایسی صورت حال میں تو بالکل نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہنے لگے تھے تیمور نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا اور ہاتھ اس کی سمت بڑھا کر انگلیوں کی پوروں سے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے تھے۔

''نئی سمتوں کی جانب بھاگتے راستوں پر ڈر کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے عین النور۔'' تیمور نے سمجھانا چاہا تھا عین نے بھیگی پلکوں سے دیکھا تھا۔

''میں ڈر سے خوفزدہ نہیں رہی تیمور جو میں نے دیکھا اس کے بعد ڈر ایک معمولی لفظ بن کر رہ جاتا ہے، میں نے اپنوں کی خون میں لت پت لاشیں دیکھی ہیں ان کی ٹوٹی سانسیں دیکھی ہیں ان کے زندگی سے بھرے جسموں کو زندگی سے خالی ہوتے دیکھا ہے تیمور وہ ڈر ان تمام سے بہت بڑا تھا میں کبھی ان کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اماں جان..... ابا جان..... دادی جان..... میں نے کب سوچا تھا میں ان کے..... بنا کبھی جیوں گی۔''

اس کا لہجہ مرجھایا ہوا اور کم ہمت تھا جیسے وہ زندگی سے خالی کوئی وجود تھا جیسے اس کا زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

جیسے وہ کوئی ادھ موا وجود تھی اور اس کی آواز کسی دلیس میں کھو گئی تھی۔

''عین النور آپ بہت بہادر ہیں آپ عام لڑکیوں جیسی نہیں ہیں آپ نے جو دیکھا ہے اور جس طرح خود کو سنبھالا ہے اس صورت حال کو سنبھالا وہ معمولی بات نہیں ہے آپ نے اپنی عزت اور آبرو کو ان بھوکے بلوائیوں کی ہوس سے محفوظ رکھا ہے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آپ ان کے ساتھ لڑائی کر کے محفوظ رہی ہیں اور اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہیں۔'' تیمور نے اس کا حوصلہ بندھانا چاہا تھا مگر وہ سر جھٹکتی ہوئی بولی تھی۔

''نئی سمت نئی منزلوں کا جنوں مجھے نہیں تھا تیمور، مجھے ان سمتوں میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ روانہ ہونا تھا میرے لیے وہ بات خاص تھی مگر کتنا قہر ٹوٹا رمضان کے پاک اور بابرکت مہینے میں مسلمانوں کا قتل عام اور اسلام کی بیٹیوں کی آبروریزی، یا اللہ یہ قہر آزمائش کی کوئی گھڑی تھی یا سوچی سمجھی سازش۔'' وہ سوچ کر بے چین ہوئی تھی۔

''عین یہ سب ایسا ہونا شاید لکھا تھا جب بھی اس زمین کا بٹوارہ ہوتا ایسا ہی ہوتا تھا بٹواروں میں ہوس پرستی جنم لیتی ہی ہے، صورت حال کا فائدہ اٹھانے کئی نکل کھڑے ہوتے ہیں اب تم ان کو سازشوں کا حصہ کہو یا جو بھی مگر ان کا جو مقصد تھا انہوں نے اس ہدف کو تمام کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے بٹوارہ جب بھی ہوتا صورت حال یہی ہونا تھی۔'' تیمور نے سمجھایا تھا۔

''اور بٹوارے عزتوں پر ضرب کیوں لگاتے ہیں

بٹواروں کا مقصد صرف زمینوں کی تقسیم کیوں نہیں، جو لوٹ کھسوٹ بٹوارے کے نام پر مچی کیا یہ جائز تھی؟'' وہ درد سے نڈھال لہجے میں بولی تھی۔

''جائز تو کچھ بھی نہیں تھا نواب زادی، نہ اس زمین پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام نہ انگریزوں کا یہاں آنا اور اس قدر طویل قیام کرنا اس تسلط سے بنائی گئی کالونیوں سے اٹھائے جانے والے فوائد یہ سب اور اس کے بعد کی ہر صورت حال کچھ بھی جائز نہیں تھا مگر یہ قتل عام غم و غصہ کے باعث ہوا یہ بات ہم سب جانتے ہیں جو قومیں مسلمانوں کی غلامی میں جیتی رہی انہوں نے یکدم سر اٹھایا اور سازشیں بن گئیں بہر حال تقسیم نے ایک شدید نفرت کی ایک بھیانک صورت دکھائی اور منظر کشی کی کسی معاشرے میں تقسیم کے وقت ایسی صورت حال نہ رہی ہوگی اگر دیکھا جائے تو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم نے بھی ایسی تباہی نہ پھیلائی یہ بے حسی صرف اس برصغیر کی زمین پر ہی دکھائی دی نفرت کا کوئی علاج نہیں نفرت جب بڑھتی ہے تو بہت شدت اختیار کرتی ہے اور یہ شدت بہت بھیانک منظر کشی کرتی دکھائی دیتی ہے۔'' تیمور نے اسے سمجھا کر پر سکون کرنا چاہا تھا جیسے مگر وہ الجھ گئی تھی۔

''نفرت ایسی بھیانک کیوں ہوتی ہے تیمور؟''

''کیونکہ نفرت محبت کے ہمراہ نہیں چلتی۔'' تیمور نے بتایا تھا۔

''نفرت محبت کے ہمراہ چلتی تو ایسی بھیانک نہ ہوتی۔'' عین نے سوال داغا تھا۔

''نفرت محبت کے ہمراہ نہیں چل سکتی عین النور محبت نڈر ہے اور نفرت بزدلانہ فعل اور کوئی نڈر کسی بزدل کا سامنا نہیں کر سکتا سو نفرت محبت کے مقابل کھڑی نہیں ہو سکتی۔'' تیمور نے وضاحت دی تھی اور وہ خاموش ہو کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی، پھر مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''دل پر بہت بوجھ ہے تیمور میرے پاس بیٹھ جاؤ تم سے دو چار باتیں کروں گی تو دل سنبھل جائے گا۔'' وہ نڈھال لہجے میں بولی تھی۔ تیمور چونکا تھا۔

''یہ کیسا بوجھ ہے نواب زادی، کس بات کا افسوس آپ کو مارے ڈال رہا ہے۔'' وہ خاموش رہی تھی پھر مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''ہم نے شہاب کو مار ڈالا ہے تیمور، ہم نے اسے چلتی ٹرین سے دھکا دے ڈالا ہے ہم نے کسی کی جان لی ہے اس کے ارادے اچھے نہیں تھے اس کی میلی نظریں ہمیں کاٹ کھانے کے درپے تھیں ہم ان کو جھیلتے جھیلتے تھکنے لگے تھے سو ہم نے اس کی جان لے لی ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے تیمور مگر عزت اور آبرو کے لیے کرنا پڑا عزت بچا کر نکلے تھے عزت کیسے گنوا دیتے۔'' وہ بے بسی سے بولی تھیں اور تیمور نے انہیں شانے سے تھام لیا تھا۔

''مجھے آپ پر فخر ہے نواب زادی، آپ بہت بہادر لڑکی ہیں مگر شہاب جیسے لوگ بلوائیوں کا بھیانک روپ ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بلوائی ایسی کسی صورت حال کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور ایسے لوگ لمحوں کی چوری کرتے ہیں دونوں کا فعل بزدلانہ ہوتا ہے ایک صورت حال بنا کر پھر اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا سدباب کرتا ہے اور دوسرا پہلے سے بنی صورت حال کا فائدہ اٹھاتا ہے آپ نے شہاب کو اس کے انجام تک پہنچا کر کچھ غلط نہیں کیا اس کے لیے کوئی پچھتاوا نہیں ہونا چاہیے آپ بس اتنا سمجھئے وہ انہی بلوائیوں میں سے کوئی ایک تھا اور آپ نے وہی کیا جو آپ کو کسی بھی بلوائی کے ساتھ کرنا چاہیے تھا ایک دوشیزہ کی آبرو سے قیمتی کچھ نہیں ہے عین آپ نے اپنی عزت کے لیے جو اقدام کیا وہ کسی گناہ کے دائرے میں نہیں آتا خود کو سرزنش مت کریں آپ نے کوئی قتل نہیں کیا شہاب کو اس کی نیت اور حوس نے مارا ہوس بہت بری شے ہے چاہے مال و دولت کی ہو یا نفس کی بندے کو مار دیتی ہے سو شہاب اپنی موت آپ مرا ہے وہ اسی لائق تھا۔'' تیمور نے اسے جیسے اس احساس جرم سے نکالنا چاہا تھا عین نے ڈبڈباتی

آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو تیمور؟'' اور تیمور نے سر ہلایا تھا۔

''یا اللہ تیری دنیا کیسی گنجل ہے۔''

''آپ کو ایسی گنجل دنیا میں رہنے کی عادت خود کو ڈالنا ہے عین۔'' تیمور نے دلاسہ دیا۔

''ایسی کیوں ہے دنیا تیمور تمام لوگ اچھائی سے آشنا کیوں نہیں اور تمام برے دل تو یہ کیوں نہیں کر لیتے۔'' وہ جیسے عجیب وحشت سے ہمکنار تھی۔

''دنیا صرف اچھے لوگوں سے بنی جگہ نہیں ہے عین النور اللہ نے دنیا میں ہر طرح کے لوگ آباد کیے ہیں ان کے دل اور باغ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں سو تمام لوگ اچھے درختوں کی طرح اچھا پھل نہیں لاتے مگر جو برا پھل لاتے ہیں وہ کاٹے جاتے ہیں اور آگ میں ڈالے جاتے ہیں ہم انسان بس درختوں کی مانند ہیں ہماری حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے۔'' تیمور نے اسے اس احساس پشیمانی سے نکالنا چاہا تھا اور وہ خاموشی سے دیکھنے لگی تھی پھر بولی تھی۔

''قیامت کے روز شہاب کا خون ہماری گردن پر ہوا تو ہم اپنے اماں ابا اور دادی جان سے ملنا چاہتے ہیں تیمور، وہ جنتی لوگ ہیں ضرور بہشت میں جائیں گے ہم مرنے کے بعد ان سے ملنا چاہتے ہیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم بہشت میں جائیں تبھی ان سے ملنا ممکن ہوگا۔'' وہ عجب غم میں مبتلا تھی۔

''آپ نیک انسان اور باوقار لڑکی ہیں عین اگرچہ ہم اخذ نہیں کر سکتے کہ ہمارا کون سا فعل یا عمل ہمیں بہشت کے دروازے پر لے جائے گا یا کون سا عمل دوزخ کی آگ میں جلائے گا اور ہم میں سے کتنے صرف اس صراط مستقیم پر چلتے ہوئے خوف میں مبتلا رہیں گے کہ اگر ہم دوزخ کی آگ میں گر گئے تو جل کر بھسم ہو جائیں گے اس سب کے متعلق ہم صرف قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں بہتر ہوگا ہم ان معاملات کو اللہ پر ڈال دیں اور صرف اچھے اقدام کریں صرف نیک اور صالح انسان ہی جنت کے حقدار ہوں گے سو ان معاملات کو چھوڑ کر ہمیں اللہ کی رضا کو پورا کرنا چاہیے تیمور نے گویا بہترین راہ دکھائی دی تھی وہ خاموشی سے دیکھتی رہی تھی پھر ہاتھ بڑھا کر تیمور کو چھونا چاہا تھا اور اس کے ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا تھا اور تیمور جیسے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

عین حیرت سے جلتی آنکھوں سے تیمور کو ڈھونڈنے لگی تھی۔

''کیا ہوا بیٹی کس کو ڈھونڈتی ہو تم۔'' اس کے ہمراہ بیٹھی خاتون نے پوچھا تھا اور عین انہیں چونکتے ہوئے دیکھنے لگی تھیں۔

''لو پانی پی لو، تمہارے لیے ان بزرگ حضرت سے مانگ کر لائی ہوں، ان کی اپنی ضرورت کے لیے ناکافی تھا مگر بتایا کہ ایک بچی کو تیز بخار ہے اور پیاس سے بلک رہی ہے تو فوراً انہوں نے پانی دے دیا اچھے لوگوں کی کمی نہیں خاتون نے کہہ کر اس کی پیشانی چھوئی تھی اور فکرمندی سے اسے دیکھا تھا۔

''اللہ آپ کا جسم تو ابھی بھی بخار سے پھنک رہا ہے کیا کروں آپ ہماری گود میں سر رکھ کر لیٹیں ہم پٹیاں کرتے ہیں امید ہے اس سے بخار کم ضرور ہوگا۔'' خاتون نے کہا تھا اور اس نے ان کے ہاتھ سے کٹوری لے کر لب تر کیے تھے پھر ان کو کٹورا تھما دیا تھا اور خود ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھیں اور آنکھیں موند لی تھیں پورا وجود جیسے سلگتا محسوس ہوا تھا ٹرین مخصوص رفتار سے چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

''تیمور تم کہاں ہو تمہارے بنا یہ سفر بہت مشکل لگ رہا ہے تیمور ہم بہت تھکن محسوس کر رہے ہیں پتا نہیں ہم پاکستان پہنچ بھی پائیں کہ نہیں ابا جان چاہتے تھے ہم پاکستان ضرور پہنچیں مگر شاید ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے جلال بھائی آپ کہاں ہوں گے پتا نہیں آپ

بقید حیات بھی ہیں کہ نہیں، یا اللہ ہم کیا کریں کیسے تنہا ہوگئے ہیں ہم بٹوارے نے سارا کنبہ چھین لیا ہم سے رشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہمیں تنہا کر دیا ایک دوست کا سہارا تھا مگر اب وہ بھی میسر نہیں تیمور جانے کہاں ہیں آپ۔'' وہ الجھی سوچوں کے ساتھ اس قدر سوچ سکی تھی۔

❁.....❁.....❁

رات کے جانے کس پہر کھٹکا ہوا تھا خوش نما کی آنکھ کھل گئی تھی کوئی اس کی چارپائی سے ہو کر اندر کی طرف بڑھا تھا جانے کون تھا وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی ان بزرگ خاتون کو جگانا چاہتی تھی مگر وہ بہت فاصلے پر تھیں اور ان کے خراٹوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ گہری نیند میں تھیں خوشنما نے ڈر کے مارے آنکھیں جھپک کر دھڑکنوں پر قابو پانا چاہا تھا وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائی تھی کہ کیا کریں یا کیسے ان خاتون کو انفارم کریں کہ گھر میں کوئی داخل ہوگیا ہے وہ اٹھی تھیں اور دروازے کے پاس سے کلہاڑی اٹھانے کے لیے مڑی تھیں۔

جب کسی نے پیچھے سے آ کر سرعت سے اسے تھاما تھا خوش نما کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا کسی بھاری ہاتھ والے نے اس کے منہ کو دبوچ لیا تھا وہ احساس کر چکی تھی کہ وہ کسی نئی مصیبت میں پھنس چکی تھی اس نے بامشکل خود کو چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نرم و نازک لڑکی تھی اس کی کوشش ناکام رہی تھی وہ چیخ نہیں سکتی تھی۔ شور نہیں مچا سکتی تھی کہ وہ بے بس تھی کسی کے گھر پناہ لینا اسے مہنگا پڑا تھا۔

کسی پر اعتبار کرنا ایک برا تجربہ ثابت ہوا تھا۔ دنیا جیسے جنگل بن گئی تھی اس کے لیے، اس کے لیے اس جنگل سے زیادہ محفوظ جگہ جیسے وہ کوٹھا رہا تھا جہاں رہ کر اس کی عزت محفوظ رہی تھی جہاں وہ آبرو سمیت جیتی رہی تھی برے لوگوں اور برائی میں رہ کر اس کے لیے عزت محفوظ رکھنا اس قدر مشکل نہیں تھا جتنا مشکل اسے اس کوٹھے کو چھوڑ کر ہوا تھا ایک بری جگہ اس کی عزت محفوظ تھی اور شریفوں کے درمیان اسے اپنی عزت کے لیے چھیننا جھپٹی کرنا پڑ رہی تھی دنیا اسے عجیب طرح سے نوچ رہی تھی۔

''یا اللہ میری عزت کو محفوظ رکھ۔'' اس نے صدق دل سے دعا مانگی تھی تبھی خاتون کی آواز آئی تھی۔

''اوئے کون ہے، عمر تو آیا ہے بول تو آیا ہے نا؟'' اماں نے پوچھتے ہوئے روشنی کی تھی اور عمر کا چہرہ واضح دکھائی دیا۔

''خالہ کوئی چور ہے یہ مجھ پر حملہ آور ہونے کو تھا وہ تو اچھا ہوا میں نے اسے دبوچ لیا دیکھ اس کے ہاتھ کلہاڑی بھی ہے۔'' عمر نے مڑ کر کہا تھا اس نے متواتر خوشنما کو تھاما ہوا تھا خاتون نے اسے گھر کا تھا۔

''چھوڑ دے لڑکی کو چور نہیں ہیں یہ جانتی ہوں اسے۔'' خاتون نے ڈپٹا تھا تو عمر نے خوش نما کو چھوڑ دیا تھا۔

''کم عقل نہ ہو تو لے بھلا تجھے یہ لڑکی چور لگی ہے مہمان ہے ہماری روایت ہے مہمان داری نبھانا۔ کوئی چل کر آئے تو ہم اسے گھر میں پناہ دیتے ہیں تو کہاں کا دانشمند ہے چل جا اندر خبردار تو آج کے بعد اس بچی کو کچھ کہا جب تک یہ یہاں رہے گی تو اس کی ہوا کی بھی خبر نہیں لے گا چل ہٹ یہاں سے اب معذرت کر اور اپنی راہ لے۔'' خالہ نے ڈپٹا تھا عمر نے خوشنما کو بغور جانچتے ہوئے دیکھا تھا۔

''شکل سے تو چور ہی لگتی ہے خالہ مان نہ مان کہیں آپ کو قتل کر کے اپنی راہ نہ لے جائے خدا ترسی میں کسے گھر میں پناہ دے دیتی ہیں آپ کی عقل اور دل دونوں کو خدا سمجھے زمانہ بدل گیا ہے۔'' وہ خالہ کو الزام دیتے ہوئے بولا تھا خوش نما نے اسے دیکھا تھا۔

''چھ فٹ سے لمبا قد مضبوط جسم وہ اس کی گرفت میں موجود ہل نہیں سکی تھی کھڑے نقوش اور بھوری آنکھوں والا وہ نوجوان جانے کون تھا مگر وہ خوشنما پر اعتبار نہیں کر رہا تھا وہ خالہ کے گھورنے پر مڑ کر اندر بڑھ

یا تھا خالہ نے اسے دیکھا تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں بیٹا عمر کی وجہ سے تمہیں ست اٹھانا پڑی میرے مرحوم شوہر کا بھانجا ہے۔ برنش ری میں بھرتی ہوا تو میرا گھر قریب تھا سو وہ یہاں نے جانے لگا میں تو اکیلی ہوتی ہوں سو اس کا آنا بہت لگتا ہے گھر میں کوئی اولاد تو ہے نہیں میرے لیے یہی بیٹے جیسا ہے بہت خیال رکھتا ہے میرا۔'' خالہ نے کہا تھا اور خوشنما گہری سانس لیتی ہوئی چارپائی پر گئی تھی مگر لیٹ کر آسمان کو گھورتے ہوئے وہ بہت دیر ک سو نہیں پائی تھی۔

اسے جانے کیوں بے تحاشا خوف محسوس ہوا تھا س طرح اسے تھاما تھا اور اس کا منہ دبوچ کر اسے لنے سے باز رکھا تھا اس پر وہ خوفزدہ ہوگئی تھی جانے الہ نے جو کہانی سنائی تھی وہ سچ بھی تھی کہ نہیں اور یہ جوان کون تھا جانے اس کی حقیقت کیا تھی اسے خالہ اصی پر اسرار لگی تھیں اس نے لیٹے لیٹے ان کی طرف گاہ کی تھی تاروں کی روشنی میں وہ سوتی دکھائی دی تھیں سی پر اعتبار کرنا کیسا مشکل تھا۔

وہ اس کیفیت کا شکار پھر نہیں ہو سکی تھی سو اس نے مان لی تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ کوئی بہانہ کر کے وہاں سے نکلنا چاہے گی۔

''تم سوئی نہیں؟'' خالہ کی آواز سن کر وہ چونکی تھی خالہ اس کی سمت آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھیں۔

''وہ، میں.....نیند.....!'' وہ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ گویا س کا شک درست تھا وہ خالہ پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی خالہ کی کہانی کچھ اور تھی شاید۔

''سو جاؤ بچی عمر اب باہر نہیں آئے گا اسے عادت ہے کمرے میں سونے کی فوجی ہے بیرکوں میں رہنے کی عادت ہے اسے، کٹھن لائف جیتا رہا ہے معذرت خوا ہوں تمہیں اس کی وجہ سے زحمت اٹھانا پڑی۔'' خالہ نے نرم لہجے میں کہا تھا وہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''خالہ مجھے صبح نکلنا ہوگا۔'' اس نے خوف کے مارے لب تر کرتے ہوئے مدعا بیان کیا تھا اس کا انداز فیصلہ کن تھا مگر خالہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور اس کی طرف دیکھا تھا جیسے انہیں اس کی بات ناگوار گزری تھی خوش نما ان کے انداز پر چونک پڑی تھی۔

''کہاں جانے کا سوچ رہی ہو تم۔'' وہ سختی سے پوچھنے لگی تھیں۔ خوشنما ان کے لہجے کی سختی سے حیران ہوئی تھی اور فوری طور پر کچھ نہیں بول پائی تھی خالہ نے جانے کیوں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گی اب یہیں رہو۔'' وہ حتمی انداز میں بولی تھیں اور خوش نما حیرت سے پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی تھیں اگر یہ حکم محبت سے شفقت بھرے لہجے میں دیا جاتا تو شاید وہ حیران نہ ہوتی مگر ان کا لہجہ ایسا سخت گیر تھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے ایک عجیب سا خوف اس کے اندر سرایت کیا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ ہوں خالہ میرا فی الحال کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے کہیں نہیں جا سکتی آپ جانتی ہیں آپ پر اعتبار کر کے یہاں پناہ لی ہے۔'' اس نے سمجھ داری سے انہیں سمجھانا چاہا تھا اور بنا ان کی سمت دیکھے کروٹ بدل گئی تھی اس نے دیکھنا ضروری خیال نہیں کیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کیا تاثر تھا یا وہ کیا سوچ رہی تھیں مگر خوش نما کو ایک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آسمان سے گھری تھی اور کھجور میں آن اٹکی تھی یہ محاورہ اس پر پورا ہوا تھا اس کا دل خوف سے بھر گیا تھا اس خوف میں فی الحال اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا فی الحال وہ سوچ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے گی اور اس کا اگلا لائحہ عمل کیا ہوگا وہ سوچنے کا عمل کر کے آنکھیں موند گئی تھی۔

❁.....◈.....❁

رات کے پچھلے پہر جلال کی آنکھ کھلی تھی وہ اٹھ کر باہر آیا تھا تبھی اس نے چوکیدار کو گیٹ کھولتے دیکھا تھا اور اس کھلے گیٹ سے گاڑی کو اندر آتے دیکھا تھا فتح النساء نے گاڑی سے قدم نکالے تھے اور چلتی ہوئی اس کی سمت آئی تھی۔

''خیریت آپ اس وقت یہاں؟'' جلال نے ان کو تشویش سے دیکھا تھا فتح النساء نے تمام تر اختلاف ایک طرف رکھ کر ان کو دیکھا تھا۔

''ہمیں آپ کی فکر ہو رہی تھی ہم سو نہیں پا رہے تھے۔'' وہ اپنے محسوسات ظاہر ہونے کی پروا کیے بنا بولی تھیں اور جلال نے سر ہلا دیا تھا۔

''ہم خیریت سے میں فتح النساء فکر کی ضرورت نہیں ہے؟'' جلال نے پرسکون انداز میں کہا تھا تبھی وہ بولی تھیں۔

''ہمارے آپس کے اختلافات اپنی جگہ جلال مگر ہم آپ کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتے جو کچھ ہوا ہے ہمیں اس کا گہرا افسوس ہے جو کچھ نواب چاچا اور اہلخانہ کے ساتھ ہوا وہ قابل مذمت بلوائیوں نے جو کیا وہ افسوسناک ہے مگر اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ ایک سازش لگتی ہے جلال آپ اختیار میں آ جائیں تو چچا جان کا خون رائیگاں مت جانے دیجیے گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی اور جلال نے فتح النساء کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

''ہمیں خبر ہوئی ہے آپ نے کانگریس میں شمولیت کا اعلان کیا ہے یہ فیصلہ بروقت اور بہترین فیصلہ ہے جلال ہماری مخالفتیں اپنی جگہ مگر اس معاملے میں ہم آپ کی حمایت کرتے ہیں کہیں یہ تمام سازش سراج الدولہ کی رچائی ہوئی تو نہیں۔'' وہ خدشے کے پیش نظر بولی تھی جلال نے سر انکار میں ہلا دیا تھا اور مدہم لہجے میں بولا تھا۔

''فی الحال اپنی بقا سے ضروری کچھ نہیں لگ رہا ہم اپنی بقا کو ضروری اس لیے بھی خیال کر رہے ہیں کہ اقتدار ہمیں ایٹ لسٹ اس قابل کر دے گا کہ ہم ان مسائل کے انبار سے نکل کر کچھ سوچنے کے قابل ہو جائیں گے ہم اپنے اباؤ اجداد کی نشانیوں کو اس طرح کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتے اگر ہم یہاں سے پاکستان کے لیے بھی روانہ ہوتے تب بھی ان نشانیوں کو حکومت کے حوالے نہیں کرتے ابھی تو ہم یہاں موجود ہیں بہت جگ ہنسائی ہوگی اور ابا جان کے جانے کے بعد ہم ان کی اس قدر جگ ہنسائی نہیں جھیل سکیں گے لوگ ہمیں نالائق اولاد کہیں یہ ہمیں قبول ہے مگر کوئی ابا جان کے خلاف ایک حرف کہے وہ ہم قبول نہیں کر پائیں گے۔'' جلال مضبوط لہجے میں بولے تھے تب فتح النساء نے جانے کیوں ان کے ہاتھ کو تھاما تھا شاید وہ ہمدردی کا کوئی احساس تھا جو اس لمحے ان کو جلال سے باندھ گیا تھا وہ شاید اسے احساس دلانا چاہتی تھیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔

''آپ کی ہمدردی اور اس وقت آمد کا شکریہ فتح النساء مگر آپ کو اب واپس جانا چاہیے۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولا تھا فتح النساء نے جانے کس کمزور لمحے کے تحت ایک قدم بڑھا کر ان کے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔

''ہم الگ سہی مگر اس اختلاف میں بھی آپ کے حق میں برا نہیں چاہتے اللہ آپ کو ہر برائی اور شر سے محفوظ رکھے ہم اس کڑے وقت میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے کچھ بھی ہو مگر ہم خود کو نہیں روک سکے۔'' وہ مدہم لہجے میں بھیگی پلکوں کے ساتھ بولی تھیں جلال نے ان کے گرد اپنی بانہوں کا حصار نہیں باندھا تھا مگر ان کو خود سے الگ بھی نہیں کیا تھا۔

''ہم اپنے کاندھوں پر بہت سی ذمہ داریاں محسوس کرتے ہیں فتح النساء، ہمیں اپنی ہمشیرہ عین النور کی فکر بھی ہو رہی ہے ہمیں پاکستان ہائی کمیشن کو فون کر کے ان کے متعلق بھی پوچھنا ہے ہم سراج الدولہ کے سپوت حیدر سراج الدولہ پر اس درجہ اندھا اعتبار نہیں کر سکتے اگرچہ ابا جان نے تیمور کو عین کے ہمراہ روانہ کیا ہے مگر پھر بھی ہمیں عین کی بہت فکر ہو رہی ہے ان دنوں میں ہم ان سے مکمل غافل رہے ہیں مگر حالات نے ہمیں اس قدر الجھا دیا تھا کہ ہم کچھ سوچ ہی نہیں سکے۔'' وہ مدہم لہجے میں بولے تھے فتح النساء نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا تھا۔

''حیدر کے ذکر پر وہ کچھ تلخی کے ساتھ اس کی سمت دیکھنے لگا تھا اور فتح النساء نے اس کے شانے سے ہاتھ ہٹایا تھا اور پھر اس کی سمت دیکھے بنا اس سے دور ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی جانے کے لیے پلٹی تھی۔

''سنیں۔'' جلال نے اسے بے ارادہ پکارا تھا وہ رک گئی تھی مگر فوری طور پر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا جلال نے انہیں بغور دیکھا تھا پھر نرمی سے بولے تھے۔

''رات گہری ہوگئی ہے آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہم چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس نے کہا تھا مگر فتح النساء نے پلٹ کر ان کو دیکھا تھا۔

''ہم آپ کو مشکل میں الجھا نہیں دیکھ سکیں گے جلال آپ کا یہیں رکنا مناسب ہے اگرچہ اس محل میں بھی آپ محفوظ نہیں ہیں مگر ایک بڑے فیصلے کے بعد آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''آپ ہماری فکر نہ کریں ہم ڈرائیور پر بھروسہ کر سکتے ہیں وہ آپ کے وفادار ملازموں میں سے ہیں ہمیں صحیح سلامت حکمت چچا کے ہاں پہنچا دیں گے۔'' فتح النساء نے یقین دلایا تھا۔

جلال نے سر ہلایا تھا اور فتح النساء گاڑی کی سمت بڑھ گئی تھی موٹر گاڑی کے گیٹ سے نکلنے کے بعد وہ محل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ آئے تھے ہال سے گزر رہے تھے جب فون بجا تھا وہ چلتے ہوئے فون کی طرف آئے تھے۔

''السلام علیکم۔'' دوسری طرف مرزا سراج الدولہ تھے۔

''برخوردار پوچھنا تھا کہ آپ خیریت سے ہیں ہمیں بہت تشویش ہو رہی تھی حالات بگڑ گئے ہیں ایک طرف بلوائیوں نے دھنگا مچایا ہے اور دوسری طرف سازشی بھی آپ کے پیچھے ہیں شاید ان کو اندازہ ہو گیا ہے کہ نواب صاحب کے بعد آپ آسان شکار ہیں سو وہ آپ کے پیچھے مکروہ کھیل کھیل کر جال بنتے رہیں گے آپ سنبھل کر رہیے نواب صاحب کے بعد ہمیں آپ کی بہت فکر ہے۔'' انہوں نے رکھ رکھاؤ میں مروتاً کہا تھا جلال نے سر ہلایا تھا۔

''تشکرات چچا جان ابا کے بعد آپ سبھی ہیں جن کا سہارا ہے ورنہ حریفوں نے تو ٹھان لیا تھا کہ ہمارا ناطقہ بند کر دیں گے۔'' جلال راہ و رسم میں گویا ہوا تھا۔

''بہر حال ہمیں آپ کی بہت فکر ہے خود کو اکیلا مت سمجھیے نواب صاحب کے گزر جانے کے بعد ہم آپ کو تنہا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔'' مرزا صاحب بولے تھے اور جلال نے مروتاً ان کا شکریہ ادا کیا تھا اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا دیکھنے کا نظریہ یکسر بدل کر رہ گیا تھا جب ابا زندہ تھے تو جلال کو دنیا کا اس قدر تجربہ نہیں تھا ان کے دیکھنے کا نظریہ وہ نہیں تھا جو اب تھا انہوں نے ابا کے جانے کے بعد دنیا کو گویا جانچا اور تولا تھا اور ان کی سمجھ میں آیا تھا کہ دنیا ایک جنگل سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ کہ والدین کے سائے کے بنا دنیا کس قدر ویران ہے انہوں نے پلٹ کر سامنے کی دیوار پر نگاہ ڈالی تھی جہاں ابا کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔

''ابا جان آپ کے اصولوں کے ساتھ آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں ہم اگر کہیں کچھ بھول چوک ہو جائے تو معاف کر دیجیے گا مگر ہمارا نصب العین آپ کی دکھائی گئی راہ پر چلنا ہے ہم پاکستان بھی ضرور جائیں گے مگر ٹھیک وقت کے آنے پر یہاں رہ کر بہت سے معاملات کو سلجھانا اور راہ راست پر لانا ضروری ہے۔'' وہ ایک عزم سے بولا تھا اور پھر آنکھوں میں آئی نمی کو پونچھا اور فوراً پلٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

❁.....❁.....❁

''نواب صاحب کے بعد جیسے سازشوں کا جال سا بن گیا ہے اللہ چھوٹے نواب کا حامی و ناصر ہو۔'' بوا نے کہا تھا تو فتح النساء نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا وہ سوچوں میں الجھی ہوئی تھیں ان سے مل کر بھی وہ ان کی

فکر میں مبتلا تھیں۔

''آپ پریشان ہیں فتح النساء؟'' وہ بوا کے گھٹنے کی مساج کر رہی تھی جب انہوں نے پوچھا تھا انہوں نے پریشان ہوتے ہوئے بھی سر نفی میں ہلایا تھا۔

''ہمیں یقین ہے کہ جلال ان الجھنوں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے یہ وقت اگر چہ کڑی آزمائش ہے مگر اس مشکل وقت سے ان کو سیکھنے کا موقع ملے گا وہ جو سبق اس وقت سے سیکھیں گے وہ ان کو ایک نا قابل تسخیر انسان بنائے گا۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''بے شک مگر بہر حال کڑا وقت بہت بھاری اور مشکل گھڑی پر مشتمل ہوتا ہے اللہ چھوٹے نواب کی مدد فرمائے اور مشکلات کو آسان کرے۔'' بوا بولی تھیں۔

''آمین۔'' فتح کے لب آہستگی سے ہلے تھے اس کے کھوئے کھوئے انداز پر بوا نے فکر مند ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''تم دونوں میں جو تعلق ہے وہ خاص ہے فتح النساء محبت کو جگہ دو دلوں کا میل جانے دو اختلافات رشتوں کا حصہ ہوتے ہیں ان کو زیادہ دیر تک رشتوں کا حصہ رکھنا واجب نہیں اپنے رشتے کو سنبھال کر رکھو سوا سے کسی کی نظر نہ لگے۔'' بوا نے سمجھایا تھا۔

''مگر بوا.....!'' وہ بولی تھیں۔

''عزت نفس، انا، خودداری، وقار، نسوانی تو قیر ان سب کو تو آپ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں رشتوں میں ان کا وجود اضافی لگتا ہے اس کے ہمراہ رشتوں کو سمجھنا ممکن نہیں رشتوں کو سنبھالنا ہو تو عقل کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیجیے اور پھر رشتوں کا مباحثہ کریں رشتوں کو دقیق بنا کر نہیں آسانیاں بخش کر سمجھا جا سکتا ہے دل میں گنجائش نکالنا ضروری ہے اگر دل کاٹھ کباڑ کی مانند بھرا ہوا ہوگا تو محبت کے رکھنے کی جگہ نہیں بنے گی فضول کی باتوں کو ایک طرف نکال کر رکھ دیں اور اس کے بعد رشتوں کو بولنے دیں رشتے اپنے وکیل آپ ہوتے ہیں اپنی طرف داری آپ کرتے ہیں اور ان سے بہتر وکیل کوئی نہیں ہوتا رشتوں کو اعتماد سونپیے رشتے آپ کو بھی مایوس نہیں کریں گے نا جھکنے دیں گے زوجہ اور خاوند کے درمیان کے جھگڑے کوئی وزن نہیں رکھتے فتح النساء ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں مگر اس کے لیے آپ کو دل خالی کرنا پڑے گا اور دل خالی کرنے کا طریقہ آپ کو خود ڈھونڈنا ہوگا۔'' بوا نے سمجھایا تھا اور وہ ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

❀.....◈.....❀

کوئی وقت میں قید کیسے ہوتا ہے یہ خوشنما پر اب کھلا تھا وہ صبح سے شام تک وقت اور موقعے کی تاک میں رہی تھیں مگر وہ لمحہ ان کو میسر نہیں آیا تھا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں یہ کیا طریقہ ہے خالہ، کیا آپ ہمیں اس گھر میں قید کر کے رکھنے کی خواہاں ہیں مگر ہم نے تو پناہ لی تھی نا، خود کو قید میں ڈالنے کی درخواست تو نہیں کی تھی۔'' خوشنما نے ان کے روبرو بیٹھ کر مدعا بیان کرنے کی ٹھانی تھی مگر وہ مسکرا دی تھیں اور ان کی اس پراسرار مسکراہٹ کا مفہوم وہ نہیں جان پائی تھی۔

''یہاں سب وقت کی قید میں جی رہے ہیں بیٹی وقت کی قید سے آزادی ممکن نہیں تم نے یہاں پناہ اپنی مرضی سے لی تھی مگر یہاں سے رہائی کے بارے میں تم آزاد نہیں ہو۔'' وہ سفاکی سے بولی تھیں خوشنما ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''لیکن ہم کیوں، ہم یہاں رہیں گے تو آپ کو کیا فائدہ ملے گا آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا۔'' وہ اتنا ضرور جان پائی تھی کہ خالہ کا دماغی توازن درست نہیں ہے وہ نفسیاتی طور پر کچھ کھسکی ہوئی دکھائی دی تھیں مگر وہ ان سے براہ راست اس متعلق کوئی بات نہیں کر سکتی تھی مگر اس نے نرمی سے پوچھا تھا اور خالہ مسکرا دی تھیں۔

''میں بھی تو یہاں رہتی ہوں تم کیوں نہیں رہ سکتیں کیا کرو گی بھاگ کر یا کوئی لٹیرا آن ٹکرائے گا تو پھر کیا کرو گی بھول گئیں بلوائیوں کی پوری فوج تھی تمہارے پیچھے وہ تو اللہ نے کرم کر دیا جو آسمانی بجلی نے تمہیں بچا لیا

اوران لٹیروں کو نگل لیا ورنہ وہ تو تمہیں نوچ کھاتے۔'' انہوں نے فکر کرتے ہوئے کہا تھا خوشنما گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

''خالہ جان ہم آپ کی بات سمجھتے ہیں آپ ہمارا خیال کر رہی ہیں مگر ہم ان کی دنیا میں نہیں رہ سکتے ہمیں پاکستان جانا ہے ہمیں رخصت لینے دیجیے ہم یہاں نہیں رہ سکتے ہم جو منصوبہ بنا کر اور جو سوچ کر گھر سے نکلے ہیں ہم وہ کر کے رہیں گے ہماری زندگی یہاں ان جگہوں، ان گلیوں میں نہیں ہے ہم پاکستان کی آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے سامنے بولی تھی مگر وہ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسے غصے سے گھورنے لگی تھیں۔

''کیا جانتی ہے تو پاکستان کے بارے میں؟'' وہاں جانا آسان ہے کیا، تقسیم کی ایک خبر نے اس جگہ کو بلوائیوں کے لیے تختۂ مشق بنا دیا ایسی جگہ سے بھاگ کر تم کہاں جاؤں گی اور وہاں تک کیسے پہنچو گی تم ٹرین تک بھی نہیں پہنچ سکو گی یہ لوگ تمہیں اپنے ظلم اور بربریت کا شکار بنا لیں گے بچانا چاہتی ہوں تمہیں، تمہیں بیٹی کہا ہے بیٹی کی طرح سنبھال کر رکھنا چاہتی ہوں میری مانو یہیں رکو اور پاکستان کو بھول جاؤ۔''

''کیا وہ یہاں رک کر ٹھیک کر رہی تھی۔'' اس کا دل جانے کیوں تیزی سے دھڑکا تھا اور اس میں خوف زیادہ شامل تھا اس نے ہر احساس اور خیال کو جھٹکتے ہوئے سر نفی میں ہلا تھا۔

''ہم یہاں نہیں رک سکتے آپ برائے کرم سمجھنے کی کوشش کریں۔'' خوش نما نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی خالہ نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا تھا اور پھر شہادت کی انگلی کو اسے نفی میں ہلا کر اسے حتمی طور پر جتا دیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جا سکتی اور اس کے ساتھ ہی وہ گفتگو کو گویا برخاست کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

خوشنما نے گہری سانس لے کر عمر کی طرف دیکھا تھا وہ جانے کیا تھا کون تھا وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی اب تک کھلا نہیں تھا مگر جتنا خوفزدہ اسے خالہ نے کیا تھا اس کے بعد وہ عمر سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر عمر نے اسے جانے سے قبل روک لیا تھا اس نے خوفزدہ ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''ڈرو مت خالہ کی بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے اس کا صدمہ ہے وہ غلط نہیں ہیں وہ تمہیں محفوظ رکھنا چاہتی ہیں یہ ڈر ایک ماں کے دل کا ہے ان کے دماغ پر اثر آیا ہے تم کچھ دن تک رک جاؤ اس کے بعد میں تمہیں یہاں سے نکلنے میں مدد دوں گا خالہ کو اس طرح اچانک چھوڑ کر جانا ان کے دماغ کو مزید اثر انداز کر سکتا ہے تم پڑھی لکھی لڑکی ہو یقیناً تم بات کو سمجھ رہی ہوں گی۔'' عمر نے کہا تھا اس نے سمجھے بنا اسے دیکھا تھا۔

''ہم نہیں جانتے تم کون ہو اور خالہ کی حقیقت کیا ہے مگر یہ سب ہمیں بہت ڈر میں مبتلا کر رہا ہے ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک پائیں گے یہ ہم سے نہیں ہوگا۔'' خوشنما نے کہا تھا عمر نے اسے پرسکون نظروں سے دیکھا تھا۔

''یقین رکھیے یہاں آپ کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوگا یہاں آپ محفوظ ہیں۔'' عمر نے یقین دلایا تھا وہ الجھ کر عمر کو دیکھنے لگی تھی۔

''لیکن آپ سمجھ نہیں رہے ہم یہاں نہیں رک سکتے یہ دنیا وہ نہیں ہے جہاں ہم رہنا چاہتے ہیں ہم پاکستان جا کر زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔'' ہمیں اس طرح پابند مت کریں۔'' وہ ملتجی لہجے میں گویا تھی۔

''مگر آپ غلط سمجھ رہی ہیں محترمہ ہم آپ کو پابند نہیں کر رہے خالہ کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں وہ بیٹی کے صدمے سے نڈھال ہیں خالہ بھی پاکستان جانے کے لیے نکلی تھیں وہ میری منگیتر تھیں ہم نے بھی یہی سوچا تھا کہ پاکستان جا کر زندگی کا آغاز کریں گے مگر ایسا ہو نہیں سکا اور ہمیں یہیں رکنا پڑا ضروری نہیں ہم اپنے سبھی خواب پورے ہوتے دیکھیں کچھ خواب حسرت بن کر دل میں بھی رہ جاتے ہیں۔'' وہ بردباری سے بولا

تھا وہ سلجھے ہوئے مزاج کا نوجوان لگا تھا مگر خوشنما نے اس سے زیادہ بات کرنا گوارا نہیں کیا تھا اور چلتی ہوئی وہاں سے نکل کر چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

❀......❀......❀

"مبارکباد بلآخر آپ کانگریسی بن ہی گئے بہت سرور ملتا ہے جب کوئی مسلم لیگی کانگریسی بنتا ہے۔' مرزا سراج الدولہ نے مبارکباد دی تھی اور جلال مسکرا دیے تھے۔

"چچا جان ہم اصولوں پر سمجھوتہ کرنے والوں میں سے نہیں ہیں یہ وقتی مرہم ہے جو زخم مندمل کرنے کو رکھا ہے زخم ذرا بھرنے دیجیے پھر اس مرہم کی ضرورت نہیں رہے گی۔" جلال نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی تھی مرزا صاحب کھلا کر ہنس پڑے تھے اور بولے تھے۔

"مذاق کر رہے تھے ہم تو دل سے خوش ہیں کہ نواب صاحب کی اولاد اتنی نیک اور صالح ہے ایک ہماری اولاد کو دیکھیے نالائق کہیں کے باپ کو تنہا یہاں چھوڑ کر اکیلے ہی پاکستان کے لیے روانہ ہوگئے آپ جیسی اولاد تو قسمت والوں کو ملتی ہے کیسے اپنے والد محترم کا نام روشن کر رہے ہیں آپ اللہ ضرور آپ کو اس کا اجر دے گا نواب زادے جلال الدین پٹودی آپ خاندانی وقار کو لے کر چلنا جانتے ہیں ہنسی مذاق کی باتیں ایک طرف مگر جو بات قابل ستائش ہے وہ آپ سے کہہ دیتے ہیں۔" وہ مصلحت پسندی سے گویا ہوئے تھے اور جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر حکمت چاچا کی سمت بڑھ گئے تھے حکمت چاچا نے مرزا سراج الدولہ کو آگے بڑھتے ہوئے بغور دیکھا تھا۔

"یہ موصوف کیا فرما رہے تھے ان سے سنبھل کر رہو ہمیں یہ سارے فساد کی جڑ لگتے ہیں آپ کا ان کے قریب رہنا ٹھیک نہیں۔" حکمت چاچا نے سمجھایا تھا۔

"ہم جانتے ہیں چچا جان اتنی پرکھ تو ہے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن ابا جان نے خاص مروت سے ایسے کئی دشمنوں کو اپنے قریب رکھا ہوا تھا۔ مگر ان کی رواداری ان کے کام نہیں آئی سو سبق یہ ہے کہ کسی پر اعتبار کرنا مناسب نہیں ابا جان کے اقدام غلط نہیں تھے ان کا سیدھا اور خالص ہونا بھی ان کے حق میں برا نہیں تھا مگر جہاں جو غلط کرے اسے اس کی سزا دینا ضروری ہے ابا جان کو سراج صاحب کو کورٹ میں گھسیٹنا چاہیے تھا ابا جان معمولی انسان نہیں تھے ان کی عزت کو ملیا میٹ کرنے کا منصوبہ معمولی نہیں تھا اگر ابا چاہتے تو ان کو سزا دلوا سکتے تھے مگر انہوں نے درگزر سے کام لیا مرزا سراج الدولہ صاحب کو معاف کر دیا جو کہ ان کے حق میں ٹھیک ثابت نہیں ہوا، بہرحال ابا جان پر وقار انسان تھے انہوں نے زندگی کو بھرپور انداز میں جتنا جیا عزت سے جیا گیڈر کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوئی ہے ابا کی زندگی قابل رشک تھی اور مرزا چاچا کا انجام یقیناً دور نہیں ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تھا اور حکمت چاچا نے سر ہلایا تھا اور اسے ضروری کاغذات کی فائل تھمائی تھی اور نرمی سے بولے تھے۔

"ہمیں خوشی ہے ہم نے صورت حال کو بروقت سنبھال لیا ہے اب کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اللہ نے آپ کے حق میں سب بہتر کیا ہے آپ کسی منفی سوچ والے کی سن کر دل چھوٹا مت کریں۔" حکمت صاحب نے جلال کو سمجھایا تھا۔

"اب آپ کی وراثت سے آپ کو کوئی دستبردار نہیں کر سکتا نہ آپ کو کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتا ہے اب آپ ہر طرح سے محفوظ ہیں اپنے یہ کاغذات کورٹ میں جمع کرا دیے اور سکون سے بیٹھ جایئے مصلحت کے تحت کیے گئے فیصلے اگرچہ بہت زیادہ خوشی نہیں دیتے مگر ایسے فیصلے زندگی کو کسی قدر سہل ضرور کر دیتے ہیں سو آپ کی موجودہ صورت حال میں بھی ایسا ہی ہوا ہے میں چاہتا ہوں کچھ دن گزریں تو آپ باقاعدہ تقریب منعقد کر کے فتح النساء کو محل میں لے آیئے ہمیں امید ہے وزارت آپ کے ہاتھ ضرور آئے گی قومی اسمبلی

کے ممبر تو آپ بن ہی گئے ہیں اگر وزرا کی فہرست میں آجاتے تو اس سے بہتر کچھ اور نہیں آگے کی منصوبہ بندی فی الحال موقوف کیجیے فی الحال آپ کے کاندھوں پر جو ذمہ داریاں ہیں ان کو پورا کریں۔'' حکمت چاچا نے سمجھایا تھا جلال نے سر ہلایا تھا اور دونوں معمول کی باتیں کرتے ہوئے موٹر گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

❀.....◈.....❀

جلال نے پاکستانی ہائی کمیشن کو فون کر کے نواب زادی کے بارے میں پوچھا تھا مگر بتایا گیا تھا کہ ابھی تک وہ ٹرین پاکستان نہیں پہنچی جس پر وہ بے پناہ تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس نے حکمت کو کال کی تھی۔

''چچا جان عین ابھی پاکستان نہیں پہنچی ایسا تو نہیں کہ وہ ٹرین حادثے کا شکار ہوگئی ہو؟'' جلال نے انتہائی پریشانی سے پوچھا تھا اور حکمت صاحب نے ان کو دلاسہ دیا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا شاید وہ ٹرین کہیں راستے میں رک گئی ہو ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ٹرین لیٹ پاکستان پہنچے۔'' ان کے اکلوتے بیٹے اس ٹرین میں تھے سو وہ کچھ ایسا ویسا سوچنا نہیں چاہتے تھے۔

''مجھے امید ہے وہ دونوں خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں گے۔'' حکمت چاچا نے یقین دلایا تھا جلال نے پریشانی سے کہا تھا۔

''امید کرتے ہیں ایسا ہی ہو چچا جان عین کے علاوہ ہمارے پاس کوئی رشتہ باقی نہیں رہا وہ ہماری ہمشیرہ اور ذمہ داری ہیں ہم ابا کے بعد ان کی ذمہ داری سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتے نا ان کے ساتھ کچھ غلط ہونے دیں گے ہم اختیارات کا بھرپور استعمال کریں گے اگر ایسا ضروری ہوا مگر عین کو کسی مشکل میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔'' جلال نے پرعزم انداز میں کہا تھا۔

''آپ کو بتایا تھا نا کہ مرزا سراج الدولہ کے صاحبزادے یہیں پائے گئے تھے وہ عین بیٹی کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے تھے ہم وجہ تو نہیں جانتے مگر وہ چالاکی سے واپس ہوگئے تھے ہم نے ان کو سراج صاحب کے گھر میں دیکھا تھا شاید ان کے بعد انہوں نے ہوشیاری سے اپنے نالائق سپوت کو پاکستان روانہ کردیا ہو، مگر یہ کوئی کھیل ہوسکتا ہے سو آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی عین بیٹی کو بھی اس سے باخبر کرنے کی ضرورت ہے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور جلال نے ان کی تائید کی تھی۔

''آپ سے متفق ہوں چچا جان مگر جب تک تیمور عین کے ہمراہ ہیں ہمیں تسلی ہے ایک بار عین سے بات ہوجائے اس کے بعد ہمیں سوچنا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' جلال مضبوط لہجے میں بولا تھا اور حکمت صاحب نے ان کو سمجھایا تھا۔

''کوئی قدم جذباتیت میں مت لیجیے گا ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا فی الحال انتظار کریں کہ عین صحیح سلامت پاکستان پہنچ جائیں تاکہ ہم اس کے بعد آگے کا لائحہ عمل مرتب کرسکیں حکمت چاچا نے سمجھایا تھا اور اس نے تسلی کے ساتھ کال کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔

''عین ہماری پیاری بہن کہاں ہیں آپ اللہ آپ کی حفاظت فرمائے آپ کو محفوظ رکھے ہم کسی مشکل وقت میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے چاہے کچھ بھی ہو مگر آپ کے بھائی ہمیشہ آپ کے ہمراہ کھڑے ہوں گے کیونکہ اب ہم بھی ابا جی کی جگہ ہیں اور ایک بھائی کے منصب پر بھی فائز ہوتے ہیں ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اور ہم اپنی ذمہ داریوں سے انحراف نہیں کریں گے۔'' وہ مضبوط لہجے میں خود کو یقین دہانی کرا رہے تھے۔

❀.....◈.....❀

عین نے تڑپ کر آنکھیں وا کی تھیں۔

''جلال..... ہمارے پیارے بھائی ہمارے ماں جائے آپ کہاں ہیں ہمیں آپ کی یاد اس قدر کیوں

ہے ہم آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں اگر یہ زندگی یہیں ہونے کو ہے تو ہم اس سے قبل ایک بار آپ سے ملنا چاہیں گے اپنے پیارے بھائی کو ایک بار دیکھنا چاہیں گے۔" وہ تڑپ کر بولی تھیں بخار سے ان کا م اب بھی متواتر تپ رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو کر یوں سے اٹ گئے تھے ان کی روح جیسے سکون میں کی خاتون نے عین کا ہاتھ تھاما تھا۔

"میں تمہارے لیے کیا کروں میری بچی تمہاری حالت ٹھیک نہیں اس سفر میں کوئی طبی امداد بھی میسر نہیں کیا کیا جائے ہمیں کوئی حل دکھائی نہیں دیتا۔" وہ عین کے لیے بہت متفکر دکھائی دی تھیں عین سے آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں جب کسی خاتون کے چیخنے کی آواز آئی تھی شہاب کی ہمشیرہ اس کے سر پر کھڑی چیخ رہی تھیں۔

"انہیں خبر ہے ہمارے بھیا کہاں ہیں یہ جو بھولی سی صورت بنائے بیٹھی ہیں یہ یقیناً اس سے آگاہ ہیں ہمیں یقین انہوں نے ہمارے بھائی کو کوئی نقصان ضرور پہنچایا ہے ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے ٹرین پاکستان کی حدود میں جیسے ہی داخل ہوگی ہم ان کو داروغہ کے حوالے کریں گے یہ عدالت کی سزا کے لائق ہیں انہوں نے ضرور ہمارے بھائی کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔" شہاب کی بہن کو دو تین بزرگ حضرات نے تھام کر سمجھایا تھا اور سنبھالا تھا ورنہ وہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں۔ بامشکل ان کو سمجھا بجھا کر بٹھایا گیا تھا خاتون نے عین کو دیکھا تھا۔

"یہ خاتون پاگل ہیں جو اس قدر رواویلا کر رہی ہیں ان کو دکھائی نہیں دیتا بچی بیمار ہے اور سر پر چڑھ کر چیخ رہی ہیں ایسے لوگوں کو خدا عقل دے۔" خاتون نے ناگواری سے کہا تھا۔

عین نے بند ہوتی آنکھوں کو بامشکل کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"جلال۔" اس نے ماں جائے کو پکارا تھا۔

"جلال میرے بھائی تمہاری چھوٹی بہن بہت مشکل میں ہے۔" وہ نڈھال سی بولی تھی خاتون نے پانی کا گھونٹ اس کے منہ میں ڈالا تھا اور اس کے خشک لبوں کو تر کیا تھا اور اس کے سر کو اٹھا کر گود میں رکھا تھا پھر اس سر کو ہولے ہولے دبانے لگی تھیں۔

"جلال...... اماں...... ابا جان...... ہم مشکل میں ہیں ہم...... ہم مر رہے ہیں ہم زندہ نہیں بچیں گے جلال اپنی بہن کو آ کر دیکھیں آپ آپ کی ضرورت ہے آپ کی ماں جائی کو، آپ نے وعدہ کیا تھا نا کہ آپ کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے اپنی عین کو؟" وہ درد کی کیفیات سے نڈھال تھیں۔

"تیمور...... کہاں...... کہاں ہیں آپ آپ نے...... تو وعدہ کیا تھا اس...... سفر میں ساتھ دیں گے آپ۔" وہ بے ہمت ہو رہی تھی تنہا تھی نڈھال تھی اور درد بڑھتا جا رہا تھا خاتون قرآنی آیات پڑھ کر اس پر پھونکنے لگی تھیں۔

"یا اللہ اس بچی کی مدد فرما اسے شفا دے اس کے لیے آسانیاں پیدا کر یا اللہ اس بچی کی ہمتوں کو بڑھا اسے مایوس نہ کر۔" وہ دل سے دعا مانگ رہی تھیں جانے کیا ہوا تھا کہ عین جو درد سے نڈھال تھی وہ خاموش ہو گئی تھی خاتون نے اسے تشویش سے دیکھا تھا وہ سو رہی تھیں خاتون نے تسلی کر کے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"زندگی کیا ہے سود و زیاں کے سوا کچھ نہیں اور اس سفر میں کس نے کیا کھویا کیا پایا اس کی خبر بھی کسی کو نہیں مگر میں اس بچی میں اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھتی ہوں اے میرے رب اس بچی کو شفا دے اور لمبی زندگی دے میں اس کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوں میرے رب اسے زندگی بخش دے اس کی خواہشوں کو پورا کر اور اسے سکون دے۔" خاتون نے دل سے دعا کی تھی۔

عین پرسکون انداز میں آنکھیں موندے پڑی تھی اس کی کیفیت قابل تشویش تھی خاتون اس کے لیے پریشان تھیں۔

''ہم اپنی ماں جائی کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑ سکتے ہمیں ہر حالت میں ان کے متعلق انفارمیشن چاہیے کسی بھی طریقے سے مگر ان کی خیریت معلوم ہونا ضروری ہے اگر اس کے لیے ہمیں پاکستان بھی جانا پڑا تو ہم جائیں گے چاہے سرکاری یا نجی اختیارات استعمال کرنے پڑے ہم کریں گے۔'' وہ رات کے کسی پہر بے چین سے ہو کر اٹھ بیٹھے تھے تو انہوں نے عین کے بارے میں سوچا تھا اور گھڑی دیکھ کر اپنے بیڈ سے نکلے اور سیڑھیاں اترے ہوئے فون اسٹینڈ تک آ کر رہے تھے۔ انہوں نے نمبر ملا کر ریسیور کان سے لگایا تھا۔

''پاکستان رابطہ کرائیں کسی طرح اسے درخواست سمجھیے یا حکم مگر ہمیں اپنی ہمشیرہ سے متعلق ضروری پوچھ گچھ کرنا ہے کمیونی کیشن کا کوئی بھی طریقہ نکالیے جگت صاحب حکومت میں یہ سب تو ممکن ہوگا ممکن ہے تو پھر عمل درآمد کرائیں معذرت چاہتے ہیں آپ کو رات گئے زحمت دے رہے ہیں مگر ہم بہت پریشان ہیں ہماری بہن کے متعلق جاننا ضروری ہے ہجرت کرنے والوں کی جانچ پڑتال کرائیں اور پاکستان پہنچنے والوں کی بھی ہمیں نواب زادی کے متعلق بہت فکر ہو رہی ہے نواب زادی عین النور پٹوڈی کے متعلق ہمیں ہر صورت معلومات درکار ہیں۔'' جلال نے جگت صاحب سے بات کر کے سلسلہ منقطع کیا تھا اور چلتے ہوئے گارڈن میں نکل آئے تھے وہ بہت بے چین ہو رہے تھے جانے کیا سوچ کر وہ واپس چلتے ہوئے فون کے قریب آئے تھے اور مرزا سراج الدولہ کا نمبر ملایا تھا۔

''السلام علیکم مرزا چاچا مزاج گرامی کیسے ہیں، معذرت چاہتے ہیں رات کے اس پہر آپ کو ڈسٹرب کر رہے ہیں کیا ہم مرزا حیدر سراج الدولہ کے متعلق کچھ پوچھ سکتے ہیں۔'' اس نے نرم خوئی سے پوچھا تھا اور ان کا جواب پا کر مسکرا دیا تھا۔

''نہیں چاچا جان اعتبار کی بات نہیں ہم بس فکر میں مبتلا ہیں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ نواب زادی خیریت سے پہنچ گئی ہیں، آپ کو کوئی خبر آئی ہو تو مطلع کریں، اگر یا کسی بھی ذرائع سے کوئی معلومات موصول ہوئی ہیں برائے کرم ہمیں آگاہ کریں ہم جانتے ہیں نواب زاد تیمور کے ساتھ روانہ ہوئی ہیں یہ ذمہ داری ابا جان۔ تیمور کو سونپی تھی کیونکہ وہ تیمور پر بے پناہ اعتبار کر۔ ہیں تیمور ہمارے خاندان کا حصہ ہیں آپ ان کے متعل کوئی فرق نہ کریں وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی عین النو صحیح سلامت پاکستان پہنچا دیں گے۔'' جلال نے ک قدر سخت لہجے میں جتایا تھا جانے آگے سے م صاحب نے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرا دیے تھے۔

''مرزا صاحب لگتا ہے آپ کے سپوت پاکستا روانہ ہی نہیں ہوئے لیکن اگر ان کے باعث ہمار ہمشیرہ کو کوئی زک پہنچی تو ہم معاف نہیں کریں گے نواب سیف الدین پٹوڈی کے ہونہار سپوت ہیں مگر ان کی طرح بے جا نرمی کے قائل نہیں مرزا حیدر اگر کچ غلط کرتے ہیں تو ہم ان کو بخشنے والے نہیں ہیں ہمیں افسوس ہے ابا جان نے ایک غلط فیصلہ لیا جو نواب زاد کو آپ کے سپوت کے ساتھ پاکستان روانہ کیا اگر اس موقع پر موجود ہوتے ہیں تو ہم ان کے فیصلے مزاحمت کرتے بہرحال اس تنبیہ کو دھمکی مت سمجھیے آپ کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتے چچا جان ابا کے قر دوستوں میں سے ہیں آپ۔ آپ کی عزت کرنا گو فرض ہے ہم پر۔'' چھوٹے نواب مسکرائے تھے اور فو کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور پر خیال انداز میں چلے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

❁.....◈.....❁

''ہمیں دھمکانے لگا ہے وہ کل کا لونڈا کانگریس میں شمولیت سے گویا چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں کل تک کے جھکے جھکے کم ہمت نوجوان نے سر ہٹا لیا ہے آ یہ سارا حکمت صاحب کا کیا دھرا ہے وہ اگر پاکستان روانہ ہو جاتے تو جلال کی مدد آج یہاں کوئی کرنے وا موجود نہ ہوتا مگر وہ یہاں رہ کر جلال کی طاقت بن گئے

ہیں ان کے والد محترم کے نمک خوار ہیں سونمک حلالی کر رہے ہیں۔'' مرزا سراج الدولہ غصے سے پھنکار رہے تھے جگت نے ان کو دیکھا تھا۔

''مجھے چھوٹے نواب کا فون آیا تھا ان کو اپنی ہمشیرہ سے متعلق معلومات درکار ہیں سنا ہے آپ کے سپوت بھی پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے؟'' جگت نے پوچھا تھا مرزا صاحب جانے کیوں چپ سادھ کر ان کو دیکھنے لگے تھے جگت صاحب نے گہری سانس خارج کی تھی۔

''بہر حال ہم نے بھارت میں پاکستان سفارت خانہ کو رابطہ کیا ہے مجھے یقین ہے جلال اپنے ذاتی اثر و رسوخ کو بھی ضرور بروئے کار لائیں گے۔'' جگت نے کہتے ہوئے فائل کھولی تھی مرزا سراج الدولہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے۔

''ہمارا بس چلتا تو ان تک کوئی معلومات پہنچنے نا دیتے۔'' وہ غرائے تھے جگت صاحب نے ان کو دیکھا تھا۔

''مرزا صاحب لگتا ہے آپ جلال کے خاندان کی طرف پرانے حساب باقی رکھتے ہیں مگر آپ کی ہر اشا (خواہش) پوری ہو، ایسا ممکن نہیں۔'' وہ مسکرائے تھے اور ان کی مسکراہٹ نے گویا زخم پر نمک کا کام کیا تھا وہ کچھ سخت بولنے لگے تھے مگر پھر کھلا ہوا منہ بند کر لیا تھا اور جگت صاحب مسکرا دیے تھے پھر ہی اون جیسے ہی چائے رکھ کر گیا تھا انہوں نے چائے کا کپ اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا تھا۔

''لیں چائے پی کر غم غلط کریں چائے بھی ایک نشہ ہے اور میں آپ کو اس وقت چائے کے علاوہ اور کچھ پیش نہیں کر سکتا۔'' جگت چائے کا کپ مرزا کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''مرزا صاحب مسئلہ یہ ہے کہ سرکاری طور پر تقسیم پر امن طریقے سے ہوئی ہے وسائل کی تقسیم بھی منصفانہ ہوئی ہے فوج کو بظاہر جو دنگے بلوے روکنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے وہ اس میں اپنا کردار بھرپور طور پر ادا کرنے کی کوشش میں عمل پیرا بھی ہے اغوا شدہ بچیوں اور لڑکیوں کو بازیاب کرانے کے لیے دونوں ممالک کا مشترکہ کمیشن بھی بنا ہے۔

Relation Between the two states have been defined by the uiolent partition of british india thought but both countries have to go peacefully that what decided by british raj.

برٹش راج کے احکامات کو کون ٹال سکتا ہے۔'' جگت مسکرائے تھے۔

''دو نئی خود مختار ریاستوں نے برطانیہ حکام کے حکم نامے کے تحت دو Dominions اپنے اپنے طور پر مرتب کی ہیں پاکستان نے Dominion of pakistan بنائی ہے اور انڈیا نے Dominion of india بنائی ہے دونوں ریاستوں کے فوراً بننے کے بعد ان کے سفارتی تعلقات بھی بن گئے ہیں اگر چہ یہ تعلقات تقسیم کے عمل کی قتل و غارت گری اور دنگوں بلوؤں سے کسی قدر متاثر ضرور ہوئے ہیں مگر یہ تعلقات دونوں ممالک کو جوڑ کر رکھنے میں معاون ثابت ہونے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں مگر یہ سچ ہے کہ

After independence india and pakistan established diplomatic relations but unfortunately violent partition and numerous territorial claims would overshadow their rwlationship since they are two new countries they have to follow a path of

mutual animosity.

جگت صاحب نے کہا تھا اور مرزا سراج الدولہ نے سر ہلایا تھا۔

''تقسیم سے قبل ریاستوں میں قانون ساز اسمبلیوں کی موجودگی بہر حال خوش آئند ہے اس بہانے ہماری دال بھی گل رہی ورنہ ہم سیاسی کیڑے کہاں جاتے میاں۔'' وہ مسکرائے تھے۔

''گورے دماغ والے ہیں مرزا صاحب انہوں نے تقسیم سے قبل ہی ایک جمہوری اور پارلیمانی ڈھانچہ ترتیب دے رکھا تھا اب بھی وہاں یہاں رک کر ہمیں حکومت بنانا اور نظام چلانا سکھا رہے ہیں ورنہ ہم جیسے نا اہل کہاں جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے ان کا عملہ تقسیم کے عمل کے بعد بھی یہاں رکا ہوا ہے تا کہ وہ ہمارے مدد گار ہو سکیں ان کا بنایا گیا نظام ہی تو دونوں ممالک کے درمیان سفارتی رابطے بنانے میں معاون ہو رہا ہے اگر چہ ابھی تو ابتدا ہے اور تعلقات اور سفارتی رابطے کسی قدر منتشر ہوئے ہیں مگر بہر حال ایک نظام ان تعلقات کو سنبھالنے کو موجود ہے گورے سفارتی تعلقات اور سفارت خانہ کے انتظامات بنانے میں معاونت کر رہے ہیں انہی کی بدولت ہم بھی آج یہ کرسی سنبھالے بیٹھے ہیں ورنہ سفارت خانہ میں ہمیں کون پوچھتا؟'' جگت صاحب مسکرائے تھے اور مرزا صاحب بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

''آپ تو جگت بازی میں کمال رکھتے ہیں جگت صاحب خود پر بھی طنز کرنے میں نہیں چوکتے۔'' مرزا صاحب نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا جگت نے سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

''ویسے آپ کے ایسے کیا اختلافات رہے ہیں نواب صاحب کی فیملی سے آپ کا لہجہ زہر سے بجھا ہوا ہے لگتا ہے یہ زہر پرانا رگوں میں دوڑ رہا ہے۔'' جگت مسکرائے تو مرزا نے سر ہلایا تھا۔

''ویسے آپ کیا چاہتے ہیں ہم جلال صاحب کی ہمشیرہ کو ڈھونڈنے میں مدد کریں یا نہیں آپ کی آ طرف اشارہ کرتی ہے کیا کوئی خاص حکم ہے ہما لیے۔'' جگت مسکرائے تھے۔

''ہم یقین کرنا چاہتے ہیں کہ نواب زادی اگر تصادم اور قتل و غارت گری سے نکل کر زیادہ دور پائیں ہم نواب زادی کی زندگی کے خاتمے کے خو ہیں وہ یہاں انڈیا سے اگر بچ کر نکل بھی گئی ہیں نہیں چاہتے وہ پاکستان میں امن و سکون کی ز گزاریں۔'' مرزا سراج الدولہ کا لہجہ سفاک تھ جگت ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''آپ دو خاندانوں کے مراسم تو بہت پرانے مرزا صاحب، پھر آپ نواب زادی کی زندگی کو خطرہ پہنچانا چاہتے ہیں۔'' جگت نے پوچھا تھا اور صاحب مسکرا دیے تھے۔

''فی الحال مت پوچھیے جگت صاحب۔''

''آپ آپ نے اپنے سپوت کو کیوں پاکر روانہ کیا اگر آپ نواب زادی کے خلاف ہیں تو مجھ سمجھ نہیں آ رہا مرزا صاحب۔'' جگت نے پوچھا تھا۔

''اس متعلق فی الحال بات نہیں ہو سکتی صاحب آپ سے درخواست کرنا تھا کہ کچھ خاص رکھیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔'' مرزا صا مسکرائے تھے اور ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے جگت نے سر ہلایا تھا۔

❀.....◈.....❀

جلال زندگی کے لیے لائحہ عمل مرتب کر رہا تھا اس نے وکیل کو بلوا کر ضروری کاغذات تیار کر تھے۔

''آپ کو لگتا ہے چھوٹے نواب کہ یہ منا اقدام ہوگا؟'' وکیل نے پوچھا تھا جلال نے خا سے وکیل کی طرف دیکھا تھا۔

''جلال صاحب آپ کو اپنے خاص دوستوں مشورے کر لینا چاہیے میں نہیں چاہتا آپ کو فیصا

میں پچھتانا پڑے سو فیصلوں میں یہ نظر ثانی ضروری ہے۔'' وکیل صاحب نے ان کو سمجھایا تھا کیونکہ وہ نواب صاحب کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے جلال ان کو خاموشی سے دیکھنے لگے تھے۔

''آپ فی الحال اسے حتمی جانیے وکیل صاحب مگر پھر بھی آپ کی صلاح کے مطابق حکمت چاچا سے مشورہ کرلیں گے اور آپ کو آگاہ کردوں گا۔'' جلال نے کہا تھا اور وکیل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''چلتا ہوں آپ کو ایک بار پھر کانگریس کا حصہ بننے پر مبارکباد۔'' وکیل صاحب مصافحہ کر کے چلتے بنے تھے جلال نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے ازسرنو سوچا تھا۔

خاموش نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں یہ بھرا پرا گھر جو کل آباد تھا وہ آج ویرانیاں لیے اسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

''جلال ہم چاہتے ہیں آپ ہمارے بعد اس گھر کو اسی طرح سنبھالیں اور انتظامات ملائیں جس طرح ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے چلاتے۔'' ابا جان کی آواز ان کے گرد گونجی تھی۔

''مگر ابا جان آپ تو چاہتے ہیں ہم پاکستان روانہ ہوں سو پھر ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں اس محل کو تو ہمیں یونہی چھوڑ کر جانا ہوگا مگر ہم یہاں واپس آتے رہیں گے اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے اور طویل حیات دے آپ خود اس گھر کے انتظامات اس طور چلاتے رہیں۔'' جلال نے کہا تھا تو ابا جان مسکرادیے تھے۔

''ہماری اگرچہ خواہش ہے کہ ہم پاکستان ہجرت کریں مگر پھر بھی حالات کی کیا خبر، اونٹ کس کروٹ بیٹھے سو ہم چاہتے ہیں چاہے ہم رہیں نہ رہیں آپ اسی وقار اور رکھ رکھاؤ سے اس محل کے معمولات کو معمول کے مطابق جاری رکھیں گے۔'' ان کی جائیداد میں سے کئی حصے غریبوں کے لیے وقف کیے گئے تھے وہ کئی بچوں کی تعلیم اور زندگی کے اخراجات چلا رہے تھے وہ جلال سے توقع رکھتے تھے کہ وہ نظام زندگی اس طور چلتا رہے۔

''ابا جان ان شاءاللہ ہم سب مل کر پاکستان روانہ ہوں گے۔'' جلال نے عزم سے کہا تھا۔

''ضرور بیٹا پاکستان جا کر رہنا اور وہاں زندگی گزارنا ہمارا اولین خواب ہے۔'' ابا جان نے کہا تھا۔

''ہم بھی پاکستان جائیں گے۔'' نواب زادی عین چہکی تھی۔

''ہم آپ کو ٹرین میں سوار ہونے نہیں دیں گے آپ کا داخلہ ممنوع ہوگا۔'' جلال نے بہن کو چھیڑا تھا وہ افسردگی سے بھائی کو دیکھنے لگی تھی۔

''آپ ہمارا داخلہ ٹرین میں ممنوع قرار دیں گے بھائی سے ایسی توقع نہیں تھی۔'' عین نے برا سا منہ بنایا تھا جلال مسکرادیا تھا۔

''ہم یہاں آپ کو آپ کے بندر منگیتر مرزا حیدر سراج الدولہ کے حوالے کر جائیں گے نا کیوں ابا جان عین کی شادی کر کے جائیں گے نا ہم۔'' جلال نے ابا جان کو بھی مذاق میں ساتھ ملایا تھا۔

''اماں دیکھیے نا جلال ہم کو یہیں چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔'' عین نے خفگی سے کہتے ہوئے اماں کو پکارا تھا۔

''جلال بہن کو زچ کرتے چھوٹی بہن کو خوش رکھتے ہیں بیٹیاں خوش ہوں تو اللہ خوش ہوتا ہے۔'' اماں نے ڈپٹا تھا جلال مسکرایا تھا۔

''ابا جان بیٹیوں کو وقت پر ان کے گھر کا کردینے کا حکم ہے نا؟ عین کا نکاح بھی اب ہوجانا چاہیے ان کو ان کے مرزا حیدر کے ساتھ یہیں چھوڑ کر ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے۔'' جلال نے چھیڑا تھا اماں نے اٹھ کر اس کا کان کھینچا تھا اور عین ہنسنے لگی تھی۔

یکدم وہ چونکا تھا ہنسی کی جگہ ویرانی بھری ہوئی تھی اور وہ جگہ جہاں ایک ہنستا بستا خاندان بیٹھا تھا وہاں صرف خاموشی تھی۔

ہم نے خواب بوئے تھے
چاند کے شگوفوں پر

ستاروں کے کنارے پر
تعبیر ملنے کی منتظر آنکھیں
خواب کے پرندوں کی
ہر لحہ منتظر تھیں
مگر زمینیں بنجر تھیں
خواب وہ سراب ہوئے
سراب بھی عذاب ہوئے
عذاب کب ثواب ہوئے
سلسلوں کے تعاقب میں
لمحوں کو گنوایا ہے
ہم نے خوابوں کے تعاقب میں
آنکھوں کو گنوایا ہے
پلکوں کی ویرانی کو
پانی کی روانی کو
روکنا کہاں ممکن
خواب سے کہو کوئی
چاند کب ہمارا ہے
ستاروں کی روشنی بھی
اپنی ضیا کھونے کو ہے
رات کے اندھیروں میں
عمر بیت جائے گی

''جلال فون بجنے پر چونکا تھا اٹھ کر فون تک آیا تھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تھا دوسری طرف فتح النساء تھی۔

''ہمیں آپ کی فکر ہو رہی تھی آپ خیریت سے ہیں کیا ہم محل میں بوا کے ساتھ آ سکتے ہیں۔'' فتح النساء نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' جلال نے قطعی لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ چونکی تھی۔

''کیوں ہم محل کیوں نہیں آ سکتے؟'' فتح النساء نے وجہ پوچھی تھی۔

''یہ مناسب نہیں آپ حکمت چاچا کی طرف ہی رہیے فی الحال یہاں رہنا ٹھیک نہیں یوں بھی ہم اہم فیصلے لے رہے ہیں ہم نہیں چاہتے ہم کمزور پڑیں ہمیں سکون اور یکسوئی کی ضرورت ہے فتح النساء۔'' جلال نے واضح کیا تھا وہ چونکی تھیں۔

''کن فیصلوں کی بات کر رہے ہیں آپ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''فتح النساء ہمیں ہمارے بیچ کا یہ رشتہ اضافی لگتا ہے ہمیں نہیں لگتا ہم اس رشتے کے لائق ہیں ہم اچھے شوہر ثابت نہیں ہو سکیں گے ہم ذمہ داریاں لینے کے اہل نہیں ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولے تھے وہ ساکت رہ گئی تھیں، ریسیور ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا جلال اس کے اپنے بیچ کا رشتہ ختم کرنا چاہتا تھا۔

''آپ نے یہ کیسے سوچا۔'' وہ جیسے سکتے میں تھیں۔

''جو کچھ ہوا وہ مناسب نہیں تھا ہم نے زبردستی ایک رشتہ بنایا اور وہ بھی کس لیے آپ واقف ہیں۔'' جلال نے جتایا تھا وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

''ہم نے یہ تعلق دل سے نہیں بنایا فتح النساء، یہ صرف ایک عمل تھا جس میں آپ کو سزا دینا شامل تھا۔'' وہ حقیقت واضح کر رہا تھا وہ خاموشی سے دوسری سمت سن رہی تھیں۔

''ہم اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں فتح النساء اس رشتے کی ضرورت ہمارے درمیان دکھائی نہیں دیتی۔'' جلال کا لہجہ فتح النساء کو انتہائی سفاک لگا تھا۔

وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی ساکت سی اسے سن رہی تھی۔

''ہم آپ کو آزاد کرنا چاہتے ہیں فتح النساء اس رشتے سے ہر تعلق سے اور ہر واسطے سے ہم آپ کو اس رشتے کی قید میں رکھنا نہیں چاہتے نہ وہ صاف گوئی سے بنا کوئی لگی لپٹی رکھے بولا تھا۔

فتح النساء حیران تھی وہ ایک لفظ نہیں بول سکی تھی کیا کیا کر رہا تھا جلال، کیا کرنے والا تھا اس کے لیے یہ سب شدید حیرت کا باعث تھا وہ ساکت رہ گئی تھی اس نے جلال سے محبت کی تھی جلال سے عشق تھا اسے کب

جب سے اس نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنا تھا اس میں جلال کا نام سنا تھا اور جلال وہ کہہ رہا تھا یہ رشتہ ان کے درمیان اضافی تھا اس کے لیے اس رشتے کی کوئی وقعت نہیں تھی صرف اس لیے کہ وہ سمجھا تھا اس نے جلال سے بے وفائی کی۔

''ہم نے بے وفائی نہیں کی جلال۔'' وہ چیخنا چاہتی تھی مگر جلال دوسری طرف فون کال کا سلسلہ منقطع کر چکا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی تھی آنکھوں سے بے طرح آنسو رواں تھے۔

''ہم نے بے وفائی نہیں کی جلال ہم بے وفائی نہیں کر سکتے آپ نے جو سوچا غلط سوچا جو دیکھا وہ سچائی نہیں تھی ہم بے وفا نہیں ہیں ہم نے صرف آپ کو چاہا ہے اپ کو سوچا ہے صرف آپ کے لیے یہ دل دھڑکا ہے ہم کہہ نہیں سکتے کہتے نہیں تو کیا آپ کچھ بھی سوچ لیں گے مگر جو آپ نے اخذ کیا وہ سچ نہیں ہے ہم نے آپ کو دھوکا نہیں دیا ہم نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں۔'' وہ دل کو ڈوبتا ہوا محسوس کرنے لگی تھیں۔

❁.....◈.....❁

خوشنما نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور خالہ نے اسے پکڑ کر اس کے پاؤں سے زنجیر باندھ کر اس کو پیڑ سے باندھ دیا تھا وہ دن بھر دھوپ میں جلتی رہی تھی۔

''ہمیں جانے دیں خالہ، ہم یہاں نہیں رہ سکتے ہم آپ کا دکھ سمجھتے ہیں مگر ہمارا دل بند ہو جائے گا ہم اس قید میں مر جائیں گے ہم یہاں قید نہیں رہ سکتے، آپ ہمیں جانے دیجیے۔'' وہ درخواست کرتی ہوئی بولی تھی مگر خالہ نے نہیں سنا تھا وہ اپنے کان جیسے بند کر کے معمول کے کام کرنے لگی تھیں۔

خوشنما کا دل بیٹھنے لگا تھا وہ بے بسی سے خالہ کو دیکھنے لگی تھی عمر جانے کہاں تھا اس نے منتظر نظروں سے سارا دن کمرے کے دروازے کو گھورا تھا کہ شاید وہ کہیں سے نکل کر آ جائے مگر شاید اپنی خالہ کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ سارا دن انتظار میں بیٹھی رہی تھی اور پھر اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرنے لگی تھی اس نے توڑ دی تھی مگر تب خالہ عین اس لمحے آ گئی تھیں اسے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگی تھیں۔

''سمجھتی کیوں نہیں تم میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں نوچ کھائیں گے وہ تمہارے بدن کو کاٹ کھائیں گے، کس دنیا میں جانا چاہتی ہو تم دیکھو میری ہاجرہ کا کیا حشر کیا انہوں نے نوچ ڈالا اور اٹھا کر لے گئے کسی ماں نے اپنے سامنے اپنی بیٹی کو بے آبرو ہوتے نہیں دیکھا ہوگا میں نے دیکھا ہے میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔'' خالہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں خوش نما نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

''خالہ ہمیں آپ کے درد کا احساس ہے ہم آپ کی بیٹی ہاجرہ کے لیے بہت دکھی ہیں مگر ہم پاکستان جانا چاہتے ہیں ہم شرافت کا لیبل ماتھے پر لگا کر پیدا ضرور ہوئے ہیں ہم امرا کی اولاد ضرور ہیں مگر ہم عزت کی زندگی نہیں جی پائے ہم اس زندگی کے لیے ترس گئے ہیں ہماری خواہش ہے ہم پاکستان جا کر اس شرافت کی زندگی کا آغاز کریں۔'' اس کے بولنے پر خالہ چونکی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو تم۔''

''ہم کوٹھے پر رہنے والی طوائف ہیں ایسی طوائف جس کے سوتیلے بھائی نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور اسے کوٹھا چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہم نے جس عزت کو کوٹھے پر رہ کر بھی بچا کر رکھا تھا اسی عزت کے لیے ہم نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم بدنامی کے ساتھ اس جگہ نہیں رہ سکتے ہم نہیں چاہتے کوئی ہم پر انگلی اٹھائے ہم پاکستان جا کر ایک نئی شناخت کے ساتھ نئی زندگی جینا چاہتے ہیں یہاں رہ کر ہم طوائف کے نام سے نہیں جی سکتے ہم اس جگہ نہیں جی سکتے جہاں ہمارا امیر باپ اپنے نام کے لیے ہمیں بیٹی قبول کرنے کو تیار نہیں، جس باپ کو اپنی بیٹی کے کوٹھے پر رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا آپ کیوں چاہتی ہیں ہم اس جگہ

رہیں ہمارا دم گھٹ جائے گا خالہ ہم مر جائیں گے۔ برائے کرم ہمیں بھیجیے ہمیں یہاں قیدمت کیجیے۔'' خوشنما نے درخواست کی تھی اور خالہ اسے دیکھنے لگی تھیں پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ چھوا تھا اور نرمی سے بولی تھیں۔

''ہاجرہ میں نہیں چاہتی تجھے کوئی تکلیف ہو یا تو تڑپے۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے تھے خوشنما کو ان کی تکلیف کا احساس ہوا تھا وہ ان کے دکھ پر کھل کر روئی تھی مگر اسے وہاں سے جانا تھا سو وہ ان کی آنکھیں صاف کرنے لگی تھیں۔

''خالہ ہاجرہ چلی گئی ہے ہم خوشنما ہیں ہماری منزل یہاں نہیں ہے ہم یہاں نہیں رہ سکتے سب سچ بتا دیا آپ کو آپ کو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ہم طوائف ہیں اور کوٹھے سے آئے ہیں۔'' اس نے اپنے کمزور نقطے کو واضح کیا تھا مگر خالہ نفی میں سر ہلانے لگی تھیں۔

''چاہے تم طوائف ہو مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا تم میری ہاجرہ ہو میں تمہیں وہ نام وہ عزت دلواؤں گی، تمہارا نکاح عمر سے کراؤں گی عمر اچھا لڑکا ہے وہ تمہارا خیال رکھے گا تم عمر سے نکاح کر لو یہیں رہ جاؤ میرے پاس۔'' خالہ بیٹی کے دکھ اور جدائی میں پاگل ہو چکی تھیں وہ ان کو قائل نہیں کر پا رہی تھی تبھی اسے عمر آتا دکھائی دیا تھا۔

''عمر اپنی خالہ سے کہو ہمیں جانے دیں ہم تم سے نکاح نہیں کر سکتے ہم ہاجرہ نہیں ہیں ہم ہاجرہ بن بھی نہیں رہ سکتے۔'' خوشنما زچ ہو کر بولی تھیں عمر پاس آیا تھا۔

''خالہ اسے جانے دیں یہ ہاجرہ نہیں ہیں یہ ہاجرہ نہیں بن سکتیں۔'' عمر نے جیسے اس کی سفارش کی تھی مگر خالہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کا چہرہ پیار سے تھاما تھا۔

''چل تجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں، صبح سے بھوکی ہے نا تو میری ہاجرہ بھوکی ہے نا، اپنی ہاجرہ کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی میں۔'' خالہ نے کہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے دکھ تھا سو وہ خالہ کو انکار نہیں کر سکی تھی، اس نے چپ چاپ خالہ کے ہاتھ سے کھانا کھایا تھا عمر چپ چاپ قدرے فاصلے پر بیٹھ اسے دیکھتا رہا تھا خوشنما نے اس نوجوان کو دیکھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ہاجرہ کا عکس تھا جو آنسوؤں میں دھندلا رہا تھا وہ غمزدہ ہو گئی تھی۔

''یا اللہ دنیا میں کتنا دکھ ہے کتنا درد ہے اور کتنے دل اداس ہیں کتنی آنکھوں میں ویرانی ہے ہم کس کس کی ویرانی کو روئیں۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے چپ چاپ کھانا کھاتی رہی تھیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے خالہ کو کھانا کھلانے لگی تھی۔

❁.....❁.....❁

عین نے بخار سے جلتی آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔

''جلال بھائی ہمیں تنہا مت چھوڑو، ہم اپنے سے جڑے رشتوں کے بنا نہیں جی سکتے۔'' وہ بھیگتی آنکھوں سے اندھیرے کو دیکھنے لگی تھیں، تبھی ٹرین رکی تھی جانے کس ویرانے میں کس نے ٹرین کو رکنے پر مجبور کیا تھا سب چہروں پر خوف چھا گیا تھا۔

''یا اللہ خیر ہم نے سوچا تھا ہم صحیح سلامت پاکستان پہنچ جائیں گے مگر جانے اب کیا ہوا۔'' کسی نے کہا تھا۔

''جو اللہ کی رضا اگر موت آئی ہے تو ہم ٹال نہیں سکتے۔ اے پروردگار تیری مرضی پوری ہو۔'' کسی خاتون نے بھیگتی آنکھوں سے کہا تھا۔

''یہ ہمیں پاکستان جانے نہیں دیں گے کسی نے ٹرین رکوا دی ہے یہ ٹرین پاکستان نہیں جا سکتی، ان کی نفرت بہت زیادہ ہے ان کی نفرت ہمیں منزل سے دور کر دے گی یا اللہ ان کے دلوں کو موم کر دے نفرت کی جگہ محبت بھر دے ان کو عقل دے کہ وہ ناحق خون نہ بہائیں ظلم کا قہر نہ توڑیں یا اللہ اتنا ظلم تیرے بندوں کو تیری ضرورت ہے میرے رب اپنے بندوں کو تنہا مت چھوڑ۔'' کسی خاتون نے با آواز بلند کہا تھا۔

''اللہ اپنے بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا یا اللہ میرے

اب ہماری حفاظت فرما۔'' ایک بزرگ نے با آواز بلند کہا تھا۔

ٹرین رکنے لگی تھی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی ویرانہ ہی ویرانہ تھا اور رات کا پہر۔

''بچی آنکھیں کھول جانے کیا ہونے والا ہے اٹھ میری بچی یہ خاتون نے اسے بیدار کرنا چاہا تھا عین نے آنکھیں کھولنے کی بامشکل کوشش کی تھی مگر آنکھیں پھر سے بند ہونے لگی تھیں۔

بند آنکھوں پر اس نے تیمور کا چہرہ دیکھا تھا تیمور اس سے دور کھڑا تھا اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

''تیمور تم یہاں ہو ہمارے قریب آؤ تیمور ہم تنہا ہیں بہت ہم اکیلے ہیں کوئی ہماری نہیں سنتا ہم جلال بھائی کو پکار رہے ہیں ہم اماں اور ابا جان کو پکار رہے ہیں کوئی نہیں سنتا ہماری کوئی قریب نہیں آتا تیمور ہمارے دوست تم نے ہمارا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟'' وہ شکوہ کرنے لگی تھی تیمور دور کھڑا خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔

''تیمور تمہاری آنکھیں اتنی خاموش کیوں ہیں، کیا تم بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے کیا تم بھی ہمیں چھوڑ جاؤ گے۔'' وہ ایک آس سے پوچھنے لگی تھی مگر تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''محبت کہکشاؤں سے بنا ایک گھر ہے۔''

''محبت باقی رہتی ہے محبت کا وجود نا ختم ہونے والا ہے۔'' تیمور خاموش تھا مگر اس کی آواز اس کے گرد پھیل رہی تھی۔

''یہ کیسی محبت ہے تیمور جو ایک دوست کو تنہا چھوڑ رہی ہے۔'' وہ تڑپ کر بولی تھی۔

محبت کیسی ہوتی ہے؟
محبت ایسی ہوتی ہے
کہکشاؤں کے درمیان
کوئی خاص نام لکھ کر چھپا دینا
یا کوئی ذکر لکھ کر مٹا دینا
محبت ایسی ہوتی ہے
دے پاؤں چلتی
آہٹوں سے ڈرتی
سوال کرتی
جواب سنتی
محبت ایسی ہوتی ہے
محبت ان کہا سچ
یا ادھ کہا سچ
یا خاموشی میں کہا کوئی لفظ
محبت ایسی ہوتی ہے
محبت ایسی ہوتی ہے

تیمور کی آواز اس کے گرد پھیلتی ہوئی حصار تنگ کر رہی تھی مگر وہ اسی طرح خاموش کھڑا تھا ٹرین کی رفتار مدھم پڑتی پڑتی رکنے لگی تھی

''میں نہیں جانتا راستوں کو کہاں رکنا ہے اور کیسے بانٹنا ہے آغاز سفر کرتے ہوئے اس اعداد و شمار پر نگاہ نہیں تھی اور سفر کے اختتام کی اگرچہ خبر نہیں مگر محبت کہیں دور کھڑی چپ چاپ تکتی ہے تو ایک الہام یہ بھی ہوتا ہے کہ اختتام چاہے کچھ بھی ہو مگر یہ سفر بہت دلچسپ ہوگا۔'' تیمور کی آواز تیمور کا لہجہ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

تیمور خاموش اس کی آواز اس کے گرد متواتر

اور ٹرین کی رفتار مدھم پڑتے پڑتے یکدم ساکت

''تیمور.....!'' وہ چیخی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

نفس کے قیدی

ریاض بٹ

ریٹائرڈ انسپکٹر خالد دیکھیں اس بار کون سی تفتیشی کہانی لے کر آئے ہیں آپ کو اس میں ایڈونچر بھی ملے گا تفتیش کی باریکیاں بھی آپ پر ظاہر ہوں گی اور بہت کچھ آپ پڑھیں گے جس کے لیے آپ تفتیشی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

نئے افق کے قارئین کی نذر

وہ ایک رونگھٹے کھڑا کر دینے والا منظر تھا..... پچاس سالہ گدڑیے کی کٹی پٹی لاش ایک کھڈ میں پڑی تھی..... تھوڑی دور دو تین بکریاں بھی چیری پھاڑی نظر آ رہی تھیں .....ان کا تھوڑا تھوڑا گوشت کھایا ہوا تھا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ یہ ایک سرسبز لیکن قدرے ویران علاقہ تھا..... اونچے نیچے ٹیلے اور کھڈ نالے تھے۔ یہ علاقہ گاؤں قاسم آباد اور محبت آباد کے درمیان تھا۔ میرے ساتھ سپاہی عارف اور عظمت تھے۔ ہمارے پاس بڑی بڑی ٹارچیں تھیں جن کی روشنی ہر طرف چکراتی پھر رہی تھی۔ ہماری سرکاری جیپ اور پوسٹ مارٹم کے لیے لاشیں لے جانے والی گاڑی پونا کلو میٹر دور (اس وقت کا آدھا میل سمجھ لیں) کھڑی تھیں۔ کیونکہ وہ اس سے آگے آ نہیں سکتی تھیں۔

وہ سردیوں کے ابتدائی دن تھے۔ اکتوبر کا آدھا مہینہ اپنی مسافت طے کر چکا تھا۔ صبح، شام اور خاص کر رات کو خنکی بڑھ جاتی تھی۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد سپاہی عظمت کی نگرانی میں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی..... ہمارے ساتھ گاؤں قاسم آباد کے بھی کچھ لوگ موجود تھے..... جن کے ہاتھوں میں لالٹینیں اور چھوٹی ٹارچیں تھیں۔ گدڑیے امام دین کا تعلق بھی گاؤں قاسم آباد سے تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے چارپائی کا بندوبست کیا تھا..... جس پر لاش رکھ کر سرکاری گاڑی تک پہنچائی گئی تھی۔

اب یہاں مزید ٹھہرنا وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں تھا۔ باقی کارروائی صبح پر ڈال کر ہم، یعنی میں اور سپاہی عارف واپس تھانے میں آ گئے۔

یہاں اے ایس آئی آفاق میرا منتظر تھا..... ہم نے مختصراً اس کیس کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا..... اور پھر آرام کرنے چلے گئے۔

صبح خنکی بڑھ گئی تھی۔ سفید سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر ہوا کے دوش پر ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ جس کی وجہ سے دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ میں نے چند لمحے تھانے کے صحن میں کھڑے ہو کر اس منظر کو دیکھا پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اور روزمرہ کے کام نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔ انسان اگر مصروف ہو تو اسے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا..... جب کام ختم ہوا تو میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔

وہاں بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

بہر حال لاش کی جیسی حالت تھی..... اس کے پیش نظر مجھے امید تھی کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لاش جلد واپس

آجائے گی۔ بہرحال ایک بجے کے قریب جب میں کھانا کھا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لاش واپس آ گئی۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد معمول کے مطابق لاش ورثا کے حوالے کر دی۔

آگے بڑھنے سے پہلے اب تک جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں ان کا ذکر کر دیتا ہوں۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ گڈریے کا نام امام دین تھا لیکن گاؤں کے لوگ اسے علی بابا کہتے تھے..... اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ علی بابا چالیس چور کہانی پڑھ کر ان کے ذہن میں جو خاکہ بنتا تھا وہ امام دین پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔ بہرحال آپ کی دلچسپی کی خاطر میں اسے علی بابا ہی کہوں گا۔

وہ گاؤں قاسم آباد والوں کی بکریاں چرانے لے کر جاتا تھا..... اور وہ یہ کام بیس سال سے کر رہا تھا۔ جس علاقے میں اس کی لاش ملی تھی اس سے آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا' جو تقریباً دو فرلانگ تک تھا۔ وہاں گھنے درخت' اور بارشوں کی وجہ سے یعنی قدرتی گھپیں تھیں جہاں پر سانپ' بچھو' گلہریاں اور خرگوش بکثرت تھے۔ اکثر خرگوش کے شکاری وہاں جاتے تھے..... لیکن حفظ ماتقدم کے طو رپر بڑے بڑے شکاری بوٹ ان کے پاؤں میں ہوتے تھے۔ علی بابا کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ بکریوں کو جنگل کی طرف نہیں جانے دیتا تھا..... اور خود بھی جانے سے گریز کرتا تھا..... جنگل اتنا بڑا' اور گھنا نہیں تھا کہ وہاں درندے مثلاً بھیڑیا شیر وغیرہ پائے جاتے..... گاؤں کے باسیوں نے ان میں سے کسی کو کبھی وہاں نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں کے

کچھ لوگ اپنی مکمل حفاظت کے بعد جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتے تھے..... انہوں نے بھی یہ گواہی دی تھی کہ متذکرہ بالا دونوں میں سے کبھی کوئی درندہ وہاں نہیں دیکھا گیا تھا۔

لیکن..... لاش کی حالت' اور بکریوں کی حالت زار دیکھ کر دھیان کسی درندے کی طرف ہی گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ کسی کراس نسل کے بھیڑیے کا کارنامہ ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہاں کراس نسل کا بھیڑیا کہاں سے آیا تھا؟

اب لاش کی دریافت کے متعلق سن لیں..... جب شام ڈھلے تک گاؤں والوں کی بکریاں نہیں پہنچیں' تو انہیں تشویش ہوئی۔ انہو نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور چھ جوانوں کو برچھیاں اور کلہاڑیاں دے کر اس علاقے میں بھیج دیا گیا۔ انہیں وہاں علی بابا کی لاش اور تین چیری پھاڑی بکریاں ملیں..... جب گاؤں کے دو معتبر بندے تھانے میں آئے تو میں اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا لیکن اطلاع ملنے پر میں نے دوبارہ تھانے کا رخ کیا تھا اور ضروری تیاری کے بعد دو سپاہیوں کو لے کر جائے وقوعہ پر چلا گیا تھا۔ بہرحال وہ سب کچھ تو آپ پڑھ چکے ہیں' گاؤں والوں نے باقی بکریوں کا کھوج لگانے کے لیے مزید بندے اور روشنی کا بندوبست کیا تھا..... بکریاں ادھر ادھر سہمی کھڑی تھیں۔

میں نے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔ اس لیے آج صبح میں نے اے ایس آئی کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ صبح کی روشنی میں جائے وقوعہ کا معائنہ کر آئے۔ میرے کام نمٹانے کے دوران اس نے جو رپورٹ دی تھی۔ اس کا خلاصہ بھی پیش کر دیتا ہوں۔ وہاں پر کسی بھیڑیے کے پگ (پاؤں کے نشان) نہیں تھے..... یا اگر تھے بھی تو مٹ گئے تھے کیونکہ کافی بندوں نے وہاں یلغار کی تھی..... وہاں پر صرف ایک کھرا ہمارے کام کا تھا..... جو ہمارے لیے حیرانگی کا باعث تھا۔ وہ کسی جوان عورت کے کھروں کا نشان تھا..... کھوجی حشمت (جسے اے ایس آئی صبح ساتھ لے گیا تھا) اس نے یہ کھرے اٹھائے تھے۔ بابا حشمت ایک ماہر کھوجی تھا..... انے اتنے کھروں میں یہ کھرے پہچان لیے تھے..... اس کی ماہرانہ رائے کے مطابق عورت جوان تھی' اور اس نے کوئی دیہاتی جوتی پہنی ہوئی تھی..... اس جگہ عورت کے کھروں کا پایا جانا حیرانگی اور اچنبھے والی بات اس لیے تھی کہ وہ کوئی گزرگاہ نہیں تھی۔ گاؤں محبت آباد کو راستہ دوسری طرف سے جاتا تھا۔

بہرحال یہاں یہ سوال بھی اٹھتا تھا کہ وہ عورت کون تھی؟

علی بابا کی تدفین کے بعد میں ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو لے کر اس کے گھر پہنچ گیا..... یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا..... دو کچے سے کمرے تھے' صحن بھی کچا تھا..... جس کی چند دن پہلے لپائی کی گئی تھی۔ اس کی بیوی قمر جہاں چارپائی کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس کی زندگی کا ساتھی اس عمر میں اسے چھوڑ کر وہاں چلا گیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا..... اس کا بھائی نظام دین بھی ڈھے سا گیا تھا۔ میں یہاں اس لیے آیا تھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا تھا کہ علی بابا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یہ اتفاقیہ حادثہ نہیں ہوسکتا..... اس علاقے میں کسی نے کسی قسم کا بھیڑیا نہیں دیکھا تھا..... پھر اچانک وہاں کراس نسل کا بھیڑیا کہاں سے آ گیا تھا.....؟

قمر جہاں کو جب میں نے بتایا کہ تمہارے خاوند کے ساتھ یہ سب حادثاتی طور پر نہیں ہوا..... بلکہ یہ سب کسی خاص وجہ سے ہوا ہے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی..... بولی کچھ نہیں۔ میں نے نرم لہجے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''بی بی..... ابھی میں خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں..... بہرحال تمہارے ذہن میں اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ..... تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔''

''تھانیدار صاحب..... میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کب کیسے ہوگیا..... ویسے اگر حقیقت پوچھیں تو میرا ذہن بھی یہ بات تسلیم نہیں کر رہا کہ میرے مجازی خدا کے ساتھ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوگیا ہے۔'' یہاں تک بات

لر کے وہ خاموش ہوگئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ آگے وہ کیا
ہے؟

اس وقت اس کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس
لیے میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا.....
ں کوئی اشارہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی سراغ کی تلاش تھی۔

قمر جہاں کو اندر بھیج کر میں نے نظام دین کو اپنے
امنے بٹھالیا۔

''نظام دین..... مجھے افسوس ہے کہ تمہارے بھائی کے
ساتھ یہ حادثہ ہوگیا۔ میں نے اس کے زخموں پر تسلی کی مرہم
اتے ہوئے کہا۔

''بس تھانے دار صاحب میرا تو سمجھیں بازو ہی جدا
گیا..... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی..... کہ یہ کیا اور کیسے
گیا.....'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''باقی باتیں..... تم مجھ پر چھوڑ دو..... میں انشاء اللہ
ت کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا..... میں نے چند لمحے اس کی
نکھوں میں دیکھا..... پھر بولا۔

''تمہاری سوچ کیا کہتی ہے؟ اس علاقے میں کبھی تم
نے کوئی درندہ دیکھا ہے؟''

''تھانیدار صاحب..... میں نے تو نہیں دیکھا.....''

''اچھا..... دیکھو انسان کبھی بیمار بھی ہوتا ہے..... جب
ہمارے بھائی پر کوئی ایسا وقت آتا تھا تو بکریاں کون لے
رجاتا تھا..... میں نے ایک اہم زاویے سے سوال کیا۔

''کبھی میں لے جاتا تھا..... اور کبھی میرا بیٹا.....
انو.....''

''ویسے تو میری معلومات کے مطابق تمہارا بھائی آگے
نگل کی طرف نہیں جاتا تھا لیکن جب تم جاتے تھے..... تو
بھی تم جنگل کی طرف گئے تھے؟''

''نہیں تھانیدار صاحب..... وہاں سانپ اور بچھو
لیرہ بہت ہیں۔''

''سردیوں میں بھی یہی روٹین تھی؟ جیسا کہ آج کل
ردیوں کی ابتدا ہے۔''

''تھانیدار صاحب..... بات دراصل یہ ہے کہ یہ جنگل
ملک صاحب کی ملکیت ہے..... انہوں نے پابندی لگائی
ہوئی ہے.....''

''اور..... یہ سانپ بچھو والی بات.....'' میں نے غور
سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس..... آپ خود سمجھ دار ہیں..... صرف رائی کا پہاڑ
بنا ہوا ہے۔'' اچانک میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے
پر خوفزدگی کے آثار نمودار ہوگئے ہیں۔

اس نے میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔

''ملک جابر صاحب..... واقعی جابر ہیں..... انہوں
نے گاؤں والوں سے کہا ہوا ہے کہ جنگل کے متعلق سانپ
بچھو والی بات کے علاوہ کوئی بات نہ کریں..... اب میری
زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''ایسی بات نہ کرو نظام دین..... زندگی اور موت اس
باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے..... وہی سب کا پالن ہار ہے
۔تم بالکل فکر نہ کرو..... میں دیکھوں گا..... کہ ملک کتنا بڑا
پھنے خان ہے۔ تم بلا دھڑک جو کچھ جانتے ہو..... بتا دو.....
''میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

تھانے دار صاحب میں سیدھا سادہ دیہاتی ہوں'
صرف پانچ جماعت پڑھا ہوا ہوں..... مجھے موٹی موٹی
باتیں کرنا نہیں آتا..... میرا بھائی مجھ سے جدا ہوگیا ہے' میں
اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ظلم اس لیے بڑھتا رہتا ہے کہ ہم اس
کی روک تھام کے لیے کچھ نہیں کرتے..... آپ نے مجھے
حوصلہ دیا ہے تو میں ایک دو باتیں اور آپ کو
بتا دیتا ہوں..... اس نے کچھ لمحے توقف کیا پھر گویا ہوا۔

''مجھے بھائی امام دین نے بتایا تھا کہ ملک کا باڈی گارڈ
مجھے کئی دفع کہہ چکا تھا کہ جس تم تم نے یا تمہاری کسی بکری
نے جنگل میں قدم رکھا تو سمجھو تمہارے لیے اچھا نہیں
ہوگا۔''

''پھر تمہارے بھائی نے کیا جواب دیا تھا۔

''جواب کیا دینا تھا' خاموش ہوگیا تھا۔''

یہ ایک اہم بات تھی..... لیکن سب سے حیرانگی والی

بات یہ تھی کہ آخر اس جنگل کو اتنا پراسرار کیوں بنا دیا گیا تھا؟ وہاں کیا خاص بات تھی؟

بہر حال اس کے بعد ہم تھانے میں واپس آ گئے تھے۔

ویسے میں نے ایک چھوٹی سی درخواست نظام دین سے لے لی تھی..... جس میں لکھا تھا..... کہ میرے بھائی کو پیش آنے والے واقعے کی تحقیقات کی جائے۔

شام کو اپنے کوارٹر میں جانے سے پہلے میں نے اسے ایس آئی آفاق کو اپنے دفتر میں بلالیا..... چائے پیتے ہوئے ہم نے اس واقعے کے متعلق بات چیت کی۔

''سر..... عجیب واقع ہے' اس سے پہلے تو کبھی اس قسم کا واقع نہیں ہوا..... ہمارے تھانے کا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے۔'' آفاق نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''آفاق..... مجھے تو عورت کا کھرا الجھا رہا ہے۔'' میں نے بھی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اب یہاں ہمیں تھوڑا سا محتاط رہنا پڑے گا' یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم اپنے کسی مخبر کو سن گن لینے کے لیے جنگل میں بھیج دیں۔''

''یہ تو آفاق سے جان بوجھ کر موت کے منہ میں بھیجنے کے مترادف ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن سر..... کیا ہم اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں گے۔''

''فی الحال..... تھوڑی خاموشی بہتر ہے..... تم پہلے اپنے ذرائع سے ملک جابر کے متعلق معلومات حاصل کرو.....'' میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ ٹرے میں رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے سر..... دیکھتے ہیں ملک جابر کس قسم کی گیم جنگل میں کھیل رہا ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے بھی ضروری کاغذات نمٹائے اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

اگلی صبح جب میں تھانے میں آیا' تو اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں نے ایک عورت اور ایک مرد کو برآمدے میں بچھے ہوئے بینچ پر بیٹھے دیکھا..... وہ سائل لگے..... اور.....!

اس کی تصدیق کچھ دیر بعد ہو گئی۔

میں نے جونہی اپنی سیٹ سنبھالی..... سپاہی شہباز مجھے اطلاع دی۔

''سر..... ایک مرد اور عورت جو صبح سے آئے بیٹھے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''بھیج دو بھئی دیکھیں' صبح صبح ان کو کونسی ضرورت تھانے تک لے آئی ہے۔''

پھر جب وہ میرے سامنے آئے تو میں نے بغور ان کا جائزہ لیا۔

عورت کی عمر پچاس سال کے اریب قریب ہو گی' جبکہ مرد اس سے پانچ چھ سال بڑا لگتا تھا۔

وہ میاں بیوی تھے..... عورت میں اب بھی کشش تھی..... جبکہ مرد اپنی رعنائی کھو چکا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی عابدہ منگل کی دوپہر سے غائب ہے۔''

میں نے حساب لگایا تو یہ معلوم ہوا کہ یہ وہی دن تھا جس کی شام علی بابا کے ساتھ واقع پیش آیا تھا۔ میں نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بی بی..... اتنے دن آپ کیا کرتی رہی ہیں۔''

''تھانیدار صاحب' خدا ایسی بیٹی نہ ہی دیتا تو بہتر تھا ہم اپنے طور پر ڈھونڈتے رہے ہیں' میں خدا سے دعا مانگتی رہی کہ پردے پردے میں بیٹی مل جائے تو اچھا ہے' لیکن..... ہونی کو کون ٹال سکتا ہے' مجبور ہو کر آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''آپ کی باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی بیٹی اس طرح چلی جائے گی۔''

''یہ شک تو ہمیں تھا لیکن ہماری بیٹی نے اس شک میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ ماں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

میں نے مرد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... آپ بھی کچھ بات کریں۔

"جناب...... ہماری بیٹی نے ہمیں بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا...... بہر حال میں حقیقت پسند ہوں، کہنے کو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ صفدر علی کے بیٹے نے میری بیٹی کو ورغلا کر اغوا کر لیا ہے...... لیکن کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے۔ اگر ہماری بیٹی کی مرضی نہ ہوتی تو کوئی مائی کا لال اسے نہیں لے جا سکتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے آپ کی بیٹی اور صفدر علی کے بیٹے کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی...... لیکن؟

"لیکن...... کیا تھانیدار صاحب؟" عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چونکنا مجھے عجیب لگا۔

"سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔"

"ہم نے تو اپنی بیٹی سے کہا تھا...... کہ وہ رضوان سے کہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو رشتے کے لیے بھیجے ...... لیکن...... اس نے شاید بات نہیں کی تھی...... یا اس کے والدین راضی نہیں تھے۔"

"آپ کی بیٹی کس وقت گھر سے گئی تھی۔ اور کیا کہہ کر گئی تھی؟"

"ہم جوان بیٹی کو باندھ کر تو رکھ نہیں سکتے تھے۔ یہ کام پر گئے ہوئے تھے، میں ذرا پڑوس میں ختم شریف میں گئی تھی...... جب واپس آئی تو وہ گھر میں نہیں تھی۔"

"آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہوتا۔"

"اب تھانیدار صاحب کیا دل کے پھپھولے پھوڑیں ...... بیٹی نے یہ گل کھلایا...... بیٹے کی شادی کی، دو ماہ بعد ہی وہ بیوی کو لے کر الگ ہو گیا۔"

دونوں بظاہر اولاد کے ہاتھوں ستائے ہوئے لگتے تھے۔ دکھی تھے۔

"اچھا اب آخری سوال...... میں نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولا۔

"آپ نے رضوان کا پتہ کروایا تھا؟"

"اس کے گھر والے تو کہتے تھے...... کہ وہ دو دن پہلے اپنی پھوپھی کے گھر کا بتا کر گیا تھا، اس لیے تھانیدار صاحب ہم اتنے دن ادھر ادھر اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے رہے تھے لیکن ہم آخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رضوان کے لیے ہی ہماری بیٹی گھر سے گئی ہے۔"

"بھئی...... اس بات سے ایک سوال اور نکل آیا ہے، آپ کی بیٹی گھر سے کیا کچھ لے کر گئی ہے؟"

عورت نے چند لمحے سوچا...... شاید اپنے ذہن میں کوئی حساب کتاب جوڑا...... پھر بولی۔

"گھر میں ضرورت کے لیے تین ہزار روپیہ پڑا تھا، وہ غائب ہے، میرا زیور جو چھ تولے تھا، نہیں ہے اور اس کے پانچ چھ جوڑے بھی کم ہیں۔"

"خیر...... آپ محرر کے پاس جا کر رپورٹ درج کروا دیں میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔"

پھر......!

میں نے انہیں رخصت کر دیا...... اور ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ صفدر علی کے متعلق یہ پتہ چلا تھا کہ اس کی گاؤں میں تھوڑی سی زرعی زمین ہے، جس کے اوپر وہ کھیتی باڑی کرتا تھا، اس کا بیٹا رضوان اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

میں نے سہ شام صفدر علی کو تھانے میں بلا لیا...... وہ چھریرے بدن کا ایک قبول صورت بندہ تھا۔ شکل سے معزز لگتا تھا، جیسے ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتا ہو۔

وہ میرے کہنے پر اس طرح کرسی کو دیکھ کر بیٹھا جیسے کرسی اس کے معیار کی نہ ہو۔

'میں اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ہنس پڑا۔

وہ جز بز ہو کر بول اٹھا۔

"تھانیدار صاحب...... خیر تو ہے، آپ کو میری ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"جناب کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ایک جیتی جاگتی لڑکی گم ہو گئی ہے اور اس سلسلے میں آپ کے شہزادے کا نام آ رہا ہے......" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''دیکھیں...... اس عورت کا دماغ خراب ہوا ہے۔ وہ ویسے ہی اپنی بیٹی کو میرے رضوان کے ساتھ منسلک کر رہی ہے...... رضوان تو اس دو ٹکے کی چھوکری کو اپنی نوکرانی بھی بنانا گوارہ نہ کرے پھر...... میرا بیٹا تو اس کی بیٹی کے غائب ہونے سے دو دن پہلے ہی اپنی پھوپھی کے گھر چلا گیا تھا۔''

''اچھا...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات تھانے دار صاحب......'' میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں کچھ سوالات دیکھے۔

''بات تو جو ہے وہ آخر مجھے معلوم ہو ہی جائے گی' آپ سچ سچ سب کچھ بتا دیں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا......'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جناب جو کچھ حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ آپ خواہ مخواہ میرے بیٹے کے اوپر شک کر رہے ہیں۔''

''میں خواہ مخواہ شک نہیں کر رہا' مجھے باخبر ذرائع سے یہ بات پتہ چل چکی ہے کہ آپ کے بیٹے کا عابدہ کے ساتھ چکر چل رہا تھا۔

''صرف...... عابدہ کی ماں...... کی زبانی' یا کوئی اور بھی گواہ ہے۔''

''آپ اس بات کو چھوڑیں...... کہ مجھے کس کس کی زبانی معلوم ہوا ہے' آپ یہ بتائیں' کہ آپ کی بہن کہاں رہتی ہے اور کیا آپ کے بیٹے کا پروگرام وہاں یعنی اپنی پھوپھی کے گھر جانے کا اچانک بن گیا تھا یا پہلے سے طے تھا۔''

''وہ کافی دنوں سے کہہ رہا تھا...... لیکن کھیتوں میں کام کی وجہ سے میں اسے جانے نہیں دے رہا تھا۔ آخر میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ رہا اس سوال کا جواب کہ میری بہن الفت بی بی کہاں رہتی ہے' وہ اسی شہر میں رہتی ہے' آپ کے تھانے کی حدود میں وہ جگہ ہے۔''

''پھر اس نے اپنی بہن کا پتہ بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے' میں اپنے طور پر تفتیش کرنے کے بعد دیکھتا ہوں' کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔''

اس کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا۔

ویسے وہ جاتے جاتے ایک ایسی بات کہہ گیا تھا کہ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس وقت شام کے سائے آہستہ آہستہ دھرتی پر اتر رہے تھے۔ خنکی بڑھ رہی تھی۔

میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

دوسری صبح میں جب اپنے کوارٹر سے نکلنے لگا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی...... اور مجھے چھتری کی خدمات حاصل کرنی پڑی۔ ایک گھنٹے بعد بارش رک گئی' اور سورج نے اپنی شکل دکھلا کر ہر سو گلابی گلابی دھوپ بکھیر دی۔

میں نے سپاہی شہباز کو بلا کر اسے ملک جابر کو لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب ملک جابر میرے سامنے آیا تو میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

وہ اونچا لمبا ایک صحتمند بندہ تھا۔ عمر چالیس سال سے اوپر ہوگی لیکن اچھی صحت اور رنگ و روپ کی وجہ سے تیس بتیس سال کا لگتا تھا۔ ماتھے کی بناوٹ اسے ایک سخت گیر انسان کے طور پر پیش کر رہی تھی۔

میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا...... اس نے بیٹھنے کے بعد میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب مجھے پتہ تھا کہ آپ مجھے ضرور بلائیں گے۔'

''اچھا...... میں نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا اور مزید کچھ بولنے کی بجائے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''غریب لکڑہارے کے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے...... اس کی وجہ سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ کا اس واقعے کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب...... بھلا مجھے ایک غریب لکڑہارے کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے پھر یہ تو کسی کراس نسل کے بھیڑیے کا کارنامہ ہے۔''

''آپ کو یہ سب کچھ پتہ تو لگ گیا ہے لیکن...... میں

نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

''آپ اس جنگل کے مالک ہیں' آپ نے کبھی وہاں کوئی متذکرہ بالا قسم کا بھیڑیا دیکھا تھا۔''

''اگر دیکھتا تو اسے گولی نہ مروا دیتا۔''

''پھر.....؟ میں نے جاب وجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پھر یہ جناب اس نے ایک ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔ کہ ہوسکتا ہے کسی طرف سے کوئی بھولا بھٹکا بھیڑیا ادھر آ ہی نکلا ہو؟''

''کیا اس کا امکان ہے؟''

''دیکھیں..... جناب چونکہ آپ نے مجھ پر کسی قسم کا شک کیا ہے اس لیے میں آپ کو یہ بات بھی بتا دیتا ہوں کہ نذیرے کے پاس اس قسم کا ایک بھیڑیا دیکھا گیا ہے..... اس نے کسی شکاری سے کئی سال پہلے خریدا تھا۔''

''اوہ..... یہ نذیرا کون ہے؟''

اس نے مجھے نذیرے کے متعلق بتایا۔ میں نے اس کے متعلق معلومات اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیں۔

اس دوران آفس بوائے چائے کی ٹرے میز پر رکھ گیا تھا اور ہم نے اس سے دو دو ہاتھ کرلیے تھے۔

ویسے میں نے ایک اندازہ لگالیا تھا کہ ملک جابر کسی طور بھی گڈریے والے واقعے کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔

''ملک صاحب' اب ذرا دوستانہ ماحول میں بات چیت کرتے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' کیا اب تک دشمنوں کی طرح باتیں کرتے رہے ہیں۔''

''دیکھیں وہ ایک تفتیشی گفتگو تھی..... میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جناب' ویسے میں نے تو سن رکھا ہے کہ تھانیدار صاحب کو ان کے دوست بھی ملنے جائیں تو وہ چائے کے ساتھ ہنٹر (چمڑے کا مجرموں کو مارنے والا)

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبو سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانیوں پر آپ کے تبصروں پر مشتمل خطوط (گفتگو) ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆ خصوصی توجہ: ای میل سے کہانیاں ارسال کرنے والے مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے اختتام پر اپنا اردو میں مکمل ایڈرس اور موبائل فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

☆ نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

منگوالیتے ہیں۔'' ملک صاحب نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

میں نے اس فقرے پر ایک قہقہہ لگایا اور مزاح کے رنگ میں ہی بولا۔

''ملک صاحب سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا کریں' دیکھیں میں نے تو چائے کے ساتھ بسکٹ منگوائے تھے۔ خیر اس بات کو چھوڑیں آپ اپنے جنگل کے متعلق کچھ بتائیں۔''

''جنگل کے متعلق.....'' اس نے زیرلب دہرایا پھر گویا ہوا۔ ''میرا جنگل کوئی طلسم ہوشربا قسم کا نہیں ہے' بس عام سا چھوٹا سا جنگل ہے' جسے لوگوں نے پراسرار جنگل کا نام دے دیا ہے۔''

''کیا یہ بات سچ ہے کہ وہاں باکثرت سانپ اور بچھو پائے جاتے ہیں؟''

''جنگل میں یہ چیزیں تو ہوتی ہی ہیں۔'' اس نے اس موضوع سے کنی کترانے والے لہجے میں کہا۔

''لیکن لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ سانپ بچھو اتنے زیادہ ہیں کہ پاؤں کے نیچے آتے ہیں۔'' میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بادشاہ آدمی ہیں۔ آپ سے کچھ چھپا کر ہم نے مشتبہ ہونا ہے' دراصل ہم نے خود یہ مشہور کروایا ہوا ہے ورنہ وہاں یہ چیزیں نارمل ہی ہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''جناب' آپ کسی دن تشریف لائیں تو میں آپ کو جنگل دکھاؤں' پھر آپ اندازہ لگالیں گے' کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

''خیر..... انشاء اللہ کسی دن ضرور آؤں گا۔ فی الحال آپ خود ہی بتادیں۔''

''دراصل جنگل میں بہت قیمتی جڑی بوٹیاں اور لکڑی ہے۔''

''اوہ تو یہ بات ہے..... لیکن میں نے تو سنا ہے کہ لوگ چوری چھپے پھر بھی لکڑیاں کاٹنے جاتے ہیں اور وہاں خرگوشوں کا شکار بھی ہے۔''

''جناب' اس کی روک تھام کے لیے میں نے منصوبہ بندی کرلی ہے' میرا ایک دوست شمشیر خان ہے' وہ لکڑی کا کام کرتا ہے' میں جلد ہی اسے ٹھیکہ دینے والا ہوں۔''

''خیر یہ تو آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے تو یہ سب اس لیے معلوم کیا ہے کہ آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں' تاکہ بعد میں میرے لیے یا آپ کے لیے پریشانی کا باعث نہ ہو یہ جنگل۔''

''تھانیدار صاحب' آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر' ویسے ایک بات میں آپ کو برملا بتادیتا ہوں' کہ میں اتنا بھی ظالم نہیں ہوں جتنا لوگوں نے مشہور کروادیا ہے۔ اگر میں یہ تھوڑی بہت سختی یا روک ٹوک نہ کروں تو لوگ میرے جنگل کا ستیاناس کردیں۔ کیونکہ آپ نے یہ تو سن رکھا ہے کہ زیادہ میٹھے بندے کو لوگ نگل جاتے ہیں..... اوہ..... میں بھی کتنا بے وقوف بندہ ہوں۔ اتنی لمبی چوڑی تقدیر کرڈالی..... آپ مشورہ دیں۔''

''مشورہ..... میرا بھی یہی تھا کہ آپ جنگل کی حفاظت کے لیے کوئی معقول بندوبست کریں' لیکن..... یہ خیال رکھیں کہ بندہ ٹھیک ہوں' جرائم پیشہ نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے جناب..... اب اگر آپ اجازت دیں تو مہربانی ہوگی۔''

''میری تفتیش مکمل ہوچکی تھی۔ اس لیے میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

قارئین ایک بات میں آپ کو بتادیتا ہوں کہ کچھ عرصہ بعد اس جنگل نے مجھے پاگل کردیا تھا..... یہ کہانی پھر کبھی سناؤں گا۔

دیکھیں' بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ صحیح تفتیش کرنے کے لیے بال کی کھال اتارنی پڑتی ہے..... ہر بات کی تہہ تک پہنچنا پڑتا ہے۔ غیرضروری اور بے شمار سوال کرنے پڑتے ہیں' تب کہیں جاکر کوئی ہر مراد ہاتھ آتا ہے۔

اب تک کی تفتیش سے دو اہم سراغ میرے ہاتھ آئے

تھے' اسی شام کو میں نے سادہ لباس پہنا..... اور سپاہی عظمت کو ساتھ لے کر صفدر علی کی بہن کے گھر پہنچ گیا۔

سپاہی عظمت بھی سادہ لباس میں تھا۔

اس کا گھر مین بازار سے چند کوس دور ایک محلے میں تھا۔ وہاں تنگ تنگ گلیاں تھیں' اور کئی مکان دو دو تین تین منزلہ تھے۔

الفت بی بی کا مکان بھی دو منزلہ تھا۔ تعارف کے بعد انہوں نے ہمیں نچلی منزل میں بنی بیٹھک میں بٹھایا۔

''الفت بی بی درمیانے قد اور اپنے بھائی کی طرح چھریرے بدن کی قبول صورت عورت تھی۔ عمر اٹھائیس سال کے اریب قریب ہوگی۔ اس نے ہماری خاطر تواضع کرنے کے لیے تک ودو کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے منع کر دیا اور اسے بتایا کہ ہم کس سلسلے میں آئے ہیں۔

''تھانیدار صاحب' آپ کا آنا سر آنکھوں پر' لیکن ہمارا عابدہ کے معاملے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''بی بی ہمیں ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا ہے..... میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' آپ کے بھتیجے رضوان کا اس سلسلے میں نام آیا ہے' اس لیے اور.....؟''

''تھانیدار صاحب رضوان ابھی میرے گھر میں ہی ہی آپ اس سے پوچھ گچھ کر لیں نہ میدان دور ہے' اور نہ گھوڑا'.....'' اس نے ایک معقول بات کی۔

''بی بی' اس سے بھی پوچھ گچھ کر لیں گے تم یہ بتاؤ تمہارا بھتیجا کس دن اور کس وقت تمہارے پاس آیا تھا۔''

''اتوار کو دن تقریباً ایک بجے آیا تھا..... دوپہر کا کھانا اس نے یہاں ہی آ کر کھایا تھا۔''

''میری معلومات کے مطابق رضوان کی ابھی شادی نہیں ہوئی' کیا تم بہن بھائی نے اس کی شادی کے متعلق نہیں سوچا۔''

''سوچنا کیا ہی' تھانیدار صاحب' بھائی نے بچپن ہی سے اس کی منگنی کی ہوئی ہے۔''

''کس کے ساتھ؟ کہاں؟''

''ادھر گاؤں میں ہی' زیلدار بہادر علی کی بیٹی فیروزہ کے ساتھ۔''

''کیا..... رضوان اس رشتے سے خوش ہے؟''

''اب میں آپ کو کیا بتاؤں؟ رضوان اس سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ میں بھائی سے بات کر کے جلد از جلد فیروزہ کو اس کی دلہن بنوا دوں۔''

''ٹھیک ہے آپ رضوان کو بھیج دیں۔''

چند لمحوں بعد ایک چھریرے بدکا جوان میرے سامنے تھا۔ لگتا تھا خاندان میں سب کی کاٹھ ایک ہی ہے' اس نے ذرا بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔

میں نے ذرا غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا..... وہاں مجھے سکون ہی سکون نظر آیا تھا۔

''رضوان کیسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بس تھانیدار صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم شادی کے چکر میں ادھر آ ہو۔''

''بس جناب..... کیا کریں' جو کام وقت پر ہو جائے اچھا ہوتا ہے۔''

''بات تو تمہاری معقول ہے' لیکن عابدہ کا کیا چکر ہے؟''

''کوئی چکر نہیں' تھانیدار صاحب' وہ لوگ ویسے ہی مجھے پھنسانے کے چکر میں ہیں۔''

''کوئی کسی کو بلاوجہ کسی معاملے میں ملوث نہیں کرتا..... جوان' رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔''

''لیکن یقین کریں یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔''

''پھر کیا معاملہ ہے؟'' میں نے بال کی کھال اتارتے ہوئے کہا۔

''معاملے کے متعلق تو والد صاحب ہی آپ کو بتا سکتے ہیں' میں تو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ عابدہ کے ساتھ میرا رتی برابر تعلق نہیں' مجھے تو فیروزہ..... اچھی لگتی ہے اور میں جلد از جلد اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔''

میں نے اسے فارغ کر دیا' جب وہ جانے لگا تو میں نے اسے کہا' اپنی پھوپھی کو بھیج دے۔ دراصل میں اس

بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا جو صفدر علی نے مجھے بتائی تھی۔

پھر..... میں نے الفت بی بی (رضوان کی پھوپھی) سے وہ بات کی تھی۔ اس نے بات کی تصدیق تو کی تھی لیکن ؟

بہرحال بات کیا ہوسکتی ہے' آپ ذرا ذہن دوڑائیں کیونکہ وہ بات ابھی میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

اس کے بعد ہم ظاہر ہے تھانے میں واپس آ گئے تھے۔ یہاں البتہ یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ جس دور کی میں کہانیاں سنا تا ہوں اس وقت تھانے میں سرکاری گاڑیاں ہوتی تھیں..... یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں تا کہ آپ اس الجھن کا شکار نہ ہوں کہ صرف اتنا لکھ دیا جاتا ہے کہ ہم تھانے میں واپس آ گئے یا فلاں جگہ چلے گئے تھے۔

دوران تفتیش ایک نام آیا تھا۔ نذیراں' اس کے متعلق میں نے مخبروں کو کہہ دیا تھا کہ اس کے متعلق تحقیقات کر کے بتائیں۔

اسکا پتہ تو مجھے ملک جابر نے بتا دیا تھا..... وہ محبت آباد کا باسی تھا۔ وہاں ان کے کھیت تھے..... وہ سیر و تفریح کا رسیا تھا اور اس کے پاس کراس نسل کا ایک بھیڑیا تھا..... صرف اتنی معلومات ہی اب تک میرے پاس پہنچی تھیں۔

لیکن یہاں یہ سوال سر اٹھائے کھڑا تھا..... کہ اگر گڈریا اور اس کی بکریاں اسی کے بھیڑیے کی چیرہ دستیوں کا شکا رہوئی تھیں تو وہ بھیڑیے سمیت وہاں کیوں گیا تھا؟ یا وہاں سے کیوں گزر رہا تھا؟ کیا جوان عورت اس کے ساتھ تھی .....جس کا کھرا ملا تھا..... اس جیسے اور بھی کئی سوالات میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اب اگر نذیراں میرے ہتھے چڑھ جاتا تو سارے سوالات کے جواب مجھے مل جاتے۔

دوسرے دن یہ بات ایک مخبر نے بتائی کہ نذیرا..... کارشتے دار ہے یہ بات سن کر میرا دماغ روشن ہوگیا..... اور جب میں نے دوسری بات کو ساتھ ملا کر سوچا..... تو..... مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

مجھے بے وقوف بنایا گیا تھا..... بادی النظر میں جو حالات نظر آ رہے تھے..... حالات ایسے نہیں تھے..... میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو پانے کمرے میں طلب کیا..... اور اسے کہا کہ وہ سپاہی شہباز کو ساتھ لے جائے اور دونوں کو لے آئے۔

جب وہ میرے سامنے آئے تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا ہے اور ان پر گھبراہٹ طاری ہے۔

میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر ان سے کہا کہ وہ مجھے مزید بے وقوف نہ بنائیں اور سچی بات بتا دیں۔

پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ دونوں تھے کون؟

قارئین یہ عابدہ کے والدین تھے..... عابدہ کا والد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب' ہم انتقام میں اندھے ہوگئے تھے' ہم نے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا' لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا..... آہ ہم نے یہ کیا کیا' پھر وہ رونے لگ گیا تھا۔

''دیکھو..... اب یہ ڈرامہ بازی بند کرو اور سچی بات جلدی بتاؤ ورنہ؟'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ مجھے ان دونوں پر بہت غصہ تھا..... پہلے انہوں نے میرے ساتھ جھوٹ پر جھوٹ بولے تھے۔

''تھانیدار صاحب ہم نے پہلے بھی اداکاری نہیں کی تھی' واقع ہم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے' ہماری بیٹی واقعی گم ہوگئی ہے۔ ہم نے اس طرح تو نہیں چاہا تھا۔

بہرحال ان کی زبانی مجھے جو حالات معلوم ہوئے وہ میں آگے گوش گزار کر دیتا ہوں۔

ایک دفعہ عابدہ کے تایا شفقت علی کا پانی کے مسئلے پر ساتھ ملے کھیتوں کے مالک کبیر سے جھگڑا ہوگیا تھا' اور وہ شفقت علی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اس واقعے کا صفدر علی چشم دید گواہ تھا۔ جب کیس عدالت میں گیا تو عابدہ کے باپ نے صفدر علی کو کہا کہ وہ گواہی نہ دے' اسے مالا مال کر دیا جائے گا' لیکن صفدر علی نے کہا کہ اگر اسے سارے جہان کی دولت بھی دے دی جائے تو وہ حق سچ کو بول بالا کرنے کے لیے گواہی ضرور

دے گا۔

پھر اس کی گواہی پر شفقت علی کو سزائے موت ہوگئی تھی۔ یہ بات عابدہ کے باپ نزاکت علی نے دل میں رکھ لی تھی۔ نذیر عرف نذیرا عابدہ کا تایا زاد اور شفقت علی کا بیٹا تھا۔ ایک دن اس نے یہ بیوقوفانہ مشورہ اپنے چچا نزاکت علی کو دیا کہ کسی دن میں عابدہ کو لے جاؤں گا..... اور آپ صفدر علی کے بیٹے رضوان کے خلاف پرچہ کٹوا دیجیے گا' میں ایک دور افتادہ جگہ پر اپنے دوست ضمیر کے گھر عابدہ کو رکھوں گا..... اگر ہمارا منصوبہ کامیاب ہوگیا تو..... رضوان جیل کی ہوا کھائی گا..... ویسے میں اسے پھانسی پر لٹکتا دیکھنا چاہتا ہوں' اب..... نہ عابدہ کا کوئی پتہ ہے اور نہ نذیر مل رہا ہے..... دونوں ایسے غائب ہوگئے ہیں کہ جیسے کبھی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے تھے۔

'میں نے دونوں میاں بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیا..... اللہ کی بے آواز لاٹھی کیسے تمہارے سر پر پڑی ہے۔''

''تم نے ایک بے وقوف کا مشورہ مان کر کتنی بڑی مصیبت مول لے لی ہے۔''

''تھانیدار صاحب مجھے تو اب محسوس ہو رہا ہے کہ نذیر بے وقوف نہیں تھا۔'' عابدہ کی ماں کشور بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے.....؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ کافی عرصے سے عابدہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی پر رضامند ہو جائے لیکن وہ یہی کہتی تھی کہ میں نذیر سے کبھی شادی نہیں کروں گی' ہو سکتا ہے' اسی طرح وہ ہمیں بے وقوف بنا کر عابدہ کو لے گیا ہو۔''

لیکن عابدہ کیسے اس کے ساتھ چلی گئی؟' میں نے اپنے ذہن میں آئے ہوئے سوال کو لفظوں کی زبان دیتے ہوئے کہا۔

'دراصل یہ بھی میری غلطی تھی۔ میں نے اسے اپنے دودھ کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ وہ نذیرے کے ساتھ چلی جائے' ہم اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں۔''

''بی بی..... اب یہ بات کرنے کا فائدہ تو کوئی نہیں ہے' لیکن تم لوگوں کے کان کھولنے کے لیے کہتے دیتا ہوں کہ صفدر علی نے حق سچ پر گواہی دی تھی' اس کے ساتھ دشمنی بنتی ہی نہیں تھی۔''

دونوں نے سر جھکا لیا' ان کے پاس میری اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اب ہم دونوں کے ساتھ آپ کیا سلوک کریں گے؟''

''ویسے تو یہ سیدھا سادہ پولیس کے ساتھ فراڈ کا کیس بنتا ہے۔ اور دوسرے اگر صفدر علی چاہے تو آپ لوگوں کے خلاف کیس کر سکتا ہے' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔

''ہم بہت شرمندہ ہیں' آپ ہماری بیٹی کو کسی طرح ڈھونڈ دیں۔ تو ہم ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... آپ فی الحال گھر جائیں اور دعا کریں کہ خدا کچھ بہتر کرے لیکن آپ لوگوں نے جو کچھ کر دیا ہے اس کے بعد مجھے بہتری کی امید کم ہی ہے۔''

وہ چلے گئے' اور میں سوچنے لگا کہ انسان کتنا خود غرض ہے..... اپنی انا کی تسکین کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرتا..... یہ کیس میرے یادگار کیسوں میں سے ایک ہے اور اس کی ضروری ضروری باتیں میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی تھیں۔

اب سوال یہ تھا کہ نذیر عابدہ کو لے کر کہاں غائب ہوگیا تھا؟

ویسے اس بات کی وضاحت عابدہ کے والدین نے کر دی تھی کہ جنگل کے ساتھ ایک ویرانہ جگہ پر نذیر اپنے بھیڑیے کے ساتھ کھڑا تھا۔ عابدہ کو وہاں تک اس کا باپ لے کر گیا تھا' بقول نذیر کے وہ گاؤں میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ کسی کی نظر اس کے بھیڑیے پر نہ پڑ جائے..... اور نہ اس کے ساتھ عابدہ کو کوئی دیکھ سکے۔ یہ جگہ میرے اندازے کے مطابق اس جگہ سے تھوڑی ہی پیچھے تھی۔ جہاں گڈریے کی لاش اور ادھ کھائی ہوئی بکریاں' مطلب ہے ان کی لاشیں ملی تھیں۔

اب نذیر مل جاتا تو باقی عقدہ کھلتا۔

ہمارے مخبر اپنا کام کر رہے تھے۔ چار دن اسی طرح گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی۔

پانچویں دن یہ صبح نو بجے کی بات ہے' کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جب ریسیور اٹھاتے ہوئے السلام علیکم کہا تو دوسری طرف سے گونجدار آواز میں وعلیکم السلام کہا گیا..... پھر میرے دوست نذر گوندل کی آواز سنائی دی۔ وہ ان دنوں قریبی شہر کے تھانے میں تعینات تھا۔

''خالد کیسے ہو..... کبھی یاد ہی نہیں کیا؟''

''یہی سوال آپ سے بھی ہے.....'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دوسری طرف سے ایک قہقہہ سنائی دیا پھر فوراً اس قہقہے میں بریک لگ گئے اور نذر گوندل کی آواز سنائی دی۔

''دیکھو میں نے آج یاد کر لیا اور تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔''

''خوشخبری..... میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''بالکل' زبردست خوش خبری ہے۔ تمہارے دونوں مطلوبہ بندے ہمارے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ میرے اہلکاروں نے انہیں مشکوک سمجھ کر ریلوے اسٹیشن سے گرفتار کیا ہے اور ان کی کہانی سنسنی خیز ہے۔ مرد تو بڑا بودا ثابت ہوا ہے اس نے ضرف دو تھپڑ کھانے کے بعد ہی سب کچھ اگل دیا ہے۔''

''بڑی مہربانی' گوندل صاحب..... میرے اور آپ کی ایک پارٹی ڈیو ہو گئی ہے۔ میں اپنے اے ایس آئی اور سپاہی کو بھیج رہا ہوں۔''

''اوہ..... بھائی تمہیں کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے' میرے تھانے کا اے ایس آئی منظور وڑائچ اور دو سپاہی مطلوبہ بندوں' میرا مطلب ہے ایک بندے اور ایک بندی کو لے کر آ رہے ہیں۔ دو گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ کاغذوں کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... میں منتظر ہوں۔''

پھر..... سلسلہ منقطع ہونے پر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

واقعی دو گھنٹے بعد نذیر اور عابدہ میرے سامنے تھے۔

ایسے کیسوں میں دونوں تھانوں کو اپنی کارروائی ڈالنی ہوتی تھی۔ یہ تو ایک علیحدہ جھنجٹ ہے۔ میں آپ کو آگے کی کہانی سناتا ہوں۔

نذیر نے اس تھانے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں' ایسے مجرم جب تک پولیس کے ہتھے نہیں چڑھتے ..... بچے رہتے ہیں لیکن جونہی پولیس کی گرفت میں آتے ہیں رٹو طوطے کی طرح بولنے لگتے ہیں۔

میں نذیر کا بیان' جسے ہم اپنی زبان میں اقبالی بیان کہتے ہیں سنا دیتا ہوں۔

''تھانے دار صاحب' عابدہ مجھے لڑکپن سے ہی اچھی لگنے لگی تھی لیکن یہ مجھ سے دور بھاگتی تھی۔ جوں جوں یہ مجھ سے دور بھاگتی تھی میں اس کا اور زیادہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا..... پھر ہم جوانی کی دہلیز تک آ پہنچے..... لیکن معاملہ ہنوز دلی دور است والا تھا۔ مجھے ضد سی ہو گئی..... کہ عابدہ کو ہر صورت میں حاصل کروں گا' پھر میرے والد صاحب والا واقع ہو گیا' میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ میں انتقام میں اندھا کیوں وہا تھا؟ جب ذہن پر صرف انتقام سوار ہو تو انسان کو ہر سوچنے کی مہلت کب ملتی ہے ..... کہ وہ انتقام لینے کے معاملے میں حق بجانب ہے یا نہیں.....؟ بہر حال زیادہ جنون مجھے عابدہ کو حاصل کرنے کا تھا۔ اگر انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع ملا جاتا' تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہو جاتا' درمیان سے وہ باتیں حذف کر کے میں آگے کا بیان سناتا ہوں۔ (جو آپ پڑھ چکے ہیں) تھانیدار صاحب میں نے جس طرح عابدہ کو گھر سے نکلنے پر مجبور کیا' وہ آپ کے علم میں آ چکا ہو گا۔ میں گاؤں سے باہر اس لیے کھڑا ہو گیا تھا کہ گاؤں والوں کی نظر میں نہ آ جاؤں..... آج میں اس بات کا برملا اقرار کرتا ہوں کہ کراس نسل کے

اپنے بھیڑیے کو اگر میں اس دن نہ لے کر جاتا تو شاید غریب گڈریا ایسے انجام سے دوچار نہ ہوتا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے' ایک ذات اوپر بھی بیٹھی ہوئی ہے..... میں جونہی عابدہ کو لے کر آگے بڑھا مجھے سامنے گڈریا علی بابا نظر آیا..... یہ بات تو میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی کہ اس طرف آنے سے علی بابا سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے..... ادھر بھیڑیے نے بکریوں کو دیکھ لیا بس پھر کیا تھا؟ اسنے زور لگا کر میرے ہاتھ سے زنجیر چھڑا لی اور بکریوں کی طرف دوڑ لگا دی..... ادھر کلہاڑی تان کر علی بابا اس کی طرف گیا' اتنی دیر میں بھیڑیا تین بکریوں کو گرا چکا تھا' باقی بکریاں ادھر ادھر ہو گئی تھیں..... ہم ابھی پیچھے تھے' علی بابا کی نظر ہم پر نہیں پڑی تھی..... ویسے بھی وہ غصے میں تھا..... جونہی کلہاڑی سے ہلکا سا زخم بھیڑیے کی گردن پر آیا..... وہ باؤلا ہو گیا..... اور علی بابا پر حملہ کر دیا اور ہمارے پہنچنے تک وہ علی بابا کو چیر پھاڑ چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر انسان کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں' ہم سے کچھ بھی نہ ہو سکا..... جب مجھے حقیقت کا ادراک ہوا تو میں نے دیکھا عابدہ کا رنگ سفید ہو گیا ہے..... میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کے ہاتھ پاؤں ملنے شروع کر دیئے۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش آیا..... وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

''یہاں سے چلو..... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے.....

میں نے ادھر ادھر دیکھا' لیکن بھیڑیے کا نام و نشان تک نہیں تھا' یقین کریں اس کے بعد آج تک مجھے بھیڑیا نظر نہیں آیا..... میں نے عابدہ کی طرف دیکھا..... اس کی حالت پھر غیر ہو رہی تھی۔ میں نے بھیڑیے کو بھول کر عابدہ کو سہارا دیا..... اور ہم چل پڑے..... وہ رات ہم نے بڑی مشکل سے اپنی گاؤں (محبت آباد) میں گزاری..... اب واپسی کی راستے مسدود ہو گئے تھے۔ ورنہ میں عابدہ کو واپس چھوڑ آتا..... اگلے کچھ دن ہم نے اپنے دوست کے پاس گزارے..... میں نے دیکھا کہ دوست کچھ پریشان سا ہی' منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مارے مروت کے..... لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ وہ اندر سے ڈر رہا ہی' یہ تو ایک فطری عمل تھا کو کچھ ہو چکا تھا وہ میں نے دوست کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اس کی بیوی ذکیہ بھی کچھ پریشان سی تھی۔ ہم نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا..... لاہور میں کچھ دن گزارنے کے بعد یقین کریں میرا ارادہ خود کو قانون کے حوالے کر دینے کا تھا..... لیکن..... وہ خاموش ہو گیا۔

'وہ دونوں پکڑے گئے تھے' اس کا ارادہ خود کو قانون کے حوالے کرنے کا تھا..... یا نہیں؟ اب یہ بحث فضول تھی۔

کیونکہ اب تو وہ قانون کی گرفت میں تھے۔

عابدہ نے بہت مختصر سا بیان دیا تھا..... لیجیے جاتے جاتے وہ بھی سن لیجیے۔

''تھانیدار صاحب' ماں جب دودھ کا واسطہ دیا' تو میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں وہ منظر کبھی نہ بھول سکوں گی..... جب میں نے غریب گڈریے کی کٹی پٹی لاش دیکھی تھی..... شاید قدرت نے یہ سب کچھ مجھے دکھانا تھا' آخر میں اس نے کہا۔ تھانیدار صاحب' ہمیں کتنی سزا ہو گی..... میں نذیرے سے شادی کرنے پر رضامند ہوں۔ اس نے میرا دل جیت لیا ہے۔''

ویسے قارئین میرے خیال میں' یہ سارے انا پرست اور اپنے اپنے نفس کے قیدی تھے۔

اجر تا عشق

قرۃ العین سکندر

وہ مطمئن تھی اس نے سب کی محبت اور توجہ حاصل کرلی تھی مگر اس طویل سفر میں شریک سفر کی محبت ہی حاصل نہ کرسکی اس کی زندگی میں یہی ایک نہ محسوس کی جانی والی خلش تھی۔

اجڑے عشق کا فسانہ جو بڑی دیر بعد بہار آشنا ہوا تھا

وہ ایک عام سا ہی دن تھا' وہ گلاس ونڈو سے باہر ہونے والی بارش کے پرلطف نظارے میں محو تھی' سرسبز درختوں کو بارش نے ہولے ہولے نم کرکے انہیں سیرابی بخشی تھی' ہر شے ہی نکھری دھلی دھلی سی لگ رہی تھی' بارش اس کی کمزوری رہی ہے' بارش میں نک کر بیٹھ جانا اس کے بس میں نہ رہتا تھا' بارش میں وہ بی جان سے کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے باہر کی راہ لیتی تھی۔ کبھی قریبی پارک میں چل دیتی اور کبھی یونہی شاپنگ کے لیے چل دیتی۔ قطرہ قطرہ پانی کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرنے کا الگ ہی مزہ تھا مگر شادی کے بعد کئی سالوں سے یہ سلسلہ موقوف تھا' وہ ایک پابند سلاسل زندگی بسر کررہی تھی۔ اب ہر قدم اٹھانے سے قبل کئی بار سوچنا پڑتا تھا' کیا جبیل کے لیے وہ اب پرائی ہوگئی تھی۔ اس کی اور جبیل کی ملاقات بھی تو اس بارش میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں جی کے اصرار پر پھل سبزیاں خریدنے کے ارادے سے نکلا تھا کہ اچانک بادلوں نے آنکھ مچولی دکھانا شروع کردی تھی اور دوسری جانب نیلم بھی بارش کی تک تک کانوں میں پڑتے ہی' تھیلا تھامے نکل پڑی تھی یوں ہی ادھر سے ادھر پھدک رہی تھی' وہ خدا کی صناعی کا مکمل نمونہ تھی۔ خوبصورت غزالی آنکھیں گھنیری پلکیں گلابوں کی سی سرخی رخساروں پر دمکتی ہوئی تھی۔

وہ یوں ہی مبہوت سا اسے یک ٹک تکے گئے تھے۔ وہ ان کی نظروں کی فسوں خیزی سے بے خبر ہاتھوں میں پانی کے قطروں کو محویت سے اپنے ہاتھوں کی پوروں میں جذب کررہی تھی۔ ایک دم نجانے کیا سوچ کر وہ کھلکھلا کر ہنسی تو موتیوں جیسے دانت جگمگاتے ہوئے ایک لڑی کی صورت میں پروئے ہوئے لگے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے' صبح صبح ہی وقت کیوں کھوٹا کررہی ہو' کام کاج کا ہوش نہیں تمہیں۔'' اپنے عین عقب سے آتی ثریا آپا کی آواز پر وہ بری طرح سٹپٹائی تھی۔ وہ جو اس ایک لمحہ وصل میں بری طرح جذب ہوکر اپنے اردگرد سے بے بہرہ ہوچکی تھی۔ وہ اک لمحہ وصل جو اسے نئی طاقت دے جاتا تھا' ہر نئے طلوع ہونے والے دن میں تھکا دینے والی مسافت میں ایک گھڑی دم بھر سانس لینے کا مجاز بنتا تھا' وہ اک لمحہ وصل اس کے ہاتھوں کی پوروں سے پھسل گیا تھا۔ وہ بے حد مایوسی سے مڑی تھی' ثریا آپا نے اس کے چہرے پر بکھرے آس سے لے کر پاس تک کے سبھی بکھرے ہوئے رنگ بے حد محویت سے دیکھے تھے' اس لیے ٹھنڈی سانس بھری اور طمانیت سے بولیں۔

''تم خود کو خوابوں میں رکھنا چھوڑ دو اب تم جبیل کی محبوبہ نہیں بلکہ اس کی بیوی ہو اور محبوبہ کو دل سے اترتے دیر نہیں لگتی ہے جب وہ بیوی کی مسند پر آن جمان ہوتی ہے' اس کو ہر قدم بے حد پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے اور تم تو اپنی ہی دنیا میں جیے جاتی ہو۔''

وہ ثریا آپا کا اشارہ سمجھ گئی تھی تبھی جلدی سے سارے کام کرنے لگ گئی تھی۔ صبح سویرے نگہت بیگم اور نصیر صاحب کو چائے کے کپ کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ وہ نماز فجر کی

ادائیگی کے بعد سب سے پہلے چائے کی طلب محسوس کرتے تھے۔اس لیے وہ پہلے چائے بنانے لگی' دوسری طرف ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔

نصیر صاحب اور نگہت بیگم کے چار بچے تھے۔سب سے بڑی ثریا آپا تھیں' جن کا گھر قریب بھی تھا' وہ ہر دوسرے دن ادھر ہی پائی جاتی تھیں' وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں اپنی گھر داری میں وہ لطف نہیں ملتا جو دوسروں کی گھر داری میں اسرار و رموز جان کر ملتا ہے۔

پھر جمیل تھے۔اس کے بعد عامر اور سب سے چھوٹی فریحہ تھی۔فریحہ نازوں پلی تھی۔ابھی کالج میں پڑھتی تھی' اس کو ابھی تک بچہ جان کر گھر گھر ہستی کے کاموں سے دور رکھا جاتا تھا۔

یوں ثریا آپا ان کے تین بچے اور باقی تمام اہل خانہ کے لیے اس نے عین وقت پر ناشتہ کا اہتمام کرنا ہوتا تھا۔ذرا سی دیر پر ثریا آپا اس کو بے نقط سناتی تھیں۔

کبھی کبھار تو اس طرح کے طنزیہ جملے بولتی تھیں کہ اس کو اپنی روح اندر تک چھلنی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔اس خوف کے سائے تلے وہ اپنے تمام کام وقت پر ہی انجام دینے کی سعی میں ہلکان ہو جاتی تھی۔وہ اپنے گھر میں دوسرے نمبر پر تھی۔پہلے بھائی تھے پھر چھوٹی ندا تھی۔

مگر ان کے گھر میں کوئی اتنی روک ٹوک نہ تھی۔اگرچہ بھابی بھی آچکی تھیں مگر سارے کام خود ان کی والدہ طاہرہ بیگم سرانجام دیتی تھیں۔ثوبان بھائی اور عالیہ بھابی بھی ماں کے آرام کا خوب خیال رکھتے تھے۔ان کا اپنا گھرانہ بے حد مثالی تھا۔جہاں ساس بہو کی روایتی چپقلش کا شائبہ تک نہ تھا۔وہاں ایک پرسکون فضا ہوا کرتی تھی۔جبکہ یہاں ہر کام پر بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ سہہ سہہ کر نیلم اپنی خود اعتمادی کھوتی جا رہی تھی۔اس کا وہ مسکراتا ہوا اٹھکیلیاں کرتا وجود اب ہر وقت ہراساں رہنے لگا تھا۔

جمیل بھی ماں اور بہن کی عینک لگا کر ہی منصف بن کر فرائض سرانجام دینے لگتا تھا۔پھر اسے بھی ماں اور بہنوں کی طرح نیلم کے ہر کام میں مین میخ نکالتے دیر نہیں لگتی تھی۔نصیر صاحب سمجھاتے تھے۔

''تم لوگ کچھ تو عقل سے کام لو اور نگہت بیگم یہ ثریا کا زیادہ آنا جانا مناسب نہیں ہے' اسے اپنے گھر گھر ہستی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس کی اپنی بچیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی ہیں۔کیا وہ ماں سے یہی سیکھ رہی ہیں۔ہر وقت نیلم کا پیچھا کرنے سے بہتر ہے اپنے گھر کو قرینے سے سنوارے نکھارے میاں کو راضی رکھے۔''

نصیر صاحب متانت سے سمجھاتے تھے مگر کوئی بھی ان کی بات پر خاص کان نہ دھرتا تھا۔اس کی اصل وجہ تو یہ تھی اک عرصہ دراز سے اس گھر پر نگہت بیگم کی حکومت رہی تھی۔انہی کے حکم کا سکہ چلتا تھا۔اب اچانک نصیر صاحب کی بات پر کیسے عمل درآمد ہو سکتا تھا۔پھر جب نصیر صاحب زیادہ زور دیتے تو ثریا تین دن میکے سے واپس سسرال کی راہ لیتی تھی اور پھر دوبارہ واپس آجاتی تھی۔نیلم کی بے ثبات زندگی میں ہم نفس ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی تھی۔

جمیل کے محبت کے وہ تمام دعوے جو شادی سے قبل اس نے

کیے تھے' دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

ناشتے کی ٹیبل پر تمام اہل خانہ موجود تھے۔ وہ تیزی سے سب کی من پسند کھانے کی ڈشز ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

''تم نے عامر کے لیے جوس نہیں نکالا بچہ سارا دن پڑھ کر ہلکان ہو جاتا ہے۔ صبح سویرے اسے جوس دیا کرو۔''

نگہت بیگم نے اسے نیا حکم سنایا تو وہ اپنے قدموں پر واپس پلٹنے والی تھی جب عامر کی آواز پر رک گئی تھی۔

''بھابی رہنے دیں' میں آج پراٹھا انڈہ ہی کھالوں گا اور امی کچھ تو خیال کریں اتنے سارے افراد کا فرمائشی ناشتہ ہی کافی ہے میں اس فرمائشی لسٹ میں شامل نہیں ہوسکتا۔'' عامر نے کہا۔

نگہت بیگم نے خشمگیں سی نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ ''اب اس لڑکی کے پیچھے تم اپنی ماں کی بات رد کرو گے؟''

نگہت بیگم کی بات پر فضا میں گہری خاموشی کی فضا تن گئی تھی۔

''نہیں امی میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں آپ کی دل شکنی نہیں کررہا میں تو.....'' عامر نے وضاحتی لہجہ میں کہا تھا' مگران کی بات درمیان میں ہی ثریا نے اچک لی تھی۔

''تو کیا مقصد تھا تمہارا' میں خوب جانتی ہوں جو ہر وقت یہ تمہارے آگے پیچھے کام کرتی پھرتی ہے' تمہارا دل موم کر کے تمہیں مہرہ بنا کر ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے' اب جمیل ہاتھ سے نکلتا دکھائی دینے لگا تو عامر پر اپنے ہتھکنڈے آزمانے شروع کردیے۔''

ثریا آپا کا زہر خند لہجہ سارے ماحول کو یکبارگی آلودہ کر گیا تھا۔

''حد ہوتی ہے آپا' ہر انسان کو سوچ کر ناپ تول کر بولنا چاہیے تاکہ بعد میں شرمندہ نہ ہونا پڑے.....اور آپ تو واقعی یہاں کے حالات زیادہ بہتر جانتی ہیں' کیونکہ وہ آپ کے ہی مرہون منت ہیں۔ رشتوں کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھیں سارے کام سیدھے ہو جائیں گے کب تک دلن کا رول نبھاتی رہیں گی؟'' عامر نے دوبدو جواب دیا۔

اس ساری صورت حال میں اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہی سزاوار ٹھہرائی جارہی تھی۔

جمیل نے اچانک کھانے کی پلیٹ پٹخ دی تھی۔

''کیا طریقہ ہے بڑوں سے بات کرنے کا؟'' جمیل کا لہجہ بارعب اور غصیلا تھا۔

عامران کی سرزنش پر خاموشی سے قطع تعلقی اپنا تا وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے جمیل' اتنی سی بات پر کتنا واویلا کھڑا کروادیا اس عورت نے۔'' ثریا آپا نے مصنوعی آنسو آنکھوں میں لاتے ہوئے کہا تو جمیل کو اس سارے واقعے میں اس کی خاموشی بھی جرم لگنے لگی تھی۔ جیسے پس پردہ وہی اس سارے واقعے کی روح رواں رہی ہو۔ جبکہ خود اس کا چہرہ فق تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہاتھ برف بار تھے۔ دل تو اب شادی کے بعد سے ہی اپنی جگہ قائم و دائم نہ رہتا تھا' حادثوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

اب جمیل کا موڈ ٹھیک ہونے میں کئی دن لگ جانے تھے اور جب تک جمیل کا موڈ اعتدال پر نہ آجاتا وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپتی رہتی تھی۔ دل تو اس کی محبت میں خوار تھا مگر ذہن سمجھاتا تھا کہ جب اسے کوئی پروا نہیں تو وہ بھی فکر چھوڑ دے۔

مگر جمیل اسے محبت کی راہ دکھا کر خود کہیں کھو چکا تھا۔

اب وہ اکیلی اس پرپیچ راہ میں قدم قدم آبلہ پائی کا درد سہہ رہی تھی۔ نارسائی اب اس کا مقدر بن چکی تھی۔ ہر لحظہ درد اس کا دل کا مسکن ٹھہرا تھا۔

☆.....☆.....☆

''آج ہم لوگ عامر کے رشتے کے لیے جارہے ہیں شام میں' تم سب کو وقت پر کھانا کھلا دینا' کیا معلوم دیر سویر کا۔''

نگہت بیگم اور ثریا آپا خاصے دنوں سے سر جوڑے راز و نیاز میں لگی رہتی تھیں۔ اب اتنے دنوں بعد عقدہ کھلا تو یہ تھا۔

''جی۔'' وہ مودب ہو کر بولی تھی۔

عامر کے رشتے کی مہم بڑے زوروں پر تھی' ثریا آپ اسے جتلانے کی خاطر بآواز بلند تبصرہ فرماتی تھیں۔

''اماں اس مرتبہ ہم کسی قسم کا کوئی دھوکا نہ کھائیں گے۔ جمیل کی تو مت ماری گئی تھی جو بنا جہیز کے لڑکی بیاہ لایا جس

کو نہ تو بڑوں کا احترام کرنا آتا ہے نہ ہی گھر گھرستی کی الف ب معلوم ہے۔''

ثریا آپا کی باتوں پر وہ خاصی جز بز ہوتی رہتی تھی' مگر لب بستہ رہتی۔ اس کا شدت سے دل چاہتا تھا کہ پوچھے اس نے کب بے ادبی کی؟ پھر جہیز میں اتنا کچھ تو اس کے والدین نے دیا تھا مگر یہاں آ کر اسے علم ہوا کہ سونے کے زیورات کا بھاری سیٹ نہ صرف یہ کہ ہونے والی ساس کو پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ یہاں رواج ہے کہ دونوں یا جتنی بھی نندیں ہوں' ان کو بھی مکمل سیٹ دینا ہوتا تھا' مگر وہ تو اس ساری بات سے یکسر لاعلم تھی۔ نہ ہی ان کے والدین تک کو اس سوچ کی رسائی حاصل ہو سکی تھی' اب ہر بات میں یہی طعنہ اس کا مقدر بنتا تھا' وہ مارے باندھے زبردستی کی مسکان سجائے ہر طنز' ہر تضحیک آمیز جملہ سہہ رہی تھی۔

اس کی خاموشی کو بھی بسا اوقات جرم گردانا جاتا تھا۔

عامر کی مہم ابھی سر نہ ہوئی تھی کہ نئی بات ہو گئی۔ جس گھر یہ لوگ رشتہ کی غرض سے گئے تھے' وہاں ان لوگوں کو فریحہ بے حد پسند آ گئی تھی۔ اب عامر کو بھول کر فریحہ کی بابت سوچا جانے لگا۔ یوں بھی امتحانات کے بعد فریحہ کو فراغت ہی فراغت تھی۔

''اچھا ہے ناں ہماری فری وقت پر اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ فری خوش رہے گی' کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے۔ اتنا بڑا سا تو ان کا بنگلہ ہے' اور پھر ہم اچھا خاصا دے دلا کر ہی تجھے رخصت کریں گے تاکہ کوئی طعنہ نہ ملے تجھے۔''

آخری جملہ خاصا دھیمی آواز میں ادا کیا گیا تھا۔ مبادا وہ نہ سن لے۔ جبکہ اس کا ذہن تو پہلے ہی ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جہاں ریل کی مانند مسلسل پٹری پر پہیہ چل رہا تھا۔

''کیا بات ہے میں دیکھ رہی ہوں تم خاصی جلن کا شکار ہو رہی ہو' فری کا اتنا اچھا رشتہ ہو رہا ہے' تم برداشت نہیں کر پا رہی ہو ناں۔'' ثریا آپا کا نیا الزام سن کر چائے کا کپ جو وہ انہیں پیش کرنے کے ارادے سے ٹرے سے اٹھا رہی تھی' چھلک اٹھا تھا۔

وہ حواسہ باختہ ان کا منہ تک رہی تھی۔ لفظ بھی اب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''میں تمہاری رونی صورت کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں' بھابیاں تو ایسے مواقع پر بڑھ چڑھ کر کام کرتی ہیں' ایک تم ہو تمہیں تو ایک کام کہہ دو تو کفن کا موت آ جاتی ہے۔''

نگہت بیگم کہاں چوکنے والی تھیں دور کی کوڑی لائی تھیں۔ نیلم متعجب رہ گئی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اتنی خوش ہوں۔ جمیل سے پوچھ لیں آپ۔''

اسے فوری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو جمیل کا حوالہ دے ڈالا تھا۔

''اس کی تو رہنے ہی دو۔ تمہاری زبان ہی بولے گا ناں وہ تو۔'' ثریا آپا تمسخرانہ ہنسی تھیں۔

نیلم کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

یاد رکھنا میری ایک بات میں خوب جانتی ہوں تمہارے انداز' مجھے بات کرنے کا خوب ڈھنگ آتا ہے۔ جمیل سے کہہ دیا ناں ایک بار تو وہ وہی کرے گا جو میں کہوں گی۔ مجھ سے اچھا تو بات کرنے کا ہنر کسی کو آتا ہی نہیں ہے۔''

ثریا آپا کا یہ لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ دبے دبے انداز میں اسے دھمکی دے رہی ہیں۔ نیلم بسا اوقات سوچتی تھی کہ ثریا آپا کی تو اپنی بیٹیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں او راب ان کے جلد ہی رشتے طے کرنے کے مراحل درپیش ہونے تھے پھر بھی وہ خوف خدا سے مبرا تھیں۔ انہیں اس کی کسی آہ کا کوئی خوف تک نہ تھا۔ ہر بات میں ان کا انداز دوٹوک ہوا کرتا تھا۔

پھر بات بے بات یہی دھمکی۔

''بات کرنے کا ہنر خوب جانتی ہوں۔ ڈھنگ آتا ہے مجھے بات کرنے کا۔''

دوسرے لفظوں میں ثریا آپا کو جمیل کو ہینڈل کرنا آتا تھا۔ وہ جو منظر کشی کرتی تھیں' جمیل اسی کو دیکھتے تھے' پھر ان کا موڈ ان کی باتوں کے نتیجے میں کئی دن تک نیلم سے خراب رہتا اور وہ بھی نیلم کو زچ کرتے اسے مسلسل طنزیہ باتوں سے ارزاں کرتے رہتے تھے۔

''اماں یہ وٹے سٹے کی شادیاں ٹھیک نہیں ہوتی ہیں ان میں ایک گھر نہیں بلکہ دو گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں۔'' عامر نے احتجاج کیا تھا۔

''نہ تو ہم نے کوئی آنکھیں بند کرکے تو ہاں نہیں کہا' زہرہ اور زاہد دونوں ہیرا ہیں' زاہد اپنی فریحہ کو خوش رکھے گا۔ اور زہرہ بھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے' اس کو دیکھ کر تو میں اسی وقت فریفتہ ہوگئی تھی۔'' ثریا آپا کا اپنا ہی نقطہ نگاہ تھا۔

''آپا آپ بھی محض چہروں کو اہمیت دیتی ہیں' سیرت اور کردار ہی سب سے اہم ہوا کرتے ہیں اور پھر مجھے زہرہ خاصی مغرور لگتی ہے۔''

عامر نے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس ایک مرتبہ زہرہ سے آمنا سامنا کرنے پر ہی وہ لڑکی خاصی تیز طرار لگی تھی۔ اسے تو بھابی جیسی لڑکی کی تمنا تھی۔ جو گھر یار کو سنبھال سکے اور سب کی تلخ وترش باتوں کو بھی امرت سمجھ کر پی لے۔

وہ جانتا تھا کہ گھر قربانیوں کی اور صبر کی عمارت پر بنتے ہیں۔ ان کی تعمیر ہر روز دل میں اترنے والے آنسوؤں کی ضبط گریہ کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی آنسو آبیاری کرتے ہیں تو تناور درخت بن جاتا ہے۔ جہاں تمام رشتے بیک وقت سجتے ہیں۔

''چہروں کو اہمیت نہیں دے رہی پگلے ہر نقطہ نگاہ سے سوچا ہے۔ ہر جگہ خوار ہونے سے ہم بچ گئے بیک وقت تم دونوں کا رشتہ طے ہوگیا۔ پھر وہ لوگ امیر کبیر ہیں' سارے معاملات ہی ازخود آفر کی ہے کہ سارے اخراجات وہ ساتھ باہمی رضامندی سے اٹھالیں گے۔ شادی ہال بھی انہوں نے اریج کرکے دیا ہے' ہر معاملہ میں ان کا رول ہے' اسے نہیں جیسے ہم نے پہلے دھوکا کھایا تھا۔''

ثریا آپا کی تان آجا کر نیلم پر ہی ٹوٹتی تھی۔ عامر کچھ کہنے والا تھا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ اس کی کوئی بھی بات جو نیلم کے حق میں بولی جائے گی یہاں نیلم کے لیے مزید پریشانیاں اور دشواریاں ہی لائے گی۔

جبکہ وہ دل میں نیلم کی چھوٹی بہن ندا کو چاہتا تھا۔ وہ ہو بہو نیلم بھابی کا عکس تھی مگر یہاں تو نیلم بھابی کی ہی گنجائش نہ نکلتی تھی' کجا یہ کہ ان کی چھوٹی بہن کے لیے گنجائش نکالی جاتی۔ بہتری اسی میں تھی کہ خاموشی اختیار کرلیتا اور وقت کے دھارے پر خود کو بہتا ہوا چھوڑ دیتا۔

نیلم دیکھ رہی تھی کہ یہاں بھی دو رخی معاملہ روا رکھا جارہا تھا' فری کو دینے کے معاملے میں بہترین شے کا انتخاب کیا جارہا تھا' جبکہ آنے والی بہو کے لیے کم مالیت کی شے کا انتخاب کیا جارہا تھا۔ یہ سب قصداً ہورہا تھا۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت۔

فری تو جس شے پر ہاتھ رکھتی تھی وہ فری کے لیے حاضر کردی جاتی تھی جبکہ آنے والی کی آرزوؤں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

پھر زہرہ دعاؤں کے حصار میں اس دلہن پر آئی تو فریحہ نئے گلشن میں چل دی تھی۔

زہرہ نے جب اپنے لیے منتخب سوٹ دیکھے تو خاصے نخریلے انداز میں ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''آپ کی امی نے ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ میرے لیے منتخب نہیں کیا۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ سارے سوٹ آپ اپنی بہن کو ہی بھجوادیں' میں نئے سرے سے اپنی پسند کی شاپنگ کروں گی فی الحال تو سسرال میں بھی دشواری ہوگی اس لیے میں ریڈی میڈ سوٹ ہی پہن لوں گی۔''

زہرہ سارے معاملات ازخود ہی طے کرتی چلی جارہی تھی اور عامر متعجب اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

''یہ تو اب ممکن نہیں ہے' کم از کم میرے بجٹ کے حساب سے تو ایسا مشکل ہے۔'' عامر ہچکچایا تھا۔ پھر ماں کی خفگی کا بھی سامنا کرنے سے گھبراتا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی بہادر ہوتا تو ندا آج اس کی جیون ساتھی بن چکی ہوتی۔

پھر زہرہ نے تو ضد ہی پکڑ لی تھی۔ اس لیے مجبوراً عامر اسے شاپنگ کے لیے لے گیا واپسی پر وہ ڈھیر سارے شاپنگ بیگز تھامے فاتحانہ انداز میں لوٹی تھی۔

''ارے ابھی تو اتنے سارے کپڑے لیے تھے اس کے لیے اب اور شاپنگ کرآئی ہو۔''

نگہت بیگم دبے دبے لفظوں میں اس کے لائے شوخ اور نکھرے رنگوں والے لباس دیکھ کر بولی تھیں۔ مبادا وہ برا ہی نہ مان جائے۔ یہ بھی اس مجبوری کے تحت تھا کہ دوسری جانب ان کی اپنی بیٹی بیاہی تھی اور اس کی خوشی کا انحصار اب اس پر تھا کہ زہرہ کتنا خوش اور مطمئن رہتی ہے۔

''افوہ وہ بھی کوئی سوٹ ہیں' مجھے اتنے پھیکے رنگ پسند نہیں پھر وہ بالکل سستے سے کپڑے والے کام کے سوٹ تھے مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھائے' الٹا میرا دل اتنا خراب ہوا

ہے وہ اگر آپ لوگوں کو اتنے ہی پسند ہیں تو ایسا کریں فری بھابی کو بھیج دیں۔''

زہرہ لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک انداز میں بولی تھی۔

نگہت بیگم تو برا منا کر بھی خاموش رہ گئی تھیں مگر ثریا آپا خاموش نہ رہ سکی تھیں۔ ان کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

''یہ تو کوئی طور طریقہ نہیں ہے اور آج تک نہ دیکھا نہ سنا کہ لڑکی اپنے ملبوسات سسرال والوں کے منہ پر دے مارے۔ ہماری بہن بھی تو ہے اس نے تو ایسی کوئی مین میخ نہیں نکالی۔''

ثریا آپا نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

ہونہہ وہ بھلا کیا مین میخ نکالیں گی' ان کی حیثیت ہی کہاں تھی کہ اتنے قیمتی ملبوسات زیب تن کرتیں۔ ہر شے ہم نے اعلیٰ پائے کی منتخب کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو اپنی اوقات کے مطابق دیا ہے' اب آپ لوگ شاید اتنا ہی دے سکتے تھے۔''

آخری جملہ اس نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا' نگہت بیگم تو سلگ ہی اٹھی تھیں۔ وہ کہاں عادی تھیں بہو بیگم کے لب ولہجہ میں اتنی تندی اور تیزی کی۔

مگر وہ نیلم نہ تھی زہرہ تھی۔ جسے دوبدو جواب دینے آتے تھے اور منہ پر باتوں سے تھپڑ برسانا بھی آتے تھے۔

''سن رہے ہو سب اور منہ بند کے گڑ کھائے بیٹھے ہو۔''

نگہت بیگم کا سارا غصہ اب عامر کی جانب منتقل ہو گیا تھا جو ساری بات سن کر بھی بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں' زہرہ آپ کی ہی پسند کردہ بہو ہے۔'' عامر نے یہ کہہ کر وہاں بیٹھنا بھی بیکار سمجھا تھا تبھی وہاں سے خاموشی سے پلٹ آیا تھا۔ پھر آئے دن کے جھگڑوں نے طول پکڑ لیا تھا۔ جس میں عامر بالکل خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا تھا۔ چپ کی مہر لگائے بیٹھا سب سنتا مگر بولتا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ماں کے حق میں نہ بیوی کی طرف داری میں' پھر دونوں گھرانے متاثر ہو رہے تھے اگر یہاں زہرہ کا موڈ خراب ہوتا دوسری طرف زاہد فری کو طعنہ دینے لگتا تھا۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو ایک گھرانہ کا رویہ دوسرے گھرانے پر اثر انداز ہونے لگا تھا اور رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگی تھی۔

یہ ایک سمجھوتہ تھا جسے دونوں اطراف کے گھرانے نبھا رہے تھے' اس کا سبب وہ وٹہ سٹہ تھا۔

ایک سال ہونے کو آیا تھا' مگر زہرہ کے وہی ناز و انداز تھے۔ محض بجنا سنورنا اور شام کو ضرور کسی جگہ کے لیے آؤٹنگ کی غرض سے چل دینا اگر ساس یا نند منع کرتیں تو زہرہ واویلا مچا دیتی تھی۔

زہرہ اکثر نیلم کو بھی بغاوت پر اکساتی تھی' مگر نیلم جانتی تھی کہ زہرہ کی خودسری کے کئی ایک جواز ہیں' مثلاً دولت کی ریل پیل تھی' پھر وٹہ سٹہ کی شادی تھی سب سے بڑھ کر عامر کا رویہ تھا' اگر عامر اور نجیل کے رویے کو پیمانے میں رکھ کر تولا جاتا تو عامر پر ماں اور بہن کی کسی بات کا بھی خاطر خواہ اثر نہ پڑتا تھا' جبکہ نجیل تو ہر معاملہ میں ماں اور بہن کی بات کو حرف آخر قرار دینے لگتا تھا۔ اس لیے نیلم اور زہرہ کی کیفیت میں بھی فرق تھا۔

''میری بات سنو بہن یہ کب تک چلے گا' آخر کب تک یوں ہی زہرہ بیٹھ کر کھاتی رہے گی' ٹرے کھانے کمرے میں جاتی ہے اور واپس میری بڑی بہو نوکرانی کی طرح اٹھا کر لے آتی ہے' ارے ہم ہیں جو اسے پکا پکا کر کھلا رہے ہیں' اس نے تو ایک دن اپنے شوہر کو ڈھنگ کا پکا کر نہیں کھلایا ہے' رہنا پڑے الگ تو عقل ٹھکانے آ جائے۔''

نگہت بیگم غصیلے لہجے میں ساس سے مخاطب تھیں' اگر وہ ایک عرصہ سے برداشت کرتی چلی آ رہی تھیں مگر اب سال سے اوپر ہو چلا تھا مگر زہرہ ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

دوسری جانب سے فری پر ظلم وستم توڑے جانے لگے۔ ادھر زہرہ خفا ہو کر میکے جاتی اور فری پر مصیبت آ جاتی۔

''میں کہتی ہوں جب میری بچی ہی خوش نہیں تو تو کیوں اس کلموہی کو اس کی ماں کے گھر نہیں چھوڑ آتا۔''

اور پھر واقعی ایک مرتبہ زاہد نے طیش میں آ کر فری کو گھر سے نکال باہر کیا..... فری روتی بلکتی ہوئی ماں کی دہلیز پر آن بیٹھی تھی۔

سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ثریا آپا بھی اس معاملے میں خود کو پہلی مرتبہ بے بس پا رہی تھیں' نجیل سے تو ہر بات منوا لیا کرتی تھیں' اور نجیل کے ہاتھوں نیلم کی وہ عزت افزائی کرواتی تھیں کہ نیلم کی آنکھیں اشکبار ہو جایا

کرتی تھیں اور پھر فاتحانہ انداز میں نیلم کو دیکھ کر ایک ہی جملہ اکثر بولا کرتی تھیں۔

''جانتی ہو ناں مجھے بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر بات کرنے کا ڈھنگ بھلا کسے آتا ہوگا۔'' اس میں اک دھمکی بھی پوشیدہ ہوا کرتی تھی۔ جس کے خوف کے سائے میں آ کر نیلم ہر وقت چابکدستی سے کاموں میں لگی رہتی تھی اور وہی کچھ کرتی جیسا کہ اس کی ساس اور نند کی منشا ہوا کرتی تھی..... مگر اس مرتبہ حالات مختلف تھے۔

فری ان کے لیے آزمائش بن گئی تھی جس دولت کی ریل پیل دیکھ کر انہوں نے شادی میں جلدی کی تھی' وہی دولت اب فری کے لیے طعنہ بن چکی تھی۔

''ارے کہاں دیکھی تھی اتنی دولت تم نے کہاں دیکھے تھے اتنے عیش تم نے' تمہاری تو اوقات ہی نہ تھی' دو کوڑی کی اوقات تھی' فرش سے عرش پر لا بٹھایا ہے تم کو۔''

زاہد اس کا تمسخر اڑایا کرتے تھے اور فری رو دیتی تھی۔

پھر دوسری جانب جس خوبصورتی پر نگہت اور خود ثریا آپا فریفتہ تھیں' وہی زہرہ کا ہتھیار بن چکی تھی۔ عامر بیوی کی خوبصورتی کی چکا چوند میں آ کر ماں اور بہن کی کوئی بھی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ الٹا وہ اگر کبھی بولتا تو فقط اتنا ہی کہتا تھا۔

''زہرہ کی خوب صورتی پر تو آپ دونوں ہی مرمٹی تھیں' اب ان شکایات کا دفتر کھول کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ ایک تو انسان پہلے ہی آفس سے تھکا ہارا آتا ہے اور پھر آپ لوگ شروع ہو جاتے ہیں۔''

عامر سرے سے ہی منکر ہو جاتا تھا اور اس کا اس سارے معاملے سے جیسے کوئی تعلق کوئی رابطہ ہی نہ ہو۔

فری ان دنوں جس دور سے گزر رہی تھی' اس میں یہ ناروا سلوک اور پھر گھر سے نکال دینا اس پر ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ ماں اس کے آنسو دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں۔

مزید ستم یہ کہ دوسری جانب سے خلع کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب پانی سر سے اوپر اٹھ چکا تھا' ان لوگوں کا کہنا تھا کہ عامر اور زہرہ کو علیحدہ گھر لے کر دیا جائے ورنہ زہرہ واپس آنے کو قطعی طور پر تیار نہیں ہے اور پھر اس کی واپسی نہ ہونے کی صورت میں فری بھی طلاق کے لیے انتظار کرے' اب ان لوگوں کو صحیح معنوں میں ہوش آیا تھا' اور روٹھ سٹہ کی اس شادی کے مضر ہونے کا احساس ہوا تھا۔

وقت ہاتھ سے نکل جائے تو سوائے خسارے کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسا ہی اب ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ پھر نگہت بیگم نے قبل اس کے وہ اپنے بیٹے کو کھو دیتیں' نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے زہرہ کو بلا لیا تھا۔

''بیٹی تم بس خوش رہو' ہماری خیر ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ ان کے لبوں پر پھسلا تھا۔ پھر زہرہ سارا دن آرام کرتی اور سر شام تیار ہو کر میاں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب نگہت بیگم اور ثریا آپا کو شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اس گھر کو صحیح معنوں میں چلانے والی نیلم ہی ہے' جس نے ہر ستم ہنس کر سہا مگر اف تک نہ کی۔

رشتوں کو توازن کے ساتھ ان کے اصل مقام پر رکھنا ان کی ہی مہارت تھی۔ رفتہ رفتہ اب سب کا رویہ نیلم کے ساتھ نرم ہوتا جا رہا تھا۔

نیلم بھی مطمئن سی ہو گئی تھی کہ اب سب کو اس کی وقعت کا احساس ہو جائے گا۔ مگر قبل اس کے کہ سب کچھ بالکل نارمل ہو جاتا' زہرہ نے خوشخبری سنا دی جو خوشخبری نیلم اتنے سال میں نہ سنا پائی تھی' جو پلٹا حالات کا نیلم کے پلڑے میں ہوا تھا' اب دوبارہ سارا جھکاؤ زہرہ کی جانب ہو گیا تھا۔ زہرہ کے ہزار نخرے تھے' وہ تو یوں بھی نخریلی سی تھی' اور اب اس حالت میں تو اس کے نخرے آسمان کو چھو رہے تھے۔

نت نئے پکوان بنتے اس کے سامنے سجائے جاتے مگر وہ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی انکار کر دیتی' اور کبھی کبھار احسان عظیم کرتے ہوئے کھا لیتی۔ مگر تشکر اور احساس ممنونیت جیسے کوئی لفظ اس کی ڈکشنری میں رقم نہ تھے۔

وہ ان ساری خدمت گزاریوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ نگہت بیگم بھی خوش تھیں' جو خوشی پوتے کی اب تک ان کو نہ مل سکی تھی' اب وہ انہیں زہرہ کی جانب سے ملنے والی تھی۔ جو تھوڑا بہت گلہ رہ گیا تھا عامر کے دل میں وہ بھی اب زہرہ کے حوالے سے دھل گیا تھا۔ نیلم سارا دن زہرہ کے لیے فرمائشی کھانے بناتی رہتی تھی' جسے بعد میں چکھے کے ساتھ ہی زہرہ رد کر دیتی تھی اور پھر اسے کوئی اور مینو یاد آ جاتا تھا' ایک دن زہرہ کسی بات پر بحث کر رہی تھی تو نیلم

نے اتنی جسارت کرلی۔

''دیکھو اتنے مزے کی تو بنی ہے بریانی کھالو یہ یخنی ہی پی لو یہ تو نہایت فائدہ مند ہے تمہارے اور بچے کے لیے۔''

اس کا انداز حکمیہ نہ تھا بلکہ ملتجیانہ سا تھا مگر زہرہ کو اس کا نصیحت آموز انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ اس لیے کڑے تیور لیے بولی تھی۔

''تم کو کیا معلوم تمہارے کون سے بچے ہیں؟'' وہ لطف اندوز ہو رہی تھی' نیلم کے فق چہرے کو دیکھ کر۔ نیلم کی آنکھ نم ہوگئی تھی' تبھی ثریا آپا کی انٹری ہوئی تھی' بولیں۔

نیلم اپنی منحوس نظریں سنبھال کر رکھا کرو' تم خود تو کوئی خوشی ہمیں دے نہ سکی' اب اگر زہرہ ہمیں یہ نوید دے رہی ہے تو کیوں نحوست پھیلا رہی ہو' جاؤ دفعان ہو جاؤ۔''

ثریا آپا شاید سسرال کے کسی جھمگٹے میں پہلے ہی الجھی تھیں' اس پر یہاں کوئی معاملہ الجھا دیکھ کر اس نے فوراً لب کشائی کی تھی۔

نیلم بالکل پرسکون تھی۔ اپنی قسمت پر شاکر تھی۔

گلہ تھا تو فقط اپنے محبوب شوہر سے۔ جس نے چاہت سے اپنا کر پرایا کر ڈالا تھا۔ پھر ایک دن جب سب گھر والے کسی دعوت میں شریک تھے۔ گھر میں نیلم رہ گئی تھی اور زہرہ اپنی طبیعت کی وجہ سے جا نہ سکی تھی۔ اچانک زہرہ کسی کام کے لیے سیڑھیوں سے اتر رہی تھی کہ بری طرح سے پھسل گئی۔

جتنی دیر میں اسے ہاسپٹل لے جایا گیا' سب کچھ ختم ہو چکا تھا' زہرہ اب کبھی مامتا کے جذبے سے سیراب نہ ہو سکتی تھی' ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا' زہرہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ باقی تو وہ جیسی بھی تھی مامتا کے حوالے سے اس نے بہت سے خواب دیکھے تھے اور ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا' انہی دنوں اچانک نیلم کو بخار نے آن گھیرا تھا۔ سارا گھر الٹ پلٹ ہو رہا تھا' دوسری جانب نیلم کا بخار تو کم ہونے میں نہ آ رہا تھا' بالکل زردی مائل رنگت ہو رہی تھی پھر ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے گھر میں ننھے مہمان کی آمد کی نوید دی' سب کھوئی خوشیوں کو کسی اور صورت میں پانے کو بے تاب تھے۔ عامر کی جانب سے نہ سہی تجمل کی جانب سے' اب بھی وہ دادی بن سکتی تھیں۔

نیلم کا پلٹ پر حیران تھی۔ ڈاکٹر کی تلقین کے مطابق اسے سخت آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے اب سب ہی اس کا خیال رکھنے لگے تھے وہ اداس تھی' کیونکہ جانتی تھی کہ تجمل کی فکرمندی کی اصل وجہ وہ بچہ ہے جو ابھی دنیا میں بھی نہیں آیا ہے۔

☆.....☆.....☆

جس دن اس نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا وہ مکمل ہوگئی تھی۔ سارے شکوے جو نہاں خانے میں تھے مٹ گئے تھے۔ زہرہ نے محبت سے اس کے گل گوتھنے بچوں کو چوما تھا' نجانے وہ کونسا لمحہ تھا جب نیلم نے ایک بچہ اٹھا کر زہرہ کو دے ڈالا' گود میں اٹھائے زہرہ متعجب تھی۔ کیا کسی کا اتنا بڑا دل بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر زہرہ نے آبدیدہ ہو کر نیلم کو گلے سے لگا لیا تھا' اس کا ظرف کتنا بلند تھا جبکہ وہ اس کو طعنے ہی دیتی رہی تھی۔

ثریا آپا' نگہت بیگم سب خوش تھے' دونوں بھابیوں کی گود بھر گئی تھی۔ زہرہ کے انداز میں جو چڑچڑا پن عود کر آیا تھا' وہ بھی زائل ہو گیا تھا۔

نیلم کی مسلسل قربانیوں نے اس گھر کو نئی جہت دی تھی۔ محبت کی جہت۔

نیلم بہ ظاہر مطمئن تھی اس نے سب کی محبت حاصل کر لی تھی مگر اس طویل سفر میں شریک سفر کی محبت ہی حاصل نہ رہی تھی۔ ایک نہ محسوس کی جانے والی خلش تھی۔

پھر ایک شام جب وہ کمرے میں دودھ کا گلاس رکھنے آئی تھی تو تجمل نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

محبت کی گرمائی نے عرصہ بعد نیلم کو پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ اجڑ تا عشق سنورنے لگا تھا' ابھی اتنی دیر بھی تو نہ ہوئی تھی کہ سب سنوارا نہ جاتا۔

تجمل کی محبت پاش نگاہوں میں اسے اپنا عکس جھلملاتا دکھائی دینے لگا تھا۔

تجربہ

عارف شیخ

بوڑھے اور ضعیف العمر افراد کو لاکھ دقیانوسی کہیں لیکن ان کے تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتے، وہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک نوعمر بیٹے کی روداد، وہ باپ کی جگہ لینا چاہتا تھا

ماں نے رات کا کھانا تیار کر لیا تھا۔ اصل میں ہم گاؤں کے رہائشی تھے اس لیے مغرب کے فوراً بعد رات کا کھانا کھا لیتے تھے۔ اب صرف ابا کا انتظار تھا کہ وہ نماز پڑھ کر آجائے تو ہم کھانا شروع کریں۔

ابا کے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں نے دسترخوان لگا دیا تھا۔ پورا گھر خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ دوران کھانا سکوت کو ابا کی آواز نے توڑا۔

''میں کل صبح سویرے روانہ ہو جاؤں گا۔''

''میں کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' اماں نے ڈرتے ڈرتے بات کی۔

''کیا بات کرنا چاہتی ہو۔'' ابا نے پوچھا۔

''جس کام پر صبح تم جا رہے ہو اس پر صفدر جانا چاہتا ہے۔'' ماں نے میری عرضی ابا تک پہنچا دی تھی۔

ابا نے میری طرف دیکھا۔ ''ابھی تم صرف سولہ برس کے ہو۔'' ابا نے چند لمحے توقف کیا پھر بولے۔ ''لیکن اچھا ہے اگر تم کام کرنا چاہتے ہو۔''

''ابا میں منڈی سے آپ کے بتائے ہوئے بیج لے آؤں گا۔'' میں نے جوش سے جواب دیا۔

ابا کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''راستے کا اندازہ ہے۔''

''آپ کے ہمراہ دو مرتبہ منڈی جا چکا ہوں۔ ''میں نے جواب دیا۔ ''جہاں سے آپ بیج لیتے ہیں انہیں بھی جانتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ابا نے اجازت دے دی تھی۔ ''جلدی سو جانا تا کہ صبح سویرے روانہ ہو سکو۔''

اس کے بعد کسی کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی' سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

☆.....☆.....☆

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی' میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا' میں صبح آزادی خود مختاری حاصل کرنے والا تھا۔ اس آزادی کی خوشی کی ساتھ ایک اور بڑی خوشی یہ تھی کہ پندرہ روز پہلے ابا نے نیا گھوڑا خریدا تھا' جو صبح میری سواری کے طور پر ساتھ جانے والا تھا۔

وہ اتنا شاندار گھوڑا تھا کہ پورے گاؤں میں ہماری واہ واہ ہو رہی تھی۔ وہ گھوڑا ایک تو بالکل جوان تھا پھر اونچے قد اور صحت مند طاقتور بدن کے ساتھ سفید براق رنگ اپنے سوار کو بھی شاندار دکھاتی تھی۔

اصل میں ہمارے گاؤں میں سبھی گھروں میں سواری کے لیے اسی طرح کے جانور ہوتے تھے' ہمارے پاس کئی برس سے ایک گھوڑی تھی جو اب کافی بوڑھی ہو چکی تھی۔ ابھی حال ہی میں اس نے بچہ بھی دیا تھا۔ بڑھاپے اور بچے کی پیدائش نے اس گھوڑی کو کمزور کر کے بدشکل کر دیا تھا۔

میں اس طرح کے خیالوں میں گم نا جانے کب تک غوطے کھاتا رہا اور پھر نیند نے مجھے آلیا۔

☆.....☆.....☆

ماں نے مجھے صبح سویرے ہی اٹھا دیا۔ میں نہا کر تیار ہوا تو ابا بھی آ گیا۔ میں اس وقت گھوڑے کی گردن سہلا رہا تھا۔

ابا نے گھوڑے کی زین اور لگامیں اٹھائیں اور گھوڑی

گی کمر پر رکھ دی۔ صفدر نے فوراً ہی کہا۔
''ابا میں گھوڑا لے کر جا رہا ہوں۔''
''نہیں تم گھوڑی لے جاؤ۔ یہ مناسب فیصلہ ہوگا۔'' ابا نے جواب دیا اور لگامیں کس دیں۔
اس نے ماں کی طرف دیکھا جیسے سفارش کی درخواست کر رہا ہو۔
''گھوڑا لے جانے دو۔'' ماں بولی۔ ''گھوڑی بوڑھی اور کمزور ہے سفر لمبا ہے۔''
''نہیں گھوڑی ہی اس وقت بہتر ہے۔'' ابا نے جواب دیا۔
''اسے لوٹتے لوٹتے شام ہو جائے گی۔'' ماں نے نئی ترکیب کی۔ ''اس کا بچہ شام تک بھوکا رہے گا۔ وہ ابھی دودھ پر ہے۔''
''میں جانتا ہوں' لیکن یہ گھوڑی ہی پر جائے۔'' ابا نے فیصلہ سنا دیا تھا' اب کوئی اور بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔
وہ لاچار گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ تب ابا پاس آئے اور بولے۔ ''کوئی مشکل آ جائے راستے میں تو گھوڑی کی لگام چھوڑ دینا۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا اس وقت میری اور گھوڑی کی حالت ایک جیسی ہی تھی میں اپنی ماں کو مایوسی سے دیکھ رہا تھا اور گھوڑی بار بار پلٹ کر اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی لیکن ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

☆.....☆.....☆

مجھے منڈی تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی تھی دوپہر کے قریب میں منڈی پہنچا' مسجد جا کر نماز پڑھی۔ ماں نے ساتھ کھانا دیا تھا وہ کھایا' کچھ دیر وہیں مسجد میں آرام کیا اور ابا کی مخصوص دکان سے بیجوں کی بوری حاصل کی اور شام ہونے سے قبل ہی گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ گھوڑی کو بھی گھر پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔
منڈی اور گاؤں کے درمیان ایک جنگل آتا تھا' جنگل کے اندر راستے اس طرح کے تھے کہ اگر آپ کا کوئی پیر غلط پڑ گیا تو پھر آپ راستہ بھٹک جاؤ گے' اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ مجھے تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ میں جس پگڈنڈی پر چل رہا ہوں' وہ مجھے کسی اور سمت لے جا رہی ہے۔ میں گھوڑی کی لگامیں کھینچی اور واپسی پلٹا لیکن میں بھٹک چکا تھا۔ مجھے راستے کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔
پھر ایک فکر مجھے اور لاحق ہو چکی تھی کہ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں تاریکی ہو جاتی اور پھر میں صبح تک بے بس ہو جاتا اور رات جنگل میں گزارنا خطرناک تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کیا کروں' اچانک مجھے ابا کی وہ ہدایت یاد آ گئی کہ اگر راستے میں مشکل آ جائے تو گھوڑی کو لگاموں سے آزاد کر دوں۔
چنانچہ میں نے گھوڑی کی لگامیں اس طرح ڈھیلی کر دیں جیسے اسے فیصلے کا اختیار دے دیا ہو اور پھر گھوڑی نے مجھے پلٹ کر دیکھا اور ایک سمت چل پڑی۔ دھیرے دھیرے گھوڑی کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی میں بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے یہ احساس ہوا گھوڑی درست سمت دوڑ رہی ہے۔ کیونکہ ہم جنگل سے باہر آ گئے تھے اور مجھے راستہ بھی سمجھ آ گیا تھا لیکن میں نے گھوڑی سے اس کا اختیار واپس نہیں لیا اور وہ مسلسل دوڑتی رہی۔

☆.....☆.....☆

گھوڑی ٹھیک گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکی تھی۔ ابا وہیں دروازے پر موجود تھا۔ وہ گھوڑی کی ڈھیلی لگاموں کی وجہ سے صورت حال بھانپ گیا تھا۔ میرے گھوڑی سے اترتے ہی ابا نے اسے آزادی دی تو وہ سیدھی اپنے بچے کے پاس پہنچ گئی۔ بچہ جو دن بھر سے بھوکا تھا فوراً ہی بھوک مٹانے لگا۔ گھوڑی اپنے بچے کو چاٹ رہی تھی۔
میری سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی کہ ابا نے مجھے گھوڑی کیوں لے جانے پر مجبور کیا تھا' شاید اس کی عمر کا تجربہ تھا کہ میں راستہ بھٹک سکتا ہوں اور اس نے گھوڑی کی لگام چھوڑنے کا بھی اسی لیے کہا تھا کہ گھوڑی ایک ماں ہے اور اسے اپنے بچہ تک آنا ہے۔
میں تھکا ہوا تھا سو نے لیٹ گیا' لیکن دو باتیں میرے تجربے میں آ چکی تھیں کہ ابا کا تجربہ ابھی میرے کام آئے گا اور جانور سے بچے کی محبت جو مجھے بھٹکنے سے بچا لائی۔ پھر نا جانے کب مجھے نیند اپنی آغوش میں لے گئی۔

بھوتوں کی جیل

دستگیر شہزاد

ایک دوشیزہ کی روداد، اس پر ایک بھوت عاشق ہو گیا تھا۔

فارغ لمحوں کے لیے ایک ہلکی پھلکی کہانی

اٹھائیس سالہ عادل لاہور کا رہنے والا تھا اور دوبئی میں انجینئر تھا۔ اس کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ان کے والد ناصر حسین کا بھیرا بادشاہ میں لیدر بیگ بنانے کا کارخانہ تھا۔ ان کے بنائے بیگ کئی ملکوں میں ایکسپورٹ ہوتے تھے۔ ناصر حسین کے سارے بچے اچھی تعلیم حاصل کر کے اچھی نوکریوں پر لگے ہوئے تھے۔ عادل کے علاوہ سب بچوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اٹھارہ ستمبر کو عادل کا نکاح میرب کے ساتھ ہوا تھا۔ بیگووال کے رہنے والے بازل حسین کی بیٹی میرب نے پنجاب یونیورسٹی سے بی کام کیا تھا۔ وہ بینک میں نوکری کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے گھر والوں نے اس کی اجازت نہیں دی اور تعلیم مکمل ہونے کے چار ماہ بعد میرب کا نکاح عادل سے کر دیا۔ میرب بہت خوبصورت اور حسین دوشیزہ تھی اس کی فوٹو دیکھتے ہی عادل نے اس کو پسند کر لیا تھا۔ نکاح کی تاریخ مقرر ہونے سے ایک ہفتہ پہلے عادل ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لے کر دوبئی سے اپنے گھر لاہور آ گیا تھا۔ نکاح کے بعد میرب اس کے گھر دلہن بن کر آئی تو عادل کی بہنوں و بھابیوں نے ایک کمرے کو پھولوں سے سجے بستر پر سرخ لباس پہنے دلہن بنی میرب کو بٹھا دیا۔

دولہا عادل رات دس بجے دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں سونے کے ہار کا ڈبہ تھا' دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے بیچ پر بیٹھی میرب کو دیکھا تو دل ہی دل میں مسکراتا ہوا بیچ کے پاس آیا' کچھ لمحے میرب کو دیکھنے کے بعد عادل بیچ پر میرب کے پاس بیٹھا ڈبا کھول کر سونے کا نیکلس میرب کو دکھاتے ہوئے بولا۔

"تحفہ قبول کیجیے بیگم صاحبہ۔"

میرب عادل کو دیکھے بغیر ہی دھیمی آواز میں فلم نکاح کا گانا گنگنانے لگی۔

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔"

"واہ کیا بات ہے۔ آپ کی آواز تو بہت سریلی ہے' کہ ہوئے عادل نے نیکلس میرب کے گلے میں پہنانے کی کوشش کی تو میرب نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گاتے ہوئے بولی۔

چھونا نہ مجھ کو ٹوٹ جاؤں گی
دیکھو نا مجھ کو روٹھ جاؤں گی
پکڑو نہ مجھ کو چھوٹ جاؤں گی

عادل ہکا بکا سا کچھ لمحے تک میرب کو دیکھتا رہا۔

پھر یکا یک اسے اپنے دوست کی ایک بات یاد آ گئی سہاگ رات کو دلہن آسانی سے ہاتھ نہیں لگانے دیتی ہے۔ شا اسی وجہ سے میرب اسے ستا رہی ہے یہ سوچ کر عادل مسکرا اٹھا' گانے والے انداز میں بولا۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو

گانا عادل کی زبان پہ ہی تھا کہ میرب نے اس کے گال پہ زور سے ایک طمانچہ رسید کر دیا' کہ عادل کا چہرہ جھنجنا اٹھا' میرب غصے میں کانپتی ہوئی دہکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور ایک ایک لفظ کو جیسے غصے میں چباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

خبردار! میری جان جگر کی تعریف میں قصیدے پڑھنے کی آئندہ جرات کی تو زبان کھینچ لوں گا۔" حیرت سے میرب کو دیکھ عادل اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"مذاق کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے' میرب آج ہمار سہاگ رات ہے اور تم اتنا گندہ مذاق کر رہی ہو۔" مجھ۔ اور کہتے کہتے عادل نے میرب کا گھونگھٹ الٹ دیا اور اسے ا بانہوں میں کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکا یک میرب چلانے پھر اس نے عادل کو اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ درد سے عادل چلانے لگا۔ اس کی چیخیں سن کر گھر والے اور گھر میں ٹھہرے ہو مہمان بند دروازے کے باہر آ گئے۔ اور زور زور سے دروا

ھنکمنانے لگے۔اس سے پہلے کہ عادل اٹھ پاتا' اور میرب پھرتی
ے بستر سے اتری اور عادل کے سینے پر چڑھ کر غرانے لگی۔
"یہ میری ہے' صرف میری۔ آئندہ اسے اپنے ناپاک
ھوں سے چھونے کی کوشش کی یا چھونے کی بات دل میں سوچی
چیر پھاڑ ڈالوں گا تجھے۔" پھر وہ عادل کے چہرے پر تابڑ توڑ
ھونسے برسانے لگی۔ عادل کے منہ سے دردناک چیخیں نکلنے
یں۔ کچھ ہی دیر میں عادل کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ دھیرے
ہرے چیخیں' کراہوں میں تبدیل ہوگئیں پھر وہ بے ہوش ہوگیا
ن غصے سے غراتی میرب اس کے چہرے پر گھونسے برساتی رہی
ر جب کافی دیر بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو رشتے داروں نے دروازہ
۔دیا۔ کمرے کا نظارہ دیکھ کر سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر کئی
ں نے جھپٹ کر میرب کو دبوچ لیا۔ پتہ نہیں میرب میں اتنی
ت کہاں سے آ گئی کہ پانچ لوگ بھی اس پر قابو نہیں پا رہے
۔ایک رشتہ دار کی صلاح پہ میرب کے ہاتھ پیر رسی سے باندھ
ے گئے اور اسے ایک کمرے میں لے جا کر ڈالا گیا پھر کمرے
باہر تالا لگا دیا گیا۔ عادل کافی زخمی ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ گاڑی
اسے نرسنگ ہوم لے گئے' وہاں اس کا فوراً علاج ہوا اسی لیے
کی جان بچ گئی۔ ایک ہزار انسان مرجانے سے اتنا نقصان
ں ہوتا جتنا ایک احمق کے صاحب اختیار ہوجانے سے
ہے۔سہاگ رات کو بیوی کا شوہر پر قاتلانہ حملے کی خبر پورے
نے میں پھیلی تو لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے
۔زیادہ تر لوگوں کا کہنا تھا کہ میرب پر کسی بری روح کا سایہ
لیکن عادل کے خاندان میں سبھی لوگ بہت زیادہ پڑھے لکھے

اطلاع پاکر اگلے دن میرب کے میکے والے بھی
آ گئے۔ میرب کے سسرال والوں سے پورا واقعہ سن کر سب لوگ
حیرت زدہ ہوگئے کیونکہ وہ سب لوگ بھی بہت ایجوکیٹڈ تھے۔
انہیں بھی روحوں بھوت پریت پر یقین نہیں تھا۔

ایمان جب انسان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو
برائی مشکل اور نیکی آسان ہوجاتی ہے۔ دل نرم اور آنکھیں نم
رہنے لگتی ہیں۔ دوپہر کے وقت بند کمرے سے میرب کے سسکنے کی
آوازیں آئیں تو میرب کے میکے والوں کے کہنے پر میرب کے
کمرے کا تالا کھولا گیا۔ میرب کے ماں باپ اپنی بیٹی کو دیکھ کر
رونے لگے۔ میرب کے بڑے بھائی رافل نے میرب کی رسیاں
کھولیں' میرب بہت دیر تک اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے
مل کر روتی رہی لیکن جب میرب کے والد نے پیار سے اس کے
سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی' کیا ہو گیا تھا تمہیں؟

باپ کا اتنا کہنا تھا کہ میرب غصے سے کانپنے لگی۔ اس کی
آنکھوں سے انگارے سے برسنے لگے۔ اس نے اپنے باپ کی
گردن دبوچ لی اور غرا کر کہنے لگی۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی میری محبوبہ کا نکاح کرنے کی' میرب
میری ہے صرف میری' پھر اس نے اپنے باپ کو دونوں ہاتھوں سے
اوپر اٹھا کر پھینک دیا' باپ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا اور بے ہوش
ہوگیا۔ یہ دیکھ کر وہاں موجود ہر انسان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ
گئیں۔ بڑی مشکل سے کئی لوگوں نے مل کر میرب کو قابو میں کیا۔
میرب چیختی ہوئی بے ہوش ہوگئی۔

عادل کے فیملی ڈاکٹر عمیر عارف کو بلایا گیا' جو شہر کے مشہور
ڈاکٹر تھے۔ ان کے آتے ہی میرب ہوش میں آ گئی۔ اس نے
ڈاکٹر عمیر کا بیگ پکڑا اور پھینکتے ہوئے کہنے لگی۔

''میری میرب کو چھونا بھی نہیں' ورنہ تجھے بھی بیچ کر ماردوں گا' تیری ڈاکٹری ایک سیکنڈ میں نکال دوں گا' چل بھاگ یہاں سے۔'' ڈاکٹر عمیر کے کہنے پر کچھ لوگوں نے میرب کو کس کر پکڑ لیا۔ وہ غراتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر عمیر نے اسے نیند کا انجکشن دیا جس کے اثر سے میرب سو گئی تو عادل کے والد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''میری بہو کو کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

ڈاکٹر عمیر نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''اسے دورے پڑتے ہیں' دورہ بھی اتنا تیز ہوتا ہے کہ اس کے اندر عجیب طاقت آجاتی ہے۔'' یہ سن کر میرب کی امی نے کہا۔

''ہمارے گھر میں تو میرب کو کبھی بھی دورہ نہیں پڑا' یہ ٹھیک تو ہوجائے گی نا؟''

عادل کی امی نے پوچھا۔

ڈاکٹر عمیر نے ایک پرچی پر دوا کے نام لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ ''نئے نئے ماحول سے میرب کا سابقہ پڑا ہے' اسے آرام کی ضرورت ہے' ڈاکٹر عمیر نے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر عادل! میرا مشورہ ہے کہ کچھ دنوں تک آپ میرب سے الگ ہی سوئیں تو بہتر ہوگا۔ عادل نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

''میں زندگی بھر اس کے ساتھ نہیں سوؤں گا' یہ ڈرامہ کر رہی ہے' مجھے یقین ہے کہ یہ شادی سے پہلے کسی سے محبت کرتی تھی' اس کے گھر والوں کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی لیکن اپنی آفت ہمارے گلے باندھ دی۔''

عادل نے میرب کے والدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں رونے لگے۔

''مہربانی کر کے ہماری بیٹی پر یہ الزام نہ لگائیں عادل میاں۔'' میرب کے ابا بازل حسین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو عادل یہ کہہ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

''برائے مہربانی آپ اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جائیں' ورنہ میرا بھی ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ جو انسان دوسروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے' حقیقت میں وہ اپنے کردار کی برائیاں دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔''

عادل کے والدین سے مشورہ کر کے بازل حسین اسی دن میرب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر عمیر کی دواؤں کا کچھ بھی اثر میرب پر نہیں ہوا تھا۔ میرب اکثر سوتی رہتی تھی۔ جاگتے میں گانا گاتی رہتی تھی۔ بے وجہ بڑبڑاتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ یہ گیت گا رہی تھی۔

''ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں' اس کی ماں نے گانا گا۔ سے منع کیا' میرب غصے سے سرخ ہوگئی اور ماں کے بال مٹھیا میں بھر کر چیخ دیا اور غراتے ہوئے بولی۔ ''میں گانا گاؤں یا غرا میری مرضی آئندہ مجھے روکنے کی کوشش کی تو گلا دبا کر ماردوں تجھے۔ میرب کو اپنی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرتا دیکھ کر بازل حسین نے میرب کے گال پر طمانچہ رسید کردیا۔ غصے سے تھر تھر کا میرب نے بازل حسین کو کئی بار پٹخا' بازل حسین کا سر پھٹ گیا' کی چیخیں سن کر سب لوگ ان کے پاس آگئے' میرب اپنے ابا کو رحمی سے پیٹ رہی تھی۔ ان لوگوں نے میرب کو رسی سے باندھ بستر پر ڈال دیا' میرب گالیاں بکتے بکتے گانا گانے لگی۔ گانا گاتے گاتے سو گئی' اچھی عادات کی مالک نیک اور پارسا عور کسی فقیر کے گھر میں بھی ہو تو اسے بادشاہ بنا دیتی ہے' میرب شدت بڑھتی گئی' وہ اب گندے گانے گانے لگی' گھر والے رو۔ تو وہ ان کی پٹائی کر دیتی' گھر والوں نے میرب کا علاج کئی ا ڈاکٹروں سے کرایا لیکن کوئی بھی ڈاکٹر یہ بتانے سے قاصر تھا میرب کو بیماری کیا ہے' لوگوں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے میر کے گھر والوں نے کئی تانترکوں میں بھی دکھایا مگر بھی نے یہی کہ اس کے اوپر ایک طاقت ور بد روح کا سایہ ہے۔ جسے ہم میں نہیں کر پائیں گے۔

گہری باتیں سمجھنے کے لیے گہرا ہونا پڑتا ہے۔ گہرا ہو کے لیے گہری چوٹیں کھانی پڑتی ہیں۔ ایک دن بازل حسین۔ گھر چوہدری انس آئے جوان کے بہت اچھے دوست تھے۔ انہ دیکھ کر میرب ہنسنے لگی اور گانا گانے لگی۔

میں کیا کروں ہائے مجھے بڈھا مل گیا''

چوہدری جی نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور وہاں سے جانا تو بازل حسین نے انہیں تفصیل سے میرب کے بارے میں تو چوہدری انس میرب کو غور سے دیکھنے لگے۔

میرب چلاتے ہوئے بولی۔ ''قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا۔ بڈھے اور میری جان جان من کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا۔ آنکھیں نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔''

چوہدری انس بازل حسین کو دوسرے کمرے میں لے گئے بولے' میرب بیٹی پر کسی بد روح نے قبضہ کر رکھا ہے' آپ ایک میرے کہنے پر ڈاکٹر آصف محمود مغل صاحب کو دکھا دیجیے۔ کے حکم سے میرب ٹھیک ہوجائے گی۔''

''ہم بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں' بھلا ڈاکٹر آصف کیا کر پائیں گے' میرب پر تو بد روح کا سایہ ہے۔'' بازل حسین

نے مایوسی سے کہا۔

"ڈاکٹر آصف محمود مغل روحانی علاج بھی کرتے ہیں اور کئی لوگوں کو ٹھیک بھی کر چکے ہیں۔ ایک بار انہیں دکھانے میں کیا حرج ہے؟"

چوہدری انس نے سمجھایا' اگلے ہی دن بازل حسین میرب کو ڈاکٹر آصف کے پاس لے گئے۔ وہاں کافی بھیڑ تھی۔ جن میں کئی روحانی مریض بھی تھے۔ ڈاکٹر آصف محمود مغل اپنے کمرے میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے مریض دیکھ رہے تھے۔ میرب شور مچانے لگی اور ڈاکٹر آصف محمود مغل نے اس کا نمبر آنے سے پہلے ہی اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ بازل حسین اور چوہدری انس کھڑے رہے..... ڈاکٹر آصف نے بڑے پیار سے میرب کو اپنے پاس بٹھالیا۔ میرب انہیں دیکھ کر گانا گانے لگی۔

دوری نہ سہے کوئی آج اتنے قریب آؤ
میں تم میں سما جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ

ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔ "تم بہت اچھے گویے ہو۔ تمہیں تو فلموں میں کام کرنا چاہیے۔" یہ سن کر میرب غمگین ہوگئی۔

"آج میں فلموں میں گلوکار ہوتا' لیکن شراب نے میری زندگی برباد کردی۔" اتنا کہتے ہوئے میرب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھ کر اس نے کہا۔ "سات ماہ پہلے کی بات ہے' لاہور کے شالامار باغ کے پاس میں نے ایک ہوٹل میں شراب پی' چکن کھایا' پھر نشے کی حالت میں اسکوٹر چلانے لگا' کلمہ چوک کے پاس ایک کار سے اسکوٹر ٹکرا گیا' اور میں وہیں سڑک پر مر گیا' چونکہ میری عمر پوری نہیں ہوئی تھی' اس لیے میری روح بھٹکنے لگی۔ گانا گانے کا شوق مرنے کے بعد بھی نہیں چھوٹا' ایک دن بھٹکتے بھٹکتے میں پنجاب یونیورسٹی کے پاس سے گزرا تو میں نے میرب کو دیکھا۔ رکشا پر بیٹھی میرب دھیمی دھیمی آواز میں گیت گا رہی تھی' بس تبھی سے میں میرب کے پیچھے لگ گیا' اور اسی رات جب میرب سو رہی تھی میں اس کے جسم میں سما گیا۔"

"اسے چھوڑ دو تو میں تمہیں آزادی دلا دوں گا۔" کہتے ہوئے ڈاکٹر آصف محمود مغل نے اپنے شاگردوں کو اشارہ کیا' شاگرد نے تھالی میں رکھا کالا دھاگہ اٹھا کر جھٹ سے میرب کی دائیں ہتھیلی پر باندھ دیا' دھاگہ بندھتے ہی میرب کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا' وہ پہلے چیخی چلائی پھر رونے لگی' اور بولی۔ "مجھے اس سے الگ مت کرو' میں اس کے بنا نہیں رہ پاؤں گا' ڈاکٹر آصف محمود مغل نے فرش پر رکھا ایک بھورا بیگ کھولتے ہوئے کہا اگر اسے آسانی سے چھوڑ دو گے تو تمہیں اپنے پاس رکھ لوں گا ورنہ جلا کر راکھ کر دوں گا' میرب تڑپنے لگی بری طرح رونے لگی۔ ڈاکٹر آصف کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

"مجھے مت جلاؤ' میں آپ کی ساری باتیں مانوں گا۔" کہتے کہتے میرب کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر آصف نے وہ بیگ بند کر کے اپنے ایک شاگرد کو دے دیا۔ کچھ دیر بعد میرب کو ہوش آیا تو وہ حیرت سے سب کو دیکھنے لگی۔

"کیسی ہو میرب؟" ڈاکٹر آصف محمود مغل نے مسکراتے ہوئے میرب سے پوچھا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اور بولی۔

"آپ کون ہیں؟ میں یہاں کیسے آئی؟" ڈاکٹر آصف محمود مغل نے بازل حسین سے کہا۔

"اب میرب بالکل ٹھیک ہے' آپ اسے اپنے گھر لے جاسکتے ہیں۔" بازل حسین نے کہا' اگر وہ پھر اس پر آ گیا تو.....؟"

ڈاکٹر آصف محمود مغل نے کہا۔ ہمارے بیگ سے کوئی بھی آزاد نہیں ہو پاتا ہے' وہ گویا عمر پوری ہونے تک بیگ میں بند رہے گا اور بیگ میں بند دوسرے ساتھیوں کو گانے سناتا رہے گا۔ یہ بیگ بھوتوں کی جیل ہے۔

زندگی برف کی طرح ہوتی ہے' نیک کاموں میں گزار دو ورنہ پگھل تو رہی ہے ختم بھی ہو جائے گی۔ بازل حسین میرب کو لے کر گھر آ گئے پھر جب عادل کو ڈاکٹر آصف محمود مغل نے پوری بات بتائی تو اسے یقین ہو گیا کہ میرب بے قصور تھی۔ عادل میرب کو اپنے گھر لے گیا' اس رات میرب کے ساتھ اس نے بے فکر ہو کر سہاگ رات منائی' میرب نے بھی اسے خوب پیار کیا' دو ماہ میرب کے ساتھ رہنے کے بعد عادل دوبئی چلا گیا۔ اب وہ ہر رات اسکائپ پر میرب سے باتیں کرتا ہے۔

میرب ہنستے ہوئے اسے اس ننھے کے بارے میں بتاتی ہے جو پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔

جامن کا درخت

ربیعہ امجد

ان کے گھر میں مشہور تھا کہ گھر کے آنگن میں لگے جامن کے درخت پر بھوتوں کا سایہ ہے لہٰذا کوئی درخت سے جامن نہیں توڑتا تھا مگر اسے درخت سے جامن توڑ کر کھانے کا شوق تھا۔

ایک چلبلی لڑکی کی روداد، وہ سالوں پرانی روایات کو بدلنا چاہتی تھی

سنہری دھوپ چھن چھن کر کھڑکی سے اندر آ رہی تھی اس نے کروٹ بدلی مگر اب نیند آنا محال تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انگڑائی لیتے ہوئے نظر کھلی کھڑکی پر پڑی۔ یہ کھڑکی کس نے کھولی اور پردے کس نے پیچھے کیے وہ حیران ہوئی رات کو وہ خود یاد سے بند کر کے سوئی تھی۔

"شانو۔۔۔ اے میں کہتی ہوں باہر آ جا اٹھ کہ ارے غضب خدا کا سورج سوا نیزے پہ ہے اور یہ نالائق ابھی تک پوستیوں کی طرح کمرے میں پڑی ہے۔۔۔ راحیلہ ارے سنتی ہو۔۔۔ اٹھاؤ جا کہ مہارانی کو ورنہ میں خود جاؤں گی اب ڈنڈا لے کر۔۔۔" -باہر سے دادی کی چنگھاڑتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اسے چاروناچار اٹھنا پڑا جانتی تھی اگر اب وہ باہر نا گئی تو وہ خود تشریف لے آئیں گی جو اسے خاصا مہنگا پڑتا تھا۔

"حد ہوتی ہے ویسے۔۔۔ اس گھر کے لڑکے بارہ بارہ بجے تک پڑے رہتے ہیں کمروں میں۔۔۔ مگر مجال ہے جو دادی ان کو کچھ کہیں اور ایک میں ہوں۔۔۔ ذرا دو گھڑی آرام کر لوں دادی کو کھٹکنا شروع ہو جاتی ہوں۔۔۔ پتہ نہی ہر کوئی مجھے سدھارنے کے چکروں میں کیوں ہلکان ہوا جا رہا۔۔۔" -وہ بڑبڑاتی ہوئی لاونج میں آ گئی جہاں دادی اپنی نگرانی میں چھنو سے صفائی کروانے میں مگن تھیں اور بات بات پہ ڈانٹ رہی تھیں جس پر وہ منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے بناتی چاروناچار کام کر رہی تھی- جانتی تھی کیسے بنا جان چھڑوانا ناممکن ہے-

"اے بی بی ہو گئی تمہاری صبح۔۔۔ خدا خیر کرے بڑی جلدی اٹھ گئی ہو۔۔۔" -انہوں نے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورا- توپوں کا رخ اب شانزے کی طرف ہو چکا تھا-

"ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے کم سے کم وہ تو اپنی مرضی سے گزارنے دیا کریں" -اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا-

"نا جانے کون لوگ ہیں جن کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔۔۔ ایک میں ہوں کسی پل چین نہیں۔۔۔ حسرت ہی رہ جائے گی میری کہ شاید کبھی میں بھی ایک دن اپنی مرضی سے جی لوں۔۔۔" -وہ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی صوفے پر آن بیٹھی-

"اے شانو کبھی ماں بدنصیب کی بھی خبر لے لیا کرو۔۔۔ سارا دن کام میں جتی رہتی ہے لوتھا کی لوتھا ہو گئی ہو مگر مجال ہے جو ذرا عقل آ جائے۔۔۔" -وہ اس کی بات کو یا تو نظر انداز کر چکی تھیں یا پھر ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی-

"اوفو دادی آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔۔" -اس نے غصے سے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی کرارا سا جواب دیتیں چھنو سے گلدان گر کر ٹوٹ گیا۔

"اے ستیاناس تیرا۔۔۔ ارے دھیان کہاں ہے تمہارا۔۔۔ نا میں پوچھتی ہوں بی بی تم کن مراقبوں میں گم ہو۔۔۔ دو منٹ میں سات آٹھ سو کا نقصان کر دیا" -اب

چھنو کی پھر شامت آ چکی تھی۔۔۔شانزے نے اپنی جان چھوٹنے پہ شکر ادا کیا وہ چھنو کی عزت افزائی پہ دانت نکال رہی تھی اب۔

"کچھ شرم کرو۔۔۔۔یہ حال تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔"۔عمر نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے افسوس سے کہا اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

"عمر بھائی ایک بات مانیں گے۔۔۔۔؟"۔وہ اسے دیکھتے ہی کچھ سوچ کر بولی اس کی بات کو مکمل نظر انداز کر دیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔"۔عمر نے ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔وہ اتنی جلدی مان گیا تھا شاید موڈ کچھ اچھا تھا۔

"آپ مجھے میری فرینڈ کہ گھر چھوڑ آئیں۔۔۔۔کل پیپر ہے ہمارا۔۔۔تو میں اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ لوں گی۔۔۔"۔اس نے چہرے پر دنیا جہان کی مسکینیت طاری کرتے ہوئے کہا

اوکے۔۔۔۔دادی سے پرمیشن لے لو چھوڑ آتا ہوں۔۔۔۔"وہ ٹی وی سے نظریں ہٹائے بنا مصروف سے انداز میں بولا۔

"عمر بھائی۔۔۔۔"۔وہ ناراضگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی

"سوری ڈیر دادی کی اجازت کے بنا یہ پاسیبل نہیں۔۔۔۔کیونکہ تم تو جانتی ہو انہیں تمہارا باہر جانا پسند نہیں۔۔۔۔"۔وہ پہلو بچاتے ہوئے بولا تو شانزے اس کی مکاری پر حیران رہ گئی۔

"دادی کو تو میں ہی پسند نہیں۔۔ان کا بس چلے تو۔۔۔۔"۔اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی جب دادی کی ٹکڑی سی چھڑی کمر پہ پڑی۔

وہ تو تڑپ ہی اٹھی تھی۔۔۔۔شا کی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔۔۔۔وہ بھلا کب وہاں آئیں تھیں۔

"ٹانگیں توڑ دوں گی اگر ایسا سوچا بھی تو۔۔۔لو کرلو بات جوان لڑکی یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر جاتی اچھی لگے گی بھلا۔۔۔"۔۔وہ غصے سے بولیں۔

شانزے اتنی عزت افزائی وہ بھی عمر کے سامنے پر ششدر رہ گئی۔۔۔۔آنکھیں فوراً بھر آئیں۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی۔

عمر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکا تھا۔۔۔اس کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔مگر وہ کیا کرسکتا تھا وہ اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے بھگتتی تھی یہ سب۔۔۔دادی اب کچن میں جا چکی تھیں۔۔۔کچھ کہنا ان سے بے کار تھا۔۔اس نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی دل ایک دم سے بے چین ہوگیا تھا۔

☆☆.....☆☆

"بی بی جی آ کر کھانا کھالیں۔۔۔"۔چھنو نے پھر ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا جہاں وہ گلابی کمبل میں منہ سر لپیٹے لیٹی تھی۔

"تمہیں سمجھ میں نہیں آتا کتنی بار کہوں کہ نہیں کھانا مجھے کھانا۔۔۔تم ڈھیٹ عورت سنتی نہیں ہو۔۔۔جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔۔۔۔"۔وہ کمبل منہ سے ہٹا کر چیخی۔

"اہ جی بڑے صاحب نے بھیجا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اپ کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔۔"۔چھنو نے ڈھیٹ ہونے کا پھر ثبوت دیا وہ ڈرتی کمرے کے اندر نہیں آ رہی تھی اس کا کیا بھروسہ تھا غصے میں اگر ہاتھ میں کوئی چیز اجاتی تو وہ اس کے سر میں مارنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔

"ان سے کہہ دو کہ مجھے نہیں کھانا۔۔۔اور اب تم اپنی یہ منحوس شکل لے کر دوبارہ آئیں تو میں تمہارا حشر نشر کردوں گی۔۔۔"۔چبا چبا کر کہتی ہوئی بولی اور اگلے ہی لمحے پھر کمبل کے اندر گھس گئی۔

چھنو بیچاری حق دق کھڑی رہ گئی۔۔۔سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔

"تم جاؤ نیچے میں لے کر آتا ہوں اسے۔۔۔۔"۔عمر نے اسے مدھم سے لہجے میں کہا تو وہ کسی برقی رو کی طرح بھاگی وہاں سے۔

وہ دروازہ کھول کہ اندر داخل ہوا کمرے میں ملگجی سی روشنی ہو رہی تھی۔۔۔بیڈ پر وہ کمبل میں چھپی ہوئی تھی۔

اس نے اس کے پیروں سے کمبل اوپر کیا

"کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔پھر آ گئی ہو تم۔۔۔"وہ غصے سے کمبل کے اندر سے چیخی۔۔۔۔"۔مگر چند لمحوں تک جب کوئی جواب نا آیا تو کمبل منہ سے ہٹایا۔۔۔وہ عمر کو وہاں دیکھ کہ ساکت رہ گئی دور دور تک اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

"اٹھو اور چلو نیچے۔۔۔تمہیں پتہ ہے نا پاپا تمہارے بغیر کھانا نہیں کھاتے تو پھر کیوں پریشان کر رہی ہو ان کو۔۔۔۔"۔وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں آنا۔۔۔"وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔پاس پڑا دوپٹہ گلے میں ڈال لیا مگر ہنوز ناراض رہی۔

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔۔۔۔"۔عمر نے اس کو پچکارتے ہوئے کہا یوں جیسے وہ واقعی بچی ہو۔

"میں اچھی نہیں ہوں۔۔۔۔اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو دادی سے پوچھ لیں۔۔۔ان سے بہتر میری کوئی تعریف نہیں کرسکتا۔۔۔"۔اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی بھر آیا۔۔۔اور نیلی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہونے لگیں۔

"وہ تمہارے بھلے کے لیے ہی ڈانٹتی ہیں۔۔۔۔ان کی دشمنی نہیں ہے تم سے۔۔۔بلکہ سب سے زیادہ پیار وہ تم سے ہی کرتی ہیں۔۔۔بس کبھی کبھار غصے میں ڈانٹ دیتی ہیں۔۔۔اور تم ہو کہ ذرا سی بات پر ناراض ہو کر بیٹھ ہو۔۔۔۔"۔عمر نے اسے رسان سے سمجھایا جواب سوال سوں کر رہی تھی۔

"انہوں نے مجھے مارا بھی تو تھا نا آج۔۔۔اور وہ بھی آپ کے سامنے۔۔۔پتہ ہے مجھے کتنی انسلٹ فیل ہوئی تھی۔۔۔۔"۔وہ معصومیت سے بولی تو عمر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو پھر کیا ہوا میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔۔۔۔"۔وہ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔۔۔۔نیلے بھرے بھرے کٹوروں میں عمر کا دل ڈوبنے لگا۔۔۔اس کی

آنکھیں کسی جھیل کی مانند لگ رہی تھیں اس وقت جن سے پانی چمکتے ہوئے موتیوں کی مانند باہر چھلک رہا تھا۔۔۔۔بے ساختہ اس کا دل چاہا ان موتیوں کو اپنی پوروں سے سمیٹے۔۔۔۔اور اس نیلی آنکھوں والی گڑیا کو پھر کبھی نا رونے دے۔۔۔۔۔

عمر بھائی۔۔۔۔وہ اس کے جذبات سے انجان بولی تو وہ چونکا۔۔۔۔فوراً خود کو سنبھالا

جی بولو۔۔۔۔نگاہیں اب بھی اس کے شفاف چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔

"کیا یہ ہماری سگی دادی ہیں۔۔۔۔؟"۔معصومیت سے سوال پوچھا گیا۔

"ہم سے تو یہی کہا گیا۔۔۔۔باقی تم اپنے تایا ابو سے کنفرم کرلو۔۔۔۔"۔وہ اس کی بات سن کر شرارت سے بولا مگر وہ اس شرارت کو بھانپ نا سکی۔

"ہاں میں بالکل پوچھوں گی تایا ابو سے۔۔۔مجھے تو پکا شک ہے کہ یہ ہماری سگی دادی نہیں ہیں۔۔۔"۔اس کے بھولپن سے کہنے پر عمر مسکرا کر رہ گیا۔

"اچھا چلو پھر نیچے چل کے پوچھ لو پاپا سے۔۔۔۔۔"۔وہ اس کا موڈ ٹھیک ہوتے دیکھ کر دوبارہ بولا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔۔۔دادی بھی وہیں ہوں گی۔۔۔۔"۔اس نے پھر منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں کہیں گی تمہیں۔۔اور نیچے تمہارے تایا ابو بھی تو ہوں گے نا۔۔۔۔ان کے سامنے کوئی کچھ کہہ سکتا بھلا تمہیں۔۔۔۔"۔عمر نے اسے قائل کرنے والے انداز میں کہا تو وہ سوچ میں پڑھ گئی۔کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی شاید۔

"اچھا چلیں۔۔۔میں ان سے دادی کی شکایت بھی کروں گی۔۔۔"۔اس نے ٹیبل دور پھینکا اور نیچے اترتے ہوئے بولی۔۔۔۔

"چلو۔۔۔"۔عمر نے اسے مانتے دیکھ کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

.....☆☆.....

"اے لڑکی دو گھڑی ٹک کے بیٹھ جاؤ اور مجھے مالش کرنے دو۔۔۔۔کب سے اچھل کود کر رہی ہو۔۔۔۔"۔شانزے اٹھنے لگی تو دادی نے کھینچ کے نیچے بٹھایا۔۔۔وہ اس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں جبکہ وہ تھی کہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر پنگے لے کے ان کے اشتعال کو ہوا دے رہی تھی۔ان کی نظر ذرا اِدھر اُدھر ہوتی تو وہ اٹھنے کی کوشش کرتی مگر وہ ہر بار اس کا ارادہ بھانپ لیتیں۔ان عقابی نگاہوں سے مخفی ہو کر وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔وہ جب بھی اٹھنے کی کوشش کرتی دادی دو چھاپڑ رسید کر کے دوبارہ بٹھا لیتی اور وہ لال چہرہ لیے پھر ان کے آگے مجبوراً بیٹھ جاتی اس کی یہ حالت صوفے پہ لیٹے تیمور کو بہت لطف دے رہی تھی۔بار بار اس کا قہقہہ لاؤنج کے در و دیوار میں گونجتا جس پر وہ مزید غصے میں آجاتی بس نہیں چل رہا تھا اس کے دانت توڑ دے۔

"دادی پلیز بس کریں اور کتنا تیل لگائیں گی میں نے اگر اسکول نہیں جانا ہوتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بالوں کو ہر وقت تیل میں ڈبو کے رکھوں۔۔۔"۔وہ غصے سے بولی مگر دادی ہنوز اپنے کام میں مصروف رہیں اس کی بات کا جواب دینا انہوں نے گوارا نہیں کیا تھا اور اسی بات پہ اس کو پھر تپ چڑھ گئی۔اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا دادی کو ہی اپنے بالوں کی فکر میں پایا ورنہ اس کی ماں کو تو کوئی غرض نہیں تھی اسے دادی کے رحم و کرم پر چھوڑ کے وہ بہت مطمئن تھیں اور دادی کو تو اس کے بالوں کی حد سے زیادہ فکر تھی اور ان ہی کی محنت کا نتیجہ تھا کہ ابھی سے اس کے بال کمر سے نیچے تک آتے تھے۔لمبے گھنے سیاہ بال جن کو دادی اسے خود ہاتھ بھی نا لگانے دیتیں وہ خود اس کے بالوں میں تیل لگاتیں اور کنگھی بھی خود کرتیں۔۔۔شانزے کا دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کے دل چاہتا کہ بھی کوئی اسٹائلش سی کٹنگ کروائے اور بالوں کو کھلا چھوڑے مگر یہ سب بس وہ سوچ سکتی تھی کہنے کی صورت میں شامت لازماً تھی۔

"دادی پلیز بس۔۔۔"۔اس نے انہیں ہتھیلی پر اور تیل ڈالتے دیکھا تو بدک کر پیچھے ہوئی۔

"لڑکی میرا دماغ خراب مت کرو میں کہے دیتی ہوں۔۔۔پہلے ہی بال اتنے روکھے ہو رہے

ہیں۔۔۔۔"۔۔دادی نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا تو شانزے نے حیرت سے اپنے لمبے سلکی بالوں کو دیکھا اور دادی کی بات سوچنے لگی۔

تیمور اس کی حالت دیکھ کر مسلسل مسکرا رہا تھا جس پر اسے آگ ہی لگ گئی۔

"آپ کے کیوں دانت نکل رہے ہیں۔۔پہلی دفعہ برش کیا جو یوں بار بار ان کی نمائش کر رہے ہیں۔۔۔۔"۔۔اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو تڑخ کر بولی جس پر تیمور تو ڈھٹائی سے مسکراتا رہا مگر دادی کو چٹکلے لگ گئے۔

کچھ شرم کرو بڑا ہے آٹھ سال تم سے۔۔۔ان کے ہاتھ تیل والے تھے ورنہ اس بدتمیزی پر اس کی اچھی خاصی خاطر ہو جاتی۔۔۔۔وہ غصے سے دانت پیس کر رہ گئی۔

اس اثنا میں عمر لاونج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتا بمشکل صوفے تک آیا اور گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا تیمور اسے دیکھتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"جاؤ چائے بنا کر لاؤ بچہ تھک گیا ہے۔۔۔"۔دادی اس لیے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں جس سے تھکاوٹ چھلک رہی تھی۔

وہ حیرانی سے ان کی شکل دیکھنے لگی۔۔۔۔

"اٹھو بھی۔۔۔"۔دادی نے اسے گم صم بیٹھے دیکھ کر دوبارہ کہا تو وہ چارو ناچار اٹھ کر کچن میں آ گئی اور دادی عمر کی طرف بڑھیں جو آنکھیں بند کیے صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

چائے بناتے ہوئے بھی اس کا ذہن الجھا رہا عمر کا پریشان چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

☆☆.....☆☆

وہ صحن میں آئی تو دادی کو جامن کے درخت تلے بیٹھا دیکھ کر اُن کی طرف چلی آئی۔دادی چادر پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ فارغ ٹائم میں یہی کام کرتی تھیں۔ شانزے اُن کے برابر بچھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"دادی آپ آج پھر جامن کے درخت تلے بیٹھی ہیں آپ کے پیر بابا کو پتہ چلے گا تو غصہ کریں گے"۔

شانزے نے اُن کو شرارت سے چھیڑا۔دادی نے ایک نظر چشمے کے اوپر سے اُس کو دیکھا۔

"تو اِن سب باتوں کی بجائے کام کاج میں دلچسپی لیا کرو وہ زیادہ بہتر ہے"۔اُنہوں نے اُس کی بات پر سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر سے اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔سوئی اور سرخ دھاگے سے بنایا گیا مصنوعی پھول بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ہاتھوں کی مہارت اور ہنر کا اندازہ باخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"دادی میں سوچ رہی ہوں کہ آج جب عمر بھائی آئیں گے تو اُن سے کہوں گی کہ جامن اتار کر دیں مجھے کھانے ہیں"۔شانزے نے للچائی نظروں سے اوپر دیکھتے ہوئے کہا تو دادی کے کڑھائی کرتے ہاتھ ساکت ہوئے۔

"خبردار جو ایسا سوچا تو ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دوں گی۔منع کیا ہوا نا تمہیں کہ درخت پر لگے جامن کھانے کا سوچنا بھی نا کبھی"۔دادی کو تو اُس کی بات پر چٹکلے لگ گئے۔

"پر دادی۔۔۔۔"۔

"بس"...۔شانزے کی بات ادھوری رہ گئی دادی نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کو چپ کروا دیا۔

"جاؤ اور اُٹھ کے کام کرو جا کر"۔دادی نے اُس کو وہاں سے اٹھانے کے لئے کہا۔

"دادی پاپا کہتے ہیں کہ تم بس پڑھا کرو کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔وہ چارپائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"ایک تو تیرے باپ کی سمجھ نہیں آتی مجھے نا جانے کونسا افسر بنانا ہے اُس نے تمہیں پڑھا لکھا کر"۔دادی نے اُس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"دادی ایک بات پوچھوں؟"۔وہ جامن کے درخت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں پوچھ"۔اُنہوں نے اجازت دے کر احسان جتایا۔

"آپ پہلے یہ بتائیں کہ غصہ تو نہیں کریں گی"۔وہ اُن کے غصے سے خائف تھی اسی لئے پوچھ بیٹھی۔

"اگر کرنے والی ہوئی تو ضرور کروں گی"۔اُنہوں نے کہا تو شانزے کا منہ لٹک گیا۔

"اچھا چل پوچھ"۔

"دادی جامن کے درخت پر سچ میں کوئی بھوت پریت رہتے ہیں؟"۔ شانزے نے کئی سال بوڑھے درخت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر شروع ہوگئی"۔ دادی نے اُسے گھورا۔

"دادی پلیز بتائیں نا"۔ وہ بضد تھی۔

"ہاں رہتے ہیں"۔ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولیں۔

"کبھی نظر تو نہیں آئے"۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"نظر اس لئے نہیں آتے کیونکہ پیر بابا ہر مہینے آکر دم کرتے ہیں یہ سب اُن کی ہی وجہ سے ہے ورنہ تو پتہ نہیں کیا کیا ہوتا اِس گھر میں"۔

جامن کے درخت کی کہانی کچھ یوں تھی کہ آج سے کئی سال پہلے دادی ایک رات جامن کے درخت تلے سوئیں۔ رات کو وہ تہجد کے لئے اُٹھیں تو بقول اُن کے انہوں نے کسی کو درخت سے اُتر کر اندر لاؤنج میں جاتے دیکھا۔ مارے صدمے کے اُن کی چیخ حلق میں ہی دب گئی۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا پہلے راتوں کو اور پھر دن میں بھی دادی کو اکثر کوئی نا کوئی نظر آتا۔ پہلے پہل تو سب اُن کی بات سے اِنکاری تھے مگر بعد میں جب آئے روز یہ ہونے لگا تو باقی گھر والوں کو بھی اُن کی باتوں پہ یقین آنے لگا۔ یہ شانزے کی پیدائش سے پہلے کے واقعات تھے۔ پھر وہ پیدا ہوئی۔ وہ اِن سب سے بے خبر تھی۔ اُس کو حیرت تب ہوئی جب دادی اور ماما اُس کو اکیلے صحن میں نا چھوڑتیں اور جامن کے درخت کے پاس تو پھٹکنے بھی نا دیتیں۔ وہ بال کھول کر صحن میں نہیں جا سکتی تھی رات کے وقت صحن میں آنے پر مکمل پابندی تھی۔ ہر مہینے اُن کے گھر ایک بوڑھے بابا آتے تھے جن کو دادی پیر بابا کہتی تھیں۔ وہ گھر میں دم کرنے آتے تھے اور پھر خوب پیسے بٹور کر چلے جاتے۔ شانزے کو وہ کبھی اچھے نہیں لگے تھے لمبی لمبی اُلجھی ہوئی داڑھی اوپر بڑی بڑی مونچھیں۔۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں وہ بہت ہی خوفناک لگتے تھے۔ اُس نے کئی بار دادی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پیر بابا جھوٹے لگتے ہیں اور اِس گھر میں کچھ نہیں ہے مگر جب بھی وہ کہنے کی کوشش کرتی جواب میں دادی سے وہ سننے کو ملتیں کہ وہ توبہ کر لیتی کہ اب کبھی نہیں کرے گی۔ یہ سب باتیں اُسے ریشماں کی اماں سے پتہ چلی تھیں جو اُس کی سہیلی تھی۔

"شانو ارے میں کہہ رہی ہوں کہ بیل بج رہی ہے جا دروازہ کھول جا کے کب سے بج رہی ہے"۔ دادی نے اُس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔

وہ دروازے تک آئی وہاں پڑوس کی شبنم خالہ کھڑی تھیں۔ شانزے نے اُن کو سلام کرتے ہوئے اندر آنے کی جگہ دی۔

وہ دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آگئی۔ شبنم خالہ دادی کے پاس جا چکی تھیں۔

☆☆.....☆☆

شانزے نے کمرے سے کوئی تیسری بار جھانک کر دیکھا دادی کو مسلسل باہر بیٹھا دیکھ کر اُس نے کوفت سے دروازہ بند کر دیا۔

"دادی بھی لگتا آج یہیں ڈھیرا جمائے رکھیں گی"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

پھر کچھ سوچ کر چادر اوڑھتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔

"شام ویلے کدھر جا رہی ہو"۔ دادی کی عقابی نظروں نے فوراً اس کو تاڑ لیا۔

"ریشماں سے ملنے جا رہی ہوں"۔ اُس نے چادر کو سیدھا کرتے ہوئے جواب دیا۔ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی کہ کہیں دادی جانے سے منع ہی نا کر دیں۔ زیادہ بحث بھی نہیں کر سکتی تھی وہ اُن کے ساتھ ورنہ پاپا کو شکایت لگا دیتیں۔

"کیوں؟"۔ اُنہوں نے شکی انداز میں پوچھا۔

"ایک کام ہے اُس سے جلدی آجاؤں گی"۔

"شام ویلے جاؤ گی"۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئیں اور پھر بولیں۔

"اوفو دادی ابھی تو آپ نے عصر پڑھی ہے شام کہاں ہوئی ہے"۔ اُس نے کوفت سے ایک نظر اُن کو دیکھا۔

"وہ تو میں نے قضا کر کے پڑھی ہے ورنہ تو بہت وقت

ہو گیا"- دادی ہر حال میں اُس کو روکنا چاہتی تھیں-

"تو یہ آپ کی غلطی ہے آئندہ ٹائم سے، پڑھے گا اور اب میں جا رہی ہوں"- وہ کہتے ساتھ ہی یہ جا وہ جا- دادی پیچھے آوازیں دیتی رہیں-

☆☆......☆☆

شانزے لکڑی کا بوسیدہ دو کواڑوں والا بند دروازہ دھکیلتی اندر چلی آئی- ریشماں چولہے پر ہنڈیا پکانے میں مگن تھی- کھٹکے کی آواز پر متوجہ ہوئی-

"شانو تو--- ہائے ربا وہ بھی ہمارے گھر مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا"- ریشماں تو اُسے دیکھتے ہی کھل اُٹھی-

"ہاں میں---اب منہ بند کر لے ورنہ مکھی گھس جائے گی"- وہ بے پرواہی سے کہتی ہوئی امرود کے درخت سے کچا امرود توڑ کے کھانے لگی-

"کچا ہے مت کھاؤ"- ریشماں نے اُسے ٹوکا-

"تم چپ رہو دادی کی طرح بی ہیومت کیا کرو"- وہ اُسے گھورتے ہوئے چار پائی پر آن بیٹھی-

"انٹی کدھر ہیں؟"- اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا-

"کسی کام سے باہر گئی ہیں---تو سنا کیسی ہے---کبھی آتی ہی نہیں ہمارے گھر"- ریشماں نے شکوہ کیا"-

"میری ہٹلر دادی نہیں آنے دیتیں کیا کروں"- وہ امرود کو دانتوں سے کترتے ہوئے بے پرواہی سے بولی-

ریشماں اب آٹا گوندرہی تھی - شانزے نے ایک امرود توڑا-

"اچھا سن کل دوپہر میں ہمارے گھر آئے گی؟"- وہ امرود ختم کرنے کے بعد بولی-

"کیوں خیریت ہے نا"- ریشماں نے ہاتھ روک کر پوچھا-

"ہاں خیریت ہے---تو بتا کل آئے گی"-

"اچھا آ جاؤں گی---مگر وجہ بھی تو بتا نا"- ریشماں پھر سے اپنے کام میں لگ گئی-

"جامن توڑ کر کھائیں گے"- وہ مزے سے بولی تو ریشماں کا منہ حیرت سے کھل گیا-

"پگلا گئی ہو تیری دادی کچا چبا جائیں گی ہمیں"- ریشماں کو اُس کی عقل پہ شبہ ہوا-

"دادی اُس وقت سو جاتی ہیں بلکہ سب، گھر والے سو جاتے ہیں ہم آرام سے اپنا کام کر لیں گے"- وہ پورا پلان بنا کر آئی تھی-

"شانو چھوڑ دفعہ کر اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہم دونوں کی خیر نہیں"- سدا کی ڈرپوک ریشماں کسی طور پر تیار نہیں تھی-

"ارے اتنی بڑی شیرنی کے ہوتے ہوئے کس بات کا ڈر---اور رہی بات گھر والوں کی تو دادی اور ماما اُس وقت سو جاتی ہیں، عمر بھائی پاپا اور حیدر بھائی سب آفس میں ہوتے ہیں---ایسے میں کسی کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"-

"مگر شانو---"- ریشماں ابھی بھی ڈر رہی تھی-

"تو آ رہی ہے کہ نہیں بس اتنا بتا---اور یاد رکھنا اگر تو نے منع کیا تو تیری میری دوستی ختم"- اُس نے اُسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی جو ہمیشہ کی طرح کامیاب ٹھری-

"آ جاؤں گی"- وہ بالآخر مان ہی گئی-"

"کل دوپہر دو بجے یاد سے آ جانا"-

"اچھا ٹھیک ہے"- ریشماں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا-

"گڈ اب میں جاتی ہوں ورنہ دادی خود آ جائیں گی---بائے بائے"- وہ اٹھتے ہوئے بولی-

"کل دو بجے---"- دروازے کے پاس رک کر پھر یاد دہانی کروائی گئی-

☆☆......☆☆

اگلے دن ریشماں دو بجے سے پہلے ہی آ گئی- دادی اور ماما کھانا کھا کر سونے جا چکی تھیں- شانزے اسے دیکھ کر مسکرائی-

"تو رک میں ابھی آئی"- وہ اُسے وہیں کھڑا کر کے اندر بھاگی واپسی پر ہاتھ میں ٹوکری تھی اور آتے ہوئے لاؤنج کا دروازہ بھی اچھی طرح بند کر دیا-

"یہ تو بہت اونچے ہیں شانو کیسے اتاریں گے"- ریشماں نے اپنے سر سے کئی فٹ اونچی ٹہنیوں کو دیکھتے

کہا۔

"میں اوپر جاؤں گی تم نیچے رہنا۔۔۔۔میں اتار اتار کے نیچے پھینکتی جاؤں گی تم ٹوکری میں ڈالتی جانا"۔ شانزے نے کھسہ اتارتے ہوئے کہا۔ دوپٹہ کمر کے گرد باندھ لیا۔

"ہائے ربا شانو تو اتنی اوپر کیسے جائے گی"۔ ریشماں حیران ہوئی۔

"چارپائی رکھ کے اور کیسے۔۔۔۔تو بس نیچے کھڑی رہنا اور دھیان بھی رکھنا"۔ اُس کی بات پر ریشماں نے سر ہلا دیا۔

وہ کچھ ہی دیر میں واقعی تھوڑی سی تگ ودو کے ساتھ اوپر تھی۔ اُس نے موٹے موٹے دو تین جامن اتار کر منہ میں ایک ساتھ ڈال لیے۔

"افف کیا ذائقہ ہے قسم سے شمی بہت میٹھے ہیں"۔ وہ مزے سے کھاتے ہوئے بولی تو ریشماں کے منہ بھی پانی بھر آیا۔

"جلدی پھینک نا پھر"۔ وہ عین نیچے اُس جگہ پہ آئی جہاں وہ بیٹھی تھی۔

شانزے نے کچھ ہی دیر میں ٹوکری بھر دی۔ وہ اوپر خود بھی ساتھ ساتھ کھا رہی تھی۔ ریشماں بھی اب سب کچھ بھول کر جامن کھانے لگ گئی۔

"شمی کیا تجھے سچ میں لگتا کہ جامن کہ درخت پر کوئی جنات پریت ہیں"۔ شانزے نے جامن کی گٹھلی دور پھینکتے ہوئے ریشماں سے پوچھا۔

"پتہ نہیں یار مگر پیر بابا نے کہا کہ جنات کا پورا خاندان رہتا یہاں"۔ ریشماں نے ڈرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس فراڈیے کی، تو تم بات ہی چھوڑو ایک نمبر کا ٹھگ ہے باز ہے سالوں سے ہم لوگوں کو لوٹ رہا میرا بس چلے تو اُس کو گنجا کر دوں کمینہ کہیں کا"۔ پیر بابا کی بات پر دانت پیستے ہوئے غصے سے بولی۔

"یار کیا پتہ سچ میں ہوں"۔

"کوئی نہیں ہے یہاں سب بکواس ہے۔۔۔۔کیا آج تک کسی نے سوائے دادی کے کچھ دیکھا اور دادی نے بھی پتہ نہیں دیکھا ہوگا کہ نہیں کوئی گارنٹی تو نہیں ہے نا اس بات کی"۔ وہ بے پرواہی سے بولی۔

"شانو دادی۔۔۔۔" ریشماں نے اُسے پکارنا چاہا۔

"دادی کو چھوڑو تم اُن کے تو ویسے ہی اپنے خیالات ہیں"۔ اُس نے جامن توڑ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"شانو ادھر دادی۔۔۔۔۔" ریشماں کی زبان لڑکھڑا رہی تھی بولتے ہوئے۔

"کہاں؟"۔ اُسے ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔

"یہاں"۔ ڈر کے مارے ریشماں کانپ رہی تھی۔ ٹوکری تو کب کی گر چکی تھی۔

"ہائے میں مر گئی"۔ شانزے نے فوراً نیچے چھلانگ لگا دی۔ اب کہاں کہاں چوٹ لگی تھی وہ اُس کی پروا کیے بنا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دادی وہ ہم۔۔۔۔"۔ ریشماں نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے اسے بولنے کا موقع دیا ہی نا۔

"دیکھو بی بی تم تو اپنے گھر جاؤ۔ تمہاری تو میں ماں سے نپٹ لوں گی جس نے بھری دوپہر میں تمہیں آوارہ کیا ہوا ہے"۔ دادی کی بات ختم ہوتے ہی ریشماں بجلی کی سی تیزی سے بھاگی اور لمحوں میں گیٹ پار کر گئی۔

"اور تم۔۔۔"۔ وہ اب شانزے کی طرف متوجہ ہوئیں جس نے اُن کا دھیان ہٹتے ہی دوپٹہ کھول کے گلے میں ڈال لیا۔

"یاد نہیں پیر بابا نے کیا کہا تھا کہ کوئی کبھی بھی اِس درخت پر نا چڑھے کتنا سمجھایا تمہیں مگر تم نے ایک نہیں مانی"۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا شانزے کو سالم نگل لیتیں۔

"دادی آپ کے پیر بابا ایک نمبر کے جھوٹے ہیں جامن کے درخت پر کوئی نہیں رہتا۔ میں بلکل سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کسی کو۔ وہ تو بہت پرانی بات ہے اور تب بھی پتہ نہیں دیکھا تھا یا نہیں دیکھا تھا۔ پیر بابا آپ سے بس پیسے بٹورنے آتے ہیں"۔ اُس نے دادی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اور بھڑک گئیں۔

"تم کل کی چھٹانک بھر کی لڑکی اب پیر بابا کو جھوٹا کہو گی

جنہوں نے سالوں سے ہماری مدد کی ہے- اگر آج وہ نہیں ہوتے تو اس گھر میں نا جانے کیا ہوتا- میں تو اُن کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی اور تم ان کو ہی جھوٹا کہہ رہی ہو"- دادی کی زبان آگ اگل رہی تھی جس میں آنکھیں بھی بھرپور ساتھ دے رہی تھیں-

"اور ایک بات کان کھول کے سن لو آخری دفعہ کہہ رہی ہوں آج کے بعد اگر مجھے تم اس درخت کے آس پاس بھی نظر آئی نا تو بہت برا حشر کروں گی تمہارا لڑکی میں ابھی سے بتائے دیتی ہوں"- دادی اسے دھمکاتے ہوئے ٹوکری اٹھانے لگیں زمین سے-

کیسے لوگ ہیں جو اللہ سے زیادہ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے ڈرتے ہیں- جو اِن سب چیزوں پہ قادر ہے اُس کا کوئی خوف نہیں- شانزے پیروں میں جوتا پہنتے ہوئے سوچ رہی تھی-

یہ سب ہمارے کمزور ایمان کی نشانیاں ہیں کہ ہم اللہ کی بجائے پیروں فقیروں پر زیادہ یقین رکھتے ہیں-

☆☆.....☆☆

عمر لیپ ٹاپ پہ کچھ کام کر رہا تھا- جب شانزے کسی طوفان کی طرح بنا دستک دیے اندر داخل ہوئی- اپنے پیچھے دروازہ اِس قدر زور سے بند کیا تھا کہ عمر نے بے ساختہ کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے-

"اِس ڈفر کا کچھ نہیں ہوسکتا"- وہ بڑبڑایا ایک تاسف بھری نگاہ اُس پہ ڈالی-

وہ اُس کے نزدیک ہی بے تکلفی سے بیڈ پہ بیٹھ گئی- عمر نے اُس کو گھورا مگر مقابل کا شمار ڈھیٹ ترین لوگوں میں ہوتا تھا-

"عمر بھائی آپ سے بات کرنی ہے میں نے"- شانزے نے اُس کے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو ہاتھ بڑھا کہ بند کر دیا- عمر نے چپ چاپ اُس کی یہ حرکت دیکھی-

"بولو کونسی آفت ٹوٹ پڑی ہے تم پہ"- وہ دانت پیس کر گویا ہوا-

"آپ سچ بتائیں گے نا پرامس کریں"- وہ اُس کی بے نیازی کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کرنے لگی-

"ایسی کونسی بات پوچھنی ہے؟"- وہ کچھ مشکوک ہوا-

"آپ پہلے پرامس تو کریں"- وہ ضدی انداز میں بولی تو چار و ناچار عمر کو ہامی بھرنی پڑی-

"آپ کو پتہ ہے آج دادی نے مجھے اور ریشماں کو بہت ڈانٹا دوپہر میں۔۔۔ ہاتھ پیر توڑنے کی دھمکی بھی دی تھی"- اُس نے مزے سے بتایا تو عمر حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا-

"کیوں؟"- وہ بمشکل یہی کہہ سکا تھا-

"کیونکہ ہم دونوں نے جامن اتارے تھے"- اُس نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا-

"تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا شانزے بی بی۔۔۔ تم دو میں عجوبہ ہو۔۔۔ تمہیں تو اُٹھا کر کسی چڑیا گھر میں رکھ آنا چاہیے"- وہ اُس پر تاسف کا اظہار کرنے لگا-

"اچھا سچ بتائیں جامن کے درخت پر کوئی بھوت رہتے ہیں۔۔۔ ویسے مجھے تو نظر نہیں آئے میں تو اُن کے بہت پاس سے ہو کہ آئی ہوں آج"- وہ شرارت سے بولی-

"نہیں وہاں کچھ بھی نہیں ہے"- عمر نے سنجیدگی سے بتایا تو شانزے کا منہ حیرت کے مارے پورا کھل گیا-

"تو پھر آپ دادی کو منع کیوں نہیں کرتے کہ وہ پیر بابا کو نا بلایا کریں- وہ فضول میں ہر مہینے اُن کو اتنے پیسے دیتی ہیں"- اُس نے عمر کی بات پر افسوس سے کہا-

"کیونکہ دادی کسی کی بات نہیں مانتی- اس بات پر ایک دفعہ گھر میں ہنگامہ ہو چکا ہے- اس لئے اب کوئی بھی اُن کو منع نہیں کرتا"- عمر کی بات پر وہ جتنا حیرت کا اظہار کرتی کم تھا- عمر سب کچھ جانتا تھا مگر پھر بھی دادی کو کبھی روکا نہیں تھا- تعجب کی بات تو تھی-

"مگر بھائی یہ تو غلط ہے"- شانزے کو افسوس ہوا-

"کیا کر سکتے ہیں پھر"- وہ ٹیک لگاتے ہوئے بولا-

"آپ اُس پیر بابا کا کچا چٹھہ کھولیں دادی کے سامنے تاکہ اُن کو احساس ہو کہ وہ غلط کر رہی ہیں"-

"تم اِن سب باتوں میں مت پڑو۔۔۔ اپنی اسٹڈی پہ فوکس کرو بس۔۔۔ جو ہو رہا ہونے دو"- وہ اُسے سمجھانے والے انداز میں بولا-

"بلکل نہیں میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ میں اُس پیر کی

اہلیت دادی کو دکھا کے رہوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے"- وہ اٹل لہجے میں بولی-

"شانزے دادی تمہارا قتل کر دیں گی۔۔۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ ان سب چکروں میں نا پڑو۔۔۔ دادی کو ان کے حال پہ چھوڑ دو"- عمر نے اُسے ڈرانے کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی کی-

"ہرگز نہیں اب تو میں نے ارادہ کر لیا اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی"- وہ اپنی بات کہہ کر بیڈ سے نیچے اُتر گئی-

"آپ کسی کو کچھ مت بتانا پلیز"- اُس نے جاتے جاتے عمر سے ریکوسٹ کی-

"پاگل سائیکو نا ہو تو"- عمر نے بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ لیپ ٹاپ آن کر لیا-

☆☆.....☆☆

"آیئے پیر بابا آیئے"- دادی نے پیر بابا کو بیٹھنے کے لئے کرسی دی- کل رات سے شانزے کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی- ڈاکٹر نے جو دوائی دی تھی اُس سے کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا- بلکہ ڈاکٹر کی سمجھ میں آیا ہی نہیں تھا کہ اُسے کیا ہوا ہے- اتنی زیادہ دوائیوں کے بعد بھی وہ بے ہوش پڑی تھی- دادی نے اب اُس کی حالت کو دیکھتے ہوئے پیر بابا کو بلا لیا تھا اُن کا خیال تھا کہ اب وہی کچھ کر سکتے ہیں-

پیر بابا نے شانزے کی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کی نبض پہ ہاتھ رکھا- عمر نے یہ منظر دیکھ کہ خون کے گھونٹ بھرے-

"بچی پر سایہ ہو گیا"- وہ کچھ دیر بعد بولے اُس کی کلائی اب بھی اُن کے ہاتھ میں تھی-

"یا اللہ رحم کرنا"- دادی کا رنگ ایک دم فق ہوا انہیں پہلے سے ہی شک تھا-

"اس منحوس ماری کو کتنا سمجھاتی تھی میں کہ اُس درخت کے پاس نا جانا مگر مجال ہے میری کوئی بات سنے۔۔۔ ہائے وہی ہوا جس کا ڈر تھا"- وہ بین کرنے والے انداز میں دہائیاں دینے لگیں-

"میں نے کہا تھا نا کہ بچی کو دور رکھنا جامن کے درخت سے مگر آپ لوگوں نے میری بات کو اہمیت ہی نہیں دی- بس یہ سب اُسی کا اثر ہے"- اُنہوں نے اپنی لال آنکھوں میں اشتعال بھرتے ہوئے کہا-

"بابا خدا کا واسطہ کچھ کریں میں اپنی بچی کو اِس حال میں نہیں دیکھ سکتی"- دادی کی آنکھوں سے فوراً موٹے موٹے آنسو نکل آئے-

"ٹھیک ہے بی بی اِس کا علاج ہو سکتا۔۔۔ مگر اُس پر آپ کا خرچہ کافی آئے گا"- پیر بابا نے شانزے کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا-

"بابا آپ جو کہیں گے میں دوں گی بس میری بچی ٹھیک ہو جائے"- دادی کی آنکھوں پر تو شاید پٹی بندھ چکی تھی-

"اچھا ٹھیک ہے اِس کو کل میرے پاس لے کر آجانا ابھی میں دم کر دیتا ہوں اِس کو ہوش آجائے گا باقی اصل علاج کل ہو گا اِس کا"- اُنہوں نے کہنے کے بعد منہ ہی منہ میں نا جانے کیا پڑھنا شروع کر دیا پھر وقفے وقفے سے اُس پر پھونکیں مارنے لگے-

"یہ لو میں نے دم کر دیا ہے۔۔۔ اِس کو کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔۔۔ باقی کل تم اِس کو لے کر آجانا"- کچھ دیر بعد وہ دادی کی طرف مڑے-

"جی بابا میں صبح ہی آجاؤں گی"- دادی کو کچھ حوصلہ ہوا تھا-

"اچھا میری آج کی فیس۔۔۔۔"- اُنہوں نے جھجکتے ہوئے کہا تو پاس کھڑے عمر کا دل چاہا اُس کا منہ نوچ لے-

"آپ میرے ساتھ آیئے میں دیتی ہوں"- دادی اُن کو لے کر باہر چلی گئیں-

"ویسے بھائی مجھے تو یہ بندہ دو نمبر لگتا آپ کا کیا خیال ہے؟"- پاس کھڑے تیمور نے سوچ میں ڈوبے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا-

"تیمور بھائی آپ کو تو لگتا ہے نا مگر مجھے پورا یقین ہے کہ یہ دو نمبر ہی ہے"- شانزے نے اچانک آنکھیں کھولتے ہوئے کہا تو وہ دونوں حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگے جو بلکل صحیح سلامت تھی-

"شانو یہ سب کیا تھا"- تیمور فوراً اُس کے پاس آیا-

"میرا اپنا پلان تھا"- وہ مزے سے بولی-

"کیا مطلب؟"- تیمور کے خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا

جبکہ عمر کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔

"مطلب یہ کہ اِس پیر کی اصلیت اب میں دادی کے سامنے لاؤں گی دیکھنا آپ پھر دادی کو پتہ چلے گا کہ وہ سالوں سے کتنی بڑی غلطی کررہی ہیں"۔شانزے کی بات پر تیمور نے اُس کے سر پر ایک چپت لگائی۔

"ڈرامے باز لڑکی ہم سب کی جان نکال کہ رکھ دی تھی تم نے تو"۔ وہ اُس پر غصہ ہونے لگا مگر وہ ڈھٹائی سے مسکراتی رہی۔عمر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

"شانو تمہیں یہ سب کرتے ڈر نہیں لگا تھا"۔ تیمور کچھ ریلکس ہوا تھا۔

"بلکل بھی نہیں۔۔۔۔ بلکہ بہت مزا آیا"۔

"بیچارے ڈاکٹر انکل کا دماغ خوب گھمایا تم نے ویسے۔۔۔اُن کی سمجھ میں تمہاری بیماری آ ہی نہیں رہی تھی"۔ تیمور نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا۔تو شانزے کے بھی چھت پھاڑ قہقہے نے اُس کا ساتھ دیا۔

☆☆.....☆☆

دادی نے جب شانزے کو صحیح سلامت دیکھا تو اُن کو پورا یقین ہوگیا کہ یہ سب پیر بابا کے دم کی وجہ سے ہے۔ اُنہوں نے اگلے دن دس بجے کے قریب اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو وہ جھٹ سے مان گئی جس پر دادی نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔وہ پہلے سے ہی سب پلان کر کے بیٹھی تھی۔ اُس نے تیمور کو بھی آفس سے چھٹی کروالی اور اُسے بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے راضی کرلیا۔تیمور بہت منتوں کے بعد کہیں جا کہ راضی ہوا تھا جانے کے لئے۔

"شانو جلدی کرو"۔صحن میں کھڑی سفید چادر اوڑھے دادی نے کوئی تیسری بار شانزے کو آواز دی تھی۔اِس سے پہلے کے اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا وہ تیمور کا ہاتھ کھینچتی ہوئی باہر آگئی۔ دادی نے اچنبھے سے اُس کے ساتھ کھڑے تیمور کو دیکھا جو سر جھکائے ڈانٹ سننے کا منتظر تھا۔

"اِس کوکا ہے کو گھسیٹ کے لائی ہو ساتھ یہ کہاں جا رہا ہے؟"۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ تیمور کو ایک نظر گھورنے کے بعد شانزے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تیمور بھائی ہمارے ساتھ جائیں گے"۔ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے تیمور کے بازو پہ ایک چٹکی کاٹتے ہوئے کہا تو وہ کراہ کر رہ گیا اور دل ہی دل میں شانزے کی بچی کو ڈھیروں گالیوں سے نوازا وہ آج اُس کی عزت افزائی کروا کہ ہی دم لینے والی تھی۔

"ارے باؤلی ہوگئی ہو کیا یہ ہمارے ساتھ کیا کرلے جائے گا"۔ دادی نے اُس کی موٹی عقل پر افسوس کا اظہار کیا۔

"آپ بھی کچھ بولو۔۔۔۔۔ گونگے بن کے کسی مجسمے کی طرح کھڑے ہیں اس لئے تو آپ کو ساتھ نہیں لائی"۔ شانزے نے دانت پیستے ہوئے تیمور کے کان میں سرگوشی کی جو بے بسی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

"دادی میں آپ لوگوں کو چھوڑ آتا ہوں"۔ وہ ہمت کر کے بولا۔

"نن نہیں تم رہنے دو ہم پیدل ہی چلے جائیں گے ذرا ساتو ہے یہاں سے"۔ دادی نے فوراً منع کردیا۔

"دادی میں اتنا زیادہ پیدل نہیں چل سکتی پہلے ہی اتنی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ چکر بھی بہت آرہے ہیں"۔ شانزے نے چکرانے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا جس پر تیمور عش عش کر اُٹھا۔

"بھائی صحیح کہتے ہیں یہ واقعی ایک چلتا پھرتا عجوبہ ہے"۔ تیمور دل ہی دل میں اعتراف کر چکا تھا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے"۔ دادی اُس کی حالت کے پیشِ نظر مانتے ہوئے بولیں تو شانزے دل ہی دل میں اپنی اداکاری پر پُرجوش ہوئی۔

☆☆.....☆☆

"دادی اتنی دیر ہوگئی ہے وہ ابھی تک باہر نہیں آئی"۔ تیمور کو اب تشویش ہو رہی تھی۔ شانزے کو اندر گئے تقریباً پچیس منٹ ہوگئے تھے۔

"ارے بیٹا ایسے کاموں میں دیر تو ہوتی ہے"۔ دادی نے اُسے تسلی دی۔

"دادی آپ کو اُس کے پاس رہنا چاہئے تھا اِس طرح اکیلے اندر چھوڑ کے نہیں آنا چاہئے تھا"۔ تیمور الٹا پریشان تھا۔شانزے کو وہ جانتا تھا وہ بے وقوف سی تو تھی کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

"تم پریشان مت ہو پیر بابا کو میں سالوں سے جانتی

ہوں بہت شریف انسان ہیں"- دادی کہہ تو رہی تھیں پر اندر ہی اندر دل گھبرا بھی رہا تھا-

تیمور نے ایک نظر وہاں بیٹھے بھنگ پیتے ملنگوں کو دیکھا- وہاں موجود ہر شخص ہی مشکوک لگ رہا تھا- وہ بےچینی سے ٹہلنے لگا-

"دادی بچاؤ"- اندر سے شانزے کی چیخ سنائی دی- دادی نے بے ساختہ دل پہ ہاتھ رکھا- تیمور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دروازے تک آیا- اُس نے ایک نظر دادی کو دیکھا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں دروازہ گرا دیا- بوسیدہ لکڑی کا دیمک زدہ دروازہ فوراً ٹوٹ گیا تھا- اندر کا منظر اُن دونوں کے لئے ناقابل یقین تھا- وہ پیر شانزے کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کر رہا تھا- اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کہ اُسے چپ کرنے کے، لئے مجبور کر رہا تھا- اُن دونوں کو اچانک سامنے پا کر وہ ایک دم گھبرایا- شانزے بھاگ کے دادی کے سینے سے جا لگی اور اونچی آواز میں رونے لگی-

تیمور نے آگے بڑھ کہ اس کا گریبان پکڑ لیا اور اندھا دھند اُسے پیٹنے لگا- شور کی آواز پر اُس کے سارے مرید آ گئے مگر کوئی بھی اُسے چھڑانے کو آگے نا بڑھا- تیمور نے اُسے مار مار کے ادھ موا کر دیا-

"مر جانے بڈھے تجھے ذرا شرم نا آئی میری پھول سی بچی کے ساتھ ایسی حرکت کرتے ہوئے- ارے میں تو کہتی ہوں کیڑے پڑیں تجھے"- دادی اونچی آواز میں اُسے بد دعائیں دینے لگیں-

تیمور نے اُسی ٹائم پولیس کو کال کر کے بلایا اور اُسے اُس کے مریدوں سمیت جیل بھجوا دیا-

☆☆.....☆☆

گھر جاتے ہی سارا قصہ سب کے گوش گزار کر دیا گیا- دادی سخت شرمندہ نظر آ رہی تھیں-

"شانو ایک بات تو بتاؤ؟"- حیدر نے سب کو باتوں میں مصروف دیکھ کر شانزے کے کان میں سرگوشی کی تو وہ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی-

"کیا اُس پیر نے سچ میں تم سے بدتمیزی کی تھی؟"- وہ تجسس سے بولا- پاس بیٹھے عمر کا سارا دھیان اُن دونوں کی طرف تھا-

"نہیں۔۔۔۔"- وہ بولی تو اُن دونوں کے ساتھ ساتھ تیمور نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا-

"تو تم نے چیخ کیوں ماری تھی؟"- تیمور اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا-

"تاکہ دادی کے سامنے اُس کی اصلیت کھلے- ویسے اُس نے مجھ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی ضرور تھی مگر میں اُس کو کامیاب نہیں ہونے دیا"-

"شاباش۔۔! اُس کو ایویں مجھ سے پٹوا دیا اتنا"- تیمور نے ہنستے ہوئے کہا-

"عمر آج ہی کسی سے بات کر کے یہ جامن کا درخت کٹوا دو"- دادی نے اچانک عمر کو مخاطب کر کے کہا-

"ہائے دادی نہیں۔۔۔"- شانزے نے دہائی دی تو سب اُس کی طرف دیکھنے لگے-

"تمہیں کیا ہوا اب"- دادی حیرت زدہ تھیں-

"آپ جامن کے درخت کو کیوں کٹوا رہی ہیں اِس میں اُس کا کیا قصور ہے- اگر جامن کا درخت رہے گا تو میں کبھی جامن ہی اُتار کے کھا لوں گی"- وہ معصومیت سے بولی تو سب کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی-

"چپ کر کے بیٹھی رہو- اگر نا کٹوایا تو تم تو بندروں کی طرح اُسی پہ لٹکی رہو گی"- دادی نے اُس کو گھورا تو پہلو بدل کر رہ گئی- خود کو بندر کہنے پہ بہت غصہ آیا مگر چپ بیٹھی رہی- اب عمر کی منت سماجت کرنی تھی کہ وہ دادی کو ایسا کرنے سے روکے کیونکہ اُس گھر میں ایک وہی تو تھا جس کی ہر بات دادی مانتی تھیں- شانزے کو پورا یقین تھا کہ پیر بابا سے جان چھوٹنے پر جامن کے درخت کے بھوت بھی بھاگ گئے ہوں گے- وہ اپنی سوچ پہ مسکرائی- جب جامن کے درخت پہ کچھ ہے ہی نہیں تو اُسے کاٹنا کیوں ہے-

تلخ یادیں

خلیل جبار

خلیل جبار کا شمار نئے افق کے مستقل لکھنے والوں میں ہوتا ہے آپ کا تعلق تدریس کے شعبہ کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی رہا ہے وہ حیدر آباد کے مختلف اخبارات سے بطور کرائم رپورٹر اور کورٹ رپورٹر وابستہ رہے ہیں ہمارے ہی کہنے پر انہوں نے اپنے تجربات کو کہانیوں کی شکل دینی شروع کی زیر نظر کہانی روٹین کے موضوع سے ذرا ہٹ کر ہے لیکن اس میں بھی اس کو ایک پیغام ملے گا۔

قارئین افق کیلئے بطور خاص

میری نگاہ جیسے ہی اس شخص پر پڑی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایک پولیس کانسٹیبل نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی ہوئی تھیں اس کی نگاہیں زمین کی طرف تھیں۔ کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ قمیص میں بٹن کی جگہ اس نے کانٹے لگائے ہوئے تھے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ہاشم واحد ہے جو غربت کے دور میں اچھا لباس زیب تن کیا کرتا تھا۔ ادبی پروگراموں کی جان ہوا کرتا تھا۔ اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نظامت کے فرائض بھی اکثر وہی انجام دیا کرتا تھا۔ یہ آج سے تیس سال پرانی بات ہے میں ان دنوں کراچی کی ایک تنظیم معمار ملت پاکستان کا حیدر آباد ڈویژن کا صدر تھا۔ تنظیم کے صدر ہونے کی حیثیت سے میں اکثر ادبی و سماجی پروگرام منعقد کرتا رہتا تھا' ہماری تنظیم کے پہلے سرپرست میر پور خاص سے تعلق رکھنے والے سماجی رہنما ایم اکرم شیخ تھے۔ ان دنوں ایم اکرم شیخ کے بھائی خالد جیلر سینٹرل جیل حیدر آباد میں جیلر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایم اکرم شیخ اپنے بھائی کے ساتھ چند سال سینٹرل جیل کے کوارٹرز میں رہ کر واپس میر پور خاص چلے گئے' وہ جب تک حیدر آباد رہے ہماری تنظیم کے پروگراموں کی صدارت کرتے رہے۔ ایم اکرم شیخ کی خواہش پر ہی میں نے اپنے ایک پروگرام کی نظامت ہاشم واحد کو دی تھی۔ اس طرح ہاشم واحد سے واقفیت دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ پھر اکثر دوسری تنظیموں کے پروگراموں میں ہاشم واحد سے ملاقات ہونے لگی تھی۔

میں جیسے ہی اس کی جانب بڑھا اے ایس آئی عدالت کے کمرے سے باہر آیا اور اسے پکڑ کر جج صاحب کے پاس لے گیا۔ کانسٹیبل باہر ہی رہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کانسٹیبل سے ہاتھ ملایا۔ مجھے دیکھ کر سپاہی مسکرایا۔

''یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے یہ معمولی سا شراب پینے کا کیس ہے۔'' اس نے بتایا۔

''خبر واقعی خاص نہیں' مگر جس پر شراب پینے کا مقدمہ بنایا گیا ہے وہ خاص آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اس نے بتایا تھا کہ میں شاعر ہوں۔'' سپاہی نے بے پروائی سے کہا۔

''پھر بھی اس پر شراب پینے کا مقدمہ بنا دیا۔ سب کو یہ بات معلوم ہے کہ شاعر لوگ شراب پیتے ہیں۔'' میں نے

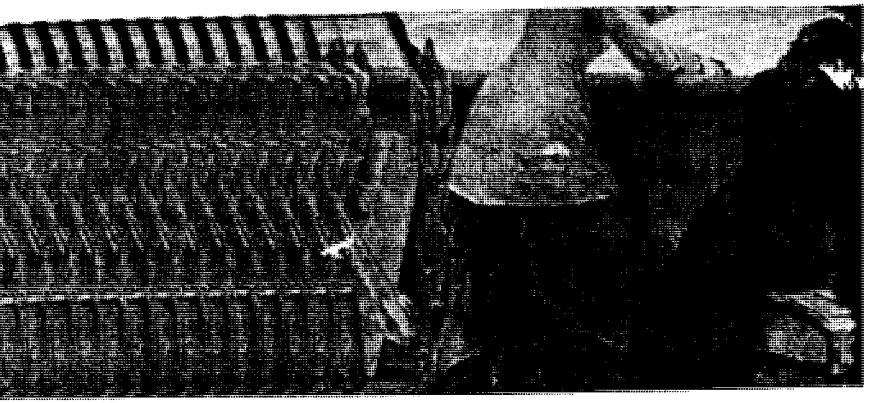

کہا۔

''یہ ہوش میں ہوتا تو ہم کبھی بھی اس پر مقدمہ نہیں بناتے۔''

''شراب پی کر شاعر لوگ کب ہوش میں رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نشے کی بدہوشی کی بات نہیں کر رہا۔''

''پھر کس ہوش کی بات کر رہے ہو؟''

''یہ ہمیں لیاقت کالونی کے گندے نالے کے پاس بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اگر یہ مر جاتا تو ہمارے تھانے والوں کے لیے مسئلہ بن جاتا۔ ہم نے اوپر بات کی تو یہی حکم ملا کہ پہلی فرصت میں ایف آئی آر کاٹ کر اس نشئی کو اسپتال پہنچاؤ۔ اس لیے مجبوراً ہمیں ایف آئی آر درج کرنا پڑ گئی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اس لیے ہم اسے عدالت میں لے کر آئے ہیں۔'' سپاہی نے کہا۔

ہر انسان کی زندگی نشیب و فراز سے پر ہوتی ہے' اس طرح ہاشم واحد کی زندگی بھی نشیب و فراز سے پر تھی۔ تعلیمی قابلیت نہ ہونے پر وہ کوئی اچھی نوکری حاصل نہ کر سکا تھا۔ چپراسی کی نوکری اس لیے نہیں کرتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے' حیدرآباد کا اتنا بڑا شاعر' حیدرآباد کی تاریخ کے بڑے بڑے پروگرام کی نظامت کرنے والا سرکاری محکمے میں چپراسی ہے۔ ادبی و غیر ادبی پروگراموں میں آنے والے غیر ادبی لوگوں پر رعب ڈالنے کو وہ خود کو مختلف محکموں کا ڈائریکٹر ظاہر کرتا تھا۔ سادہ لوح لوگ اسے سرکاری محکمے کا اصلی ڈائریکٹر سمجھ بیٹھتے' اور اپنے بھائی یا بیٹے کو نوکری کے لیے بات کرتے۔ ایسے میں وہ نوکری دلانے کی ہامی بھر لیتا' نوکری دلانے کے بہانے کسی سے پانچ ہزار کسی سے دس ہزار روپے وصول کر لیتا۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم ہوتی تھی جو اس کے خرچ کے لیے بہت ہوا کرتی تھی۔ رقم دینے والے کے بھائی یا بیٹے کو وہ نوکری تو نہیں دلا پاتا تھا' مگر اتنا ضرور ہوتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے چکر لگاتا رہتا تھا' وہ گھر پر نہیں ملتا تھا' ہاشم واحد صبح فجر میں گھر سے نکلتا تھا اور رات گئے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ ادبی و سماجی پروگرام ہی ہوتے تھے جن میں لوگ اسے آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ ہاشم واحد اس شخص کو دیکھ کر ایسی بات کرتا تھا جس سے وہ خوش ہو جاتا تھا' کوئی شخص غصے سے آپے سے باہر ہوتا تھا' اسے فوراً کہتا کہ آفریلیٹر تیار ہو گیا ہے' بس صاحب کے سائن باقی ہیں کل صبح میں صاحب سے آفریلیٹر پر سائن کرا کے تمہارے حوالے کر دوں گا۔

ہاشم واحد کو ہر ماہ کوئی نہ کوئی شکار ہاتھ لگ جاتا تھا جس سے اس کے کئی ماہ آسانی سے نکل جاتے تھے' جیب خرچ میں کوئی تنگی نہ آتی تھی۔

وہ پیسے لے کر نوکری نہ دلانے کے حوالے سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس لیے نئے شکار پھانسنا مشکل ہو گیا تھا۔ کئی لوگوں کے ہاتھوں وہ بری طرح پٹ بھی چکا تھا۔ یہ دن ہاشم واحد کے سختی کے دن تھے۔ پروگرام سے کنارہ کشی

کر کے چھپ گیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ بہت ڈسٹرب تھا۔

ہاشم واحد پر قسمت کی دیوی مہربان ہوگئی۔ ایک صوبائی وزیر نے اسے پرائیویٹ طور پر اپنا پی آر او رکھ لیا۔ اس کا کام وزیر صاحب کو تقریر لکھ کر دینا اور اخبارات میں بیانات جاری کرنا تھا۔

صوبائی وزیر ہاشم واحد کو سرکاری طور پر اپنا پی آر او بنانا چاہتا تھا مگر اس کی راہ میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری رکاوٹ بن گئی تھی۔ وہ جانتا تھا بغیر تعلیم کے اس کی یہ پوسٹ چار دن کی چاندنی کی طرح ہے۔ وزیر جیسے ہی گھر گیا' اس کی بھی یہ نوکری چھوٹ جائے گی' مگر وہ بھی مجبور تھا۔ اس دور میں جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس لیے وہ جعلی سرٹیفکیٹ حاصل نہ کر سکا۔

ہاشم واحد موقع شناس تھا' اس لیے لوگوں کو نوکریاں دلانا اور دیگر کام شروع کر دیے جس سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ اس نوکری کے ختم ہونے پر آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ وہ پورے شہر کو نوکریاں نہیں دلا سکتا تھا' اس لیے ایک آدمی کو نوکری دلاتا اور اس کے دس دوستوں سے رقم لے کر نوکری دلانے کا وعدہ کر لیتا وہ وزیر کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ اس لیے جنہیں نوکری نہیں ملتی وہ اس آسرے میں رہتے تھے کہ ابھی نہیں ملی تو مل جائے گی' جو لوگ مختلف کاموں کے سلسلے میں اس کے پاس آتے تھے ان سے کام کرانے کی مد میں رقم لیتا تھا جو لوگ ماضی میں اس کے ڈسے ہوئے تھے' اور نقصان پہنچا سکتے تھے انہیں بھی خوش کرنے کو نوکریاں دلوا دیں۔ اس کے گھر میں خوشحالی آ گئی تھی۔ اس کی برسوں سے ناراض بیوی بھی میکے سے لوٹ آئی تھی۔ ہاشم واحد اب کھل کر رقم خرچ کرنے لگا تھا۔ ہم دوستوں پر اس کی مہربانی بڑھ گئی تھی۔ جب ادبی و سماجی لوگ کسی جگہ جمع ہوتے تھے وہ کبھی حیدرآباد کی مہنگی بریانی' کبھی بمبئی کا کیک منگوا کر سب کو کھلاتا' سب اس کی فیاضی پر حیرت زدہ تھے۔

حکومت کی مدت باقی تھی کہ اچانک سابق صدر ضیاء الحق نے حکومت کو ختم کر کے ملک میں نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ سابق صدر کے اس اقدام سے ہاشم واحد کو بہت بڑا دھچکہ لگا تھا۔ وہ ادبی و سماجی پس منظر سے غائب ہو گیا۔

عدالت سے باہر آنے پر ہاشم واحد کی مجھ پر جیسے ہی نظر پڑی وہ مجھے دیکھ کر پہلے چونکا اور پھر شرمندہ ہو گیا۔

''خلیل جبار مجھے پتا چلا ہے کہ تم ان دونوں کورٹ رپورٹنگ کر رہے ہو۔''

''ہاں مجھے کئی سال ہو گئے ہیں کورٹ رپورٹنگ کرتے ہوئے لیکن تم یہ بتاؤ یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے؟''

''بس یار ہم شاعر لوگوں کی یہی کہانی ہے' بہت کچھ کما کر بھی کچھ نہیں کما پاتے ہیں۔''

''جب تم صوبائی وزیر کے پی آر او بنے تھے اس وقت تم نے بہت مال بنایا تھا پھر یہ کیا ہوا؟''

''خلیل جبار تمہیں پتا ہے کہ میرے پاس ڈگریاں نہیں تھیں صوبائی وزیر کو ایک پریس ریلیز جاری کرنے اور تقریر لکھ کر دینے والا شخص چاہیے تھا' اس لیے صوبائی وزیر نے پرائیویٹ طور پر مجھے رکھ لیا تھا' وزیر گھر گیا تو میں بھی گھر چلا گیا۔ میں نے مال بہت بنایا مگر جن غریب لوگوں سے میں نے رقم بٹور کر نوکریاں نہیں دلائیں یہ ان کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے کہ جو مال میرے پاس آیا وہ ویسے ہی چلا گیا' اب کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس' شراب پینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے ہیں' گھر میں پیسے نہ دینے پر آئے دن بیگم سے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں' میں اپنا غم غلط کرنے کو کچی شراب پینے لگا ہوں' رات کو میں نے جو کچی شراب پی وہ نقصان کر گئی' ورنہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کچی شراب پی ہو اور میری طبیعت بگڑ گئی ہو۔''

''شکر ادا کرو تمہاری زندگی بچ گئی۔ تمہیں یاد ہے نارمضان کے مہینے میں اسلم تیلی کی زہریلی شراب پی کر کتنے لوگوں کی اموات ہوئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد ہے اسلم تیلی بھی اس واقعہ کے بعد زیادہ عرصے نہ جی سکا تھا اور نوجوانی ہی میں انتقال کر گیا تھا۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

''آئندہ احتیاط کرنا کچی شراب دوبارہ بھول کر بھی نہیں پینا۔'' میں نے اسے نصیحت کی۔

''خلیل جبار ہماری دوستی بہت پرانی ہے' دیکھو یہ خبر اخبار میں نہیں آنی چاہیے۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

''ویسے یار اخبار کے لیے یہ بڑی خبر ہے' کہ سابق صوبائی وزیر کا سابق پی آر او اور شاعر شراب پینے کے الزام میں گرفتار۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھو تمہیں پرانی دوستی کا واسطہ ہے یہ خبر اخبار میں نہ آئے ویسے بھی تمہارے پاس بہت خبریں ہوں گی۔ میری خبر نہ چلنے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے میں یہ خبر اخبار میں نہیں دوں گا اب خوش۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے کہ تم میرے خلاف خبر نہیں دو گے۔ اس لیے میں نے تم سے عرض کی ہے۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

''ویسے عدالت میں آج کیا کارروائی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین دن کا ریمانڈ دیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔

''سائیں یہ ہمارے شاعر صاحب ہیں ان کا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔

''شاعروں اور ادیبوں کا ہم خیال رکھتے ہیں ہماری یہ مجبوری تھی کہ ایف آئی آر درج کی جائے۔ تم نے ان کی وہ حالت نہیں دیکھی جس حالت میں یہ ہمیں ملا تھا۔ ہمیں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو یہ شاعر صاحب اپنی جان سے گئے تھے۔ اپنے دوست کو سمجھاؤ کہ کچی شراب نہ پیا کرو اور صحت کا خیال رکھیں۔''

''میں نے انہیں سمجھا دیا ہے اگر میری بات پر انہوں نے عمل نہیں کیا تو یہ اپنی جان کا خود دشمن ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اس دن کے بعد میری پھر ہاشم واحد سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس ملاقات کو دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا۔

میں ابھی سیشن کورٹ جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دل میں خیال آیا کہ پہلے سول کورٹ کی کینٹین میں ایک چکر لگا لوں۔ سول کورٹ میں داخل ہوتے ہی میری نظر سب سے پہلے طلعت صابر علی ایڈووکیٹ پر پڑی۔ وہ کینٹین کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی تنظیم کے کارکن چاند ٹھیکیدار اور دیگر خواتین بھی بیٹھی تھیں۔

طلعت صابر علی ایڈووکیٹ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری میں کالونی انسپکٹر تھے اور اپنے دور جوانی میں ادبی و سماجی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ شہر سے دور کچی آبادی' امریکن کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ شہر سے لوگ طلعت صابر علی سے ملاقات کرنے جاتے رہتے تھے' جمعے کے دن ان دنوں چھٹی ہوا کرتی تھی۔ جمعے کے دن طلعت صابر علی کے گھر خوب ادبی محفل جمتی تھی' خوب بحث ومباحثے ہوتے تھے۔ وہ مہمان نواز بھی بہت تھے۔ گھر میں جو بھی ہوتا تھا مہمان کے لیے حاضر کر دیتے تھے۔ ادبی و سماجی لوگوں کے لیے چائے کے کئی دور چلا کرتے تھے۔

طلعت صابر علی کی خواہش تھی کہ شہر میں ہونے والی ''شام افسانہ'' کی تقریب کی صدارت ان کی ہو اور اس کی مہمان خصوصی شاعرہ رعنا نا ہید رعنا ہوں۔ ان کی یہ خواہش میں نے معمار ملت پاکستان کے تحت منعقدہ پروگرام 'شام افسانہ'' کی تقریبات منعقد کر کے پوری کر دی تھی۔

طلعت صابر علی سے دوستی ہو جانے پر مجھے اخبارات میں بیانات دینے کا بھرپور شوق ہو گیا۔ طلعت صابر علی کی تنظیم بزم فلاح کے سیکرٹری جنرل بن جانے پر میں روزانہ بیانات اخبارات کو جاری کرنے لگا تھا۔ اس کا مجھے نقصان زیادہ یہ ہونے لگا تھا کہ میرا پورا دن ضائع ہو جاتا تھا۔ گاڑی کھاتہ سماجی و ادبی لوگوں کا گڑھ تھا۔ ہوٹل ڈیلکس میں ایم اکرم شیخ دوستوں کی محفل جمائے ہوئے ہوتے تھے۔ سلطان ہوٹل (جس میں اداکار محمد علی مرحوم نے اپنا نوعمری کا وقت گزارا تھا۔ اس میں ایک طرف مرحوم شکیل احمد ایڈووکیٹ تنظیم اتحاد پاکستان کے صدر اپنی تنظیم کے کارکنوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے۔ دوسری ٹیبل پر ایاز مراد چنا اپنے فلمی رپورٹرز کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے۔ فردوس ہوٹل پر اسٹیج اداکاروں کے ساتھ صحافی کلیم اشرف کلیمی کی تنظیم چلڈرن کلب حیدرآباد شاخ کے صدر مظفر برلاس بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چائے پلائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ مظفر برلاس کا ایک مخصوص تکیہ کلام تھا کہ چائے تو ڑو گاڑی کھاتہ ہی میں ایک چیمبرز میں مسلم لیگی مرحوم شیخ محمد شریف کا آفس تھا۔ جہاں کوئی کاروبار نہیں ہوتا تھا' بلکہ سماجی' ادبی وسیاسی لوگوں کے بیٹھنے

کے لیے آفس صبح 9 کھول دیا جاتا تھا جو شام پانچ تک کھلا رہتا تھا۔ ان لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی تھی مگر میرا پورا دن ضائع ہو جاتا۔ میرا کہانیاں لکھنے کا شوق ختم ہو کر رہ گیا تھا اور پھر میں نے ایک فیصلہ کیا کہ سستی شہرت کو چھوڑ کر دوبارہ سے کہانیاں لکھنے پر اپنی توجہ مرکوز کی جائے۔ میرے اس فیصلے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔

طلعت صابر علی کو بھی دور جوانی میں افسانے لکھنے کا شوق تھا مگر سماجی و ثقافتی تنظیموں کے پروگراموں نے افسانے لکھنے کی حس کو ختم کر کے رکھ دیا تھا اور وہ آج تک تنظیمی پروگراموں اور خبریں نکالنے پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری سے گولڈن ہینڈ شیک لے کر وکالت کا پیشہ اپنائے ہوئے ہیں مگر وکالت سے زیادہ توجہ ان کی سوشل سرگرمیوں پر زیادہ ہے۔

''ارے آؤ شہزادے.....'' طلعت صابر علی ایڈووکیٹ نے مجھے دیکھ کر کہا۔

میں طلعت صابر علی ایڈووکیٹ سے ہاتھ ملا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''ارے تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تمہیں سیشن کورٹ میں دیکھ رہا ہوں۔'' استاد پیارے نے آتے ہی کہا۔

''میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نعیم بھائی نظر نہیں آ رہے ہیں؟'' استاد پیارے نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

''نعیم بھائی کو میں نے ہائی کورٹ کی طرف جاتے ہوئے صبح کے وقت دیکھا تھا۔'' طلعت صابر علی نے کہا۔

''خلیل بھائی دیکھ لو نعیم بھائی اکیلے اکیلے پیدا کرنے کے چکر میں لگے ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے آئیں گے تو ایسے مسکین بن جائیں گے کہ جیسے انہیں زمانے کی کوئی خبر نہیں ہے۔'' استاد پیارے کو جیسے کہنے کا لائسنس مل گیا تھا۔

استاد پیارے کی عادت تھی کہ اگر انہیں ساتھ لے کر نہیں جاؤ تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم کسی پیدا کے مشن پر لگے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ خود پیدا کے چکر میں دن بھر گھومتے رہتے ہیں اس لیے سب کے بارے میں ان کا یہی نظریہ رہتا ہے کہ وہ بھی پیدا کر رہے ہوں گے۔

''استاد پیارے آپ فوراً سے غلط فہمی کا شکار نہ ہو جایا کریں' میں نے خود نعیم صاحب کو کہا ہوا ہے کہ سیشن کورٹ اور سول کورٹ کو میں سنبھال لوں گا' اور آپ صبح میں کچھ وقت ہائی کورٹ کو دیکھ لیا کریں تاکہ کوئی بھی اچھی خبر ہم سے مس نہ ہو سکے۔'' میں نے کہا۔

''خلیل جبار تم ہمیشہ نعیم بھائی کی حمایت کرنے لگتے ہو' تمہیں کیا پتا وہ اکیلے میں کتنے پیدا کر لیتے ہوں گے اور تمہیں بتاتے نہیں ہیں۔'' استاد پیارے کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''استاد پیارے کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ فوراً ہائی کورٹ جانے کو مچل رہے ہیں۔

''استاد پیارے نعیم بھائی بہت اچھے انسان ہیں' آپ ان کی طرف سے اس طرح بدگمان نہ ہوں۔'' طلعت صابر علی ایڈووکیٹ نے کہا۔

''طلعت بھائی آپ نعیم بھائی کو.....'' استاد پیارے کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

نعیم قریشی ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ استاد پیارے ان کو دیکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ جب وہ نزدیک آئے' استاد پیارے پھر بولے۔

''نعیم بھائی آپ اکیلے کچھ نہیں کر سکتے' چاہے کتنا ہی زور لگا لیں۔'' استاد پیارے نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کیا کر دیا جو آپ اتنا غصہ کر رہے ہیں۔'' نعیم قریشی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

ایسے مواقع پر ہم دونوں ہی استاد پیارے کی تفریح لینے کو ایسے بن جاتے تھے کہ ہمیں کچھ پتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''نعیم بھائی میں دیکھ رہا ہوں آج کل آپ اکیلے ہی اکیلے پیدا کر رہے ہیں۔ استاد پیارے کو کچھ سمجھ ہی نہیں رہے ہو' آپ دونوں پیدا کے چکر میں اناڑی ہو' کسی دن بری طرح پھنس جاؤ گے اور پھر مجھے ہی تم دونوں کو بچانا پڑے گا۔'' استاد پیارے نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''استاد پیارے خلیل جبار ہمارا ادبی ساتھی ہے اور انتہائی شریف آدمی ہے۔ میں اس کی ضمانت دیتا ہوں یہ آپ سے کبھی غداری نہیں کرے گا۔'' طلعت صابر علی نے

کہا۔

''اور نعیم قریشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''یہ بھی شریف آدمی ہے۔'' طلعت صابر علی نے کہا۔

''آپ کے کہنے پر میں اپنی بدگمانی دور کیے لیتا ہوں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

میری اچانک کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک شخص پر نظر پڑی۔ چھوٹا قد' توند باہر کو نکلی ہوئی تھی' سر پر بال برائے نام رہ گئے تھے۔ چہرے پر گھنی داڑھی' ہاتھوں کی انگلیوں میں کئی چھوٹی موٹی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں' مجھے چہرہ جانا پہچانا سا لگا' غور سے دیکھنے پر وہ شخص مسکرا دیا اور اشارے سے مجھے پاس بلا لیا۔

''خلیل جبار کیا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟'' وہ بولا۔

''ارے یہ تم ہاشم واحد ہو۔'' میں نے اس کی آواز سے پہچان لیا۔

''یہ تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے۔ اپنے پرانے دوست طلعت صابر علی سے دور بے گانہ بنے بیٹھے ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو کبھی میرا طلعت صابر علی سے بہت گہرا یارانہ تھا۔ میرے ساتھ کئی دوست ہوا کرتے تھے اور طلعت صابر اور میرے دوستوں کو کھانا کھلائے بغیر آنے نہیں دیتا تھا' مگر اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ دوستوں کی صحبت مجھے پھر سے ادبی ماحول میں لے آئے۔ مجھے ادبی دنیا میں بہت غم ملے ہیں۔ اس لیے میں ادبی ماحول سے بہت دور ہو چکا ہوں۔ میں نے اب جو پیشہ اختیار کیا ہے اس میں پیسہ بہت ہے' میری ساری پریشانیاں دور ہو چکی ہیں' میں اب صرف پانی والے بابا کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہوں۔'' ہاشم واحد نے انکشاف کیا۔

''یہ بڑا مشکل کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی مشکل کام نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے آسان اور اچھا کام نہیں ہے۔ اس کام میں پیسہ بہت ہے۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

''پیسہ بہت ہے۔'' استاد پیارے نے کہا۔

وہ نعیم قریشی کے ساتھ میرے پاس چلے آئے تھے۔ پیسے کا سن کر استاد پیارے کے چہرے پر خاصی چمک آ گئی تھی۔

''یہ میرے دوست ہیں نعیم قریشی اور استاد پیارے۔'' میں نے ہاشم واحد سے ان کا تعارف کرایا۔ ''اور یہ میرے دوست شاعر ہاشم واحد ہیں۔ ایک زمانے میں بہت مشہور تھے۔''

''ہاں بھئی میں نے تمہارے دوست کے پروگراموں کی خبریں بہت چلائی ہیں۔ پھر یہ گمنامی میں چلے گئے تھے۔''

''تم گمنامی میں کیوں چلے گئے۔ ایسا تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' نعیم قریشی نے کہا۔

''انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے' جس کے باعث میں گمنامی میں چلا گیا۔ میں نے بہت غور کیا اور تحقیق کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ادب ہو یا صحافت جو لوگ اس سے منسلک ہوتے ہیں وہ خیالی دنیا میں گم ہوتے ہیں' لوگوں کے نصیحت کرنے پر ہم انہیں بے وقوف اور خود کو عقل کل سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ جوانی کا جو سنہری دور اور کچھ حاصل کرنے کا وقت ہوتا ہے وہ فضول میں ضائع کر دیتے ہیں۔ وقت کے گزرنے پر تجربے کار لوگوں کی باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں مگر وقت گزر کر پھر لوٹ کر نہیں آتا' اس وقت احساس ہوتا ہے کہ دنیا کی سچائی یہ ہے کہ پیسہ کچھ نہ ہو کر بھی پیسہ سب کچھ ہے۔ پیسے سے انسان کا ہر جائز خواب پورا ہو جاتا ہے۔ ادب کے دوشعبے میں صرف ان کی زندگی اچھی گزرتی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھا روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔''

''تم نے عامل والا پیشہ ہی کیوں اختیار کیا؟'' نعیم قریشی نے پوچھا۔

''انسان جب پریشان ہوتا ہے وہ عاملوں کے پاس ہی جاتا ہے میں بھی مختلف عاملوں کے آستانوں کے پر جانے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عامل کتابوں سے نقش اتار کر آنے والوں کو دیتے ہیں' کسی پر دم کر دیا' کسی کو کسی چیز پر دم کر کے قبرستان یا کسی ویرانے میں دفن کرنے کو کہتے ہیں' کسی ایک شخص کو فائدہ ہو جائے وہ دس لوگوں کو لے آتا ہے' خواتین کی تعداد آستانوں پر زیادہ ہوتی تھی۔ نذرانے کی شکل میں عاملوں کے پاس پیسہ بہت آتا تھا۔ ان

عاملوں کے پاس ایسے لوگ بھی آتے تھے جو کام نہ ہونے کا رونا روتے تھے ایسے لوگوں کے لیے عاملوں کا ایک ہی جواب تھا کہ ''ابھی حکم نہیں ہوا ہے اس لیے تاخیر ہو رہی ہے۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ بڑا اچھا کام ہے۔ پیسہ بھی اس کام میں بہت ہے' اس لیے میں ایک عامل کا مرید بن کر ان کی خدمت میں لگ گیا۔ چھ ماہ کا عرصہ یہ کام سیکھنے کے لیے میرے لیے بہت تھا' میں نے یہ کام سیکھ کر اندرون سندھ کے پسماندہ علاقے میں آستانہ کھول لیا' جب کام چل نکلا' میں شہر میں آ گیا۔ میرے بے شمار مرید ہیں' جن کے دم سے میرا آستانہ چل رہا ہے۔''

''آج یہاں کیسے آنا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''آج میں اپنے مرید ندیم کی خاطر کورٹ آیا ہوں' میرے مرید پر چوری کا مقدمہ کا فیصلہ عدالت میں سنایا جائے گا' میں کینٹین میں بیٹھ کر اس کے حق میں دعا مانگ رہا ہوں۔ انشاء اللہ فیصلہ اس کے حق میں ہی آئے گا۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

''یہ بات تم کیسے کہہ رہے ہو۔'' استاد پیارے نے پوچھا۔

''میرے مرید ندیم پر پولیس نے چوری کا مقدمہ بنایا ہے' مگر کوئی گواہ نہیں ہے۔ عدالت میں پولیس میرے مرید پر الزام ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں میرا مرید عدالت سے باعزت بری ہو جائے گا۔''

''ہاشم بھائی تم نے یہ اچھا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اس بہانے تمہاری اور تمہارے بچوں کی زندگی اچھی گزر جائے گی۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''اللہ کا کرم ہے میں مالی طور پر بہت مستحکم ہو چکا ہوں' میرے بیوی بچے اب مجھ سے بہت خوش ہیں۔'' ہاشم واحد نے کہا۔

ابھی ہماری بات چیت جاری ہی تھی کہ چند لوگ کینٹین میں داخل ہوئے' وہ بہت خوش تھے۔ ایک آدمی نے جھکتے ہوئے ہاشم واحد کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

''پیر صاحب آپ کی دعا میں اثر ہے۔ آپ نے بجا فرمایا تھا کہ میں بری ہو جاؤں گا اور واقعی میں بری ہو گیا ہوں۔''

''ندیم تم مجھے دعا کے لیے نہ بھی کہو میں پھر بھی تم سمیت اپنے مریدوں کو دعاؤں میں ضرور یاد رکھتا ہوں۔'' ہاشم واحد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پیر صاحب یہ حقیر سا نذرانہ ہے اسے قبول کر لیں' مجھے بڑی خوشی ہو گی۔'' ندیم نے پانچ پانچ ہزار کے پانچ نوٹ ہاشم واحد کی طرف بڑھائے۔

''ارے بھئی اس کی کیا ضرورت تھی' میں تمہاری محبت میں چلا آیا تھا۔'' ہاشم واحد نے کہا اور نوٹ جیب میں رکھ لیے۔

اس کے رقم جیب میں رکھنے پر ندیم خوش ہو گیا تھا۔

''پیر صاحب کار کینٹین کی پچھلی طرف سڑک پر کھڑی ہے۔'' ندیم نے کہا۔

''ظاہر سی بات ہے کار کورٹ کے احاطے میں نہیں آ سکتی' اس لیے اسے باہر کی طرف ہی کھڑا کرنا پڑے گا۔'' ہاشم واحد نے اٹھتے ہوئے ہم سے ہاتھ ملایا اور کینٹین سے باہر نکل گیا۔

''دیکھ لو ہاشم واحد ہم سے اچھا ہے ہم یہاں کورٹ میں ایک کورٹ سے دوسری کورٹ کے چکر لگاتے رہتے ہیں گرمی اور دھوپ کی بھی خبر کے چکر میں پروا نہیں کرتے ہیں اس کے صلے میں کیا ملتا ہے۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''ہاشم واحد شروع سے چرب زبان رہا ہے۔ اسے بات کرنے کا بھی فن آتا ہے۔ کب کیا بات کرنی ہے' یہ سب اچھی طرح جانتا ہے' دنیا میں وہی آدمی کامیاب ہے جو موقع محل دیکھ کر بات کرے۔'' میں نے کہا۔

''ہاشم واحد نے ساری زندگی بولنے کا ہی کھایا ہے ورنہ شاعری سے اسے شہر میں پہچان ہی ملی ہے اور کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''آج خبریں کیا ہیں؟'' استاد پیارے نے کہا۔

''خبریں عدالتوں میں جانے پر ہی ملیں گی۔'' میں نے کہا۔

''اچھا بھئی خبریں لینی ہیں تو عدالتوں میں جانا ہی پڑے گا۔'' استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فٹ پاتھ کا خواب	ابن عبداللہ
خوشبوؤں کا سفر	نسیم سکینہ صدف
ردعمل	شہباز اکبر الفت
کفن	مونا نقوی
نمکین آلو	شمائلہ زاہد
حوا کی بیٹی	ریحانہ سعیدہ

فٹ پاتھ کا خواب

ابن عبداللہ

وہ پتا نہیں کب کیسے اور کیوں اس کے خواب میں چلا گیا وہ نہیں جانتا تھا پر اب اس سے فرق نہیں پڑتا تھا وہ شہر کی مرکزی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے خواب میں تھا۔

پہلے تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ کسی بے جان چیز کے خواب میں ہے جو سیمنٹ ریت اور سریے کی آمیزش سے تیار کیا گیا جب وہ بن رہا تھا کبھی بار گاڑی میں سے اسے بنتا دیکھا تھا اور اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ بچھائے جانے والے فٹ پاتھ کے خواب میں آئے۔

سڑک کے کنارے لگے لیمپ پوسٹ سے مری مری سی روشنی اس فٹ پاتھ تک آتی تھی بلکہ آتی ہی نہیں بس کچھ دور کھڑے دس منزلہ پلازے کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں کا عکس تھا جو فٹ پاتھ کی سرد اور بے جان جلد پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگتا تھا ورنہ اس پر ہمیشہ تاریکی چھائی رہتی تھی اور دن کی روشنی میں بھی اس پر تاریکی کا احساس غالب رہتا تھا۔

وہ اب ایک اندھیرے خواب میں تھا جس کسی گہری کھائی میں اوندھے منہ گرا جا رہا ہو۔

''یہ میں کہاں ہوں؟'' وہ چلایا تو اس کی آواز جیسے خلا میں تھرا کر رہ گئی۔

''تم میرے خواب میں ہو۔'' ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی اور اس نے آواز کا مخرج ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ آواز اس کے اندر سے نکلی ہو۔

''اور تم کون ہو؟'' اس نے تاریکی میں کسی کو مخاطب کیا۔

میں شہر کا فٹ پاتھ ہوں۔۔کوئی جیسے سسکا تھا۔

اس نے تاریکی کی چادر میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور پھر بولا۔

''کیا فٹ پاتھ بھی خواب دیکھتے ہیں۔۔۔؟؟''

اس کی آواز سناٹے میں تیرتی ہوئی تاریکی میں کہیں کھو گئی تو جواب میں وہی آواز گونجی۔

''اس شہر کے سارے فٹ پاتھ خواب دیکھتے ہیں خواب سوچتے ہیں اور خواب پیدا کرتے ہیں کیوں کہ وہ صدیوں سے یونہی سوئے ہوئے ہیں۔''

پر وہ بے جان چیزوں کا خوابوں سے کیا تعلق۔اب اس کے حواس بحال ہو چکے تھے تبھی عقل کی بات کر رہا تھا۔

''تم انسانوں سے یہ فٹ پاتھ زیادہ بہتر ہیں ان کو بے جان مت سمجھو آؤ تمہیں دکھاتا ہوں کہ ہم خواب کیسے دیکھتے ہیں۔

وہی آواز دوبارہ سنائی دی اور ساتھ ہی اس کی نگاہوں سے تاریکی چھٹ گئی اب وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ایک مریل بوڑھا جس کی پسلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں فٹ پاتھ پر لیٹا ہوا تھا گتے کے بہت سارے ڈبوں کو نیچے بچھائے اور بوسیدہ کمبل اوڑھے جو دسمبر کی اس خوفناک سردی کو روکنے کے بجائے اسے اپنے اندر کھینچ رہا تھا۔اس منظر کو دیکھ اس کے وجود میں جیسے سردی سرایت کرنے لگی۔

دیکھو۔۔دسمبر کو رومانیت لکھنے والے محبوب کے آتشی بوسوں کا تذکرہ کرنے والے۔۔یہ ہے اصل دسمبر یہ ہے اس کے اندر کی رومانیت جو رگوں میں برف جما دیتی ہے آؤ تمہیں بوڑھے کے خواب میں لے کر چلتا ہوں کوئی اس کے اندر بولا اور یکلخت ہی منظر بدلا۔

آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور وہی بوڑھا اعلیٰ گرم لباس میں ملبوس آگ سینک رہا تھا ساتھ ٹیبل پر انواع قسم کے کھانے پڑے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں تپتا ہوا قہوے کا پیالہ تھا جس سے وہ گھونٹ گھونٹ قہوہ پی رہا تھا چہرے پر اطمینان پھیلا ہوا تھا بوڑھا بہت مسرور دکھائی دیتا تھا۔

تم نے جانا کہ بوڑھا کیا خواب دیکھ رہا ہے؟ کوئی جیسے آگ سے چنگتی ہوئی لکڑیوں کی آواز میں بولا۔
اس کے خوابوں میں جلتی ہوئی آگ ہے جس کی تپش اسے سردی سے جم کر مرنے نہیں دیتی اور یہ لذیذ کھانے جو
دیکھ رہے ہو وہ اسے کبھی بھوک سے مرنے نہیں دیتے۔ اس شہر کے فٹ پاتھوں پر نجانے کتنے بوڑھے اس آگ
تپش حاصل کرتے ہیں ان کھانوں سے پیٹ بھر کھاتے ہیں۔ یہ ان کا خواب ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے پر ان کی
سوتے میں بلکل حقیقت لگتا ہے۔
آؤ آگے چلتے ہیں۔
منظر پھر بدلا۔ اب وہ کچرے کے ڈبے میں سوئے ایک آٹھ سالہ بچے کے پاس کھڑا تھا سردی سے گھٹنوں کو پیٹ
میں دبائے ہوئے وہ ہولے ہولے کانپتا ہوا اس کا وجود بزبان حال بیچارگی اور غربت کا نوحہ کہہ رہا تھا۔
کیا تم دیکھ رہے ہو۔۔؟؟
وہ واقعی دیکھ رہا تھا۔ سن سا۔
آؤ تمہیں خواب میں لے چلتا ہوں۔
کوئی جیسے سردی میں ٹھٹھرتے اس بچے کے وجود سے بولا تھا۔
اب کے منظر صبح صادق کا تھا چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور سورج مشرق سے نمودار ہونے کو تھا۔
وہ بچہ گرم لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ نرم ہموار سانسیں اس کے اندر موجود سکون کا پتا دے رہی تھیں۔
گھر میں ہلکی سی چہل پہل جاری تھی تب ہی اچانک کمرے میں ایک درمیانی عمر کی عورت نے قدم رکھا اور بچے کو
شفقت امیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔
بیٹے اٹھو اسکول کے لئے تیار ہو جاؤ۔ وہ اب اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس جگا رہی تھی۔
ماما۔۔ مجھے سونا ہے۔ بچے نے دوسری طرف کروٹ بدلتے ہوئے نیند بھری آواز میں کہا۔ تو وہ عورت بولی۔
اسکول سے واپس آ کر سو جانا میرے کھل ابھی سوئے گا تو نصیب بھی سو جائے گا۔ تمہیں سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرنا
ہے بلندی کی طرف ایسے نہیں سوتے بیٹا۔ چلو شاباش اٹھو۔
اسے بستر سے نرمی سے کھینچ کر نکالتے ہوئے اس عورت کے چہرے پر ممتا کا نور تھا۔
کچھ دیر بعد وہی عورت اسے تیار کر رہی تھی۔ نئی اجلی ہوئی وردی پہنا کر بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے وہ اس سے
مسلسل محبت بھری باتیں کر رہی تھی۔
''اسکول میں لڑنا نہیں ہے۔'' ناشتے کی میز پر ایک سنجیدہ صورت مرد اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''ارے میرا بچہ کہاں لڑتا ہے۔ اس عورت نے اسے سینے لگایا تو وہ مرد ہنسا۔
تم اسے بگاڑ رہی ہو۔
ناشتے میں عورت اس کے آگے اس کی من پسند چیزیں سجا رہی تھی اور ساتھ نوالہ نوالہ اس کے منہ میں ڈال رہی تھی۔
کچھ دیر بعد وہ دروازے میں کھڑی اس کے بیگ میں لنچ رکھتے ہوئے اسے تاکید کر رہی تھی کہ وہ دوپہر لازمی اس
میں سے کھالے۔
بچہ خوش و خرم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول کی طرف جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد گلی خالی ہو چکی تھی۔
کس قدر خوبصورت خواب ہے رشتوں کی مٹھاس لئے۔
وہ بچے کے خواب سے فٹ پاتھ کے خواب میں لوٹا تو وہی آواز سنائی دی۔
اس نے تاسف سے بچے کو دیکھا۔
چلو آگے چلتے ہیں۔ تمہیں آج کا آخری خواب دکھاتا ہوں۔
وہ آگے چلنے لگا۔

سبزی کی مشہور دکانوں کے پاس جا کر اس کے قدم خود بخود رکے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک ریڑھی خاموشی سے کھڑی تاریکی لمحوں میں کہیں کھوئی ہوئی تھی۔

یہ جو تنہائی کی گہری چادر اوڑھے خالی ریڑھی کھڑی ہے یہ ایک غریب محنت کش بوڑھے کی ہے جو اس پر سبزی بیچتا ہے۔

چند دن سے وہ بیمار ہے اور ریڑھی دھکیلنے کی ہمت نہیں رکھتا ہے اس لئے اس کی ساری سبزیاں گل سڑ گئی ہیں۔

ہماری آنکھیں اتنی اندھی ہو چکی ہیں کہ وہ دیکھ نہیں پاتی ہیں کہ اس جیسے سیکڑوں لوگ ریڑھی کو نہیں بلکہ اپنی صدیوں سے ایک ہی جگہ رکی ہوئی زندگی کو دھکیل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم آگے بڑھ کر بھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوتے ہیں۔ ہمارا ہلکا سا دھکا ان کی زندگی کو کافی آگے دھکیل کر کچھ دنوں کا سکون عطا کر سکتا ہے۔ لیکن ہم ان سے کچھ نہیں خریدتے ہیں۔

یہ آخری خواب اس ریڑھی کا ہے۔

ریڑھی کا۔۔؟؟ وہ جو مدھم ان دیکھی آواز کو سن رہا تھا اس آخری خواب کے متعلق جان کر چونکا۔

ہاں ریڑھی کا۔ جب انسان کے اندر احساس خاموش موت مرتا ہے تو پھر بے جان چیزیں خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔

آج کے اس تیز رفتار مشینی دور میں ہمارا احساس ختم ہو چکا ہے۔ ہم مشینوں کے بیچ مشین ہو چکے ہیں۔ جیسے کچھ مشینوں نے مزدوروں کا گلا گھونٹ دیا ہے ایسے ہم انسان نما مشینیں بھی دن میں سیکڑوں لوگوں کا گلا گھونٹ کر ان کی حسرتوں میں سیکڑوں حسرتوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن منظر بدل چکا تھا۔

یہ ایک بوسیدہ جھونپڑی تھی۔ فرش، کو فرش نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ناہموار زمین تھی۔

اکثر غریبوں کی زندگی اس فرش کی طرح جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ناہمواری۔ جا بجا مردہ خوابوں کی قبریں کھدی ہوئی ہوتی ہیں۔

غیر مرئی وجود نے گویا اس کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

بوڑھا کھانس رہا تھا۔ سانس کو کھینچتے ہوئے وہ سانس لینے کی اذیت کو محسوس کر رہا تھا۔

ایک بوڑھی اس کے سامنے بیٹھی تھی اور ایک جوان لڑکی جس کی آنکھوں اور جھونپڑی کی دیواروں میں نا بدلنے والے وقت کا شکوہ تھا۔

''دوائی ختم ہو گئی ہے اماں۔''

خالی دوائی کی بوتلوں کو دیکھتے ہوئے وہ لڑکی بولی تو اس کی آواز میں پریشانی کا مہیب سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

''اللہ رحم کرے گا۔ بوڑھی نے اپنے میلے کپڑے سے بوڑھے کی پیشانی پر چمکتے غربت کے پسینے کو صاف کرتے ہوئے کہا تو لڑکی نے بے یقینی سے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر ماں اور بیٹی خاموش رہے۔ بس بوڑھا کھانستے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''اور آٹا بھی بس آج کے لئے ہے۔

بیٹی نے سر جھکاتے ہوئے دوبارہ ماں کو مخاطب کیا۔

ماں نے ایک نظر بوڑھے کو دیکھا اور پھر در و دیوار سے لپٹی غربت کو۔ پھر ایک طویل سانس اپنے اندر کھینچ کر خاموش ہو گئی۔

لڑکی تاریکی میں کسی کو کھوجتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پھر سے وہ کچھ دور بنے پکے اونچے مکانوں میں مانگنے جائے گی۔

جن میں بستے لوگوں میں بھوک کا غم کبھی نہیں پیدا ہوا تھا۔
لیکن ان کی آنکھوں میں جو بھوک تھی وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔
ایک مرتبے پہلے بھی وہ وہاں مانگنے گئی تھی اور گھروں میں بیٹھے مردوں نے اس کے وجود کو دیکھتے ہوئے نظروں
نظروں میں اسے تولا تھا۔
ان لمحوں کا سوچ کر اس نے جھرجھری سی لی۔
مجھے پھر سے ان بھوکی نظروں کا شکار ہونا پڑے گا۔
اس نے دکھ سے سوچا اور اپنے ماں باپ کو دیکھنے لگی۔
یہ اس ریڑھی کے خواب کا تاریک پہلو تھا۔ اس خواب کا روشن حصہ یہ ہے۔
لڑکی کی آنکھوں میں پیدا ہونے والے خوف سے آواز آئی اور ساتھ ہی منظر نے میں تبدیلی ہوئی۔
ریڑھی پر روزمرہ کے استعمال میں آنے والی تازہ سبزی تھی۔ لوگ خرید رہے تھے بوڑھا بیچ رہا تھا۔
اس کے خریداروں میں بہت سے چہرے ایسے تھے جن کو وہ جانتا تھا۔
اس جیسے ہی لوگ تھے جو محض اپنی انا اور معاشرے کی آنکھ میں رہنے کے لئے شیشوں کی بڑی بڑی دکانوں سے
سبزی اور پھل خریدتے تھے۔
بوڑھے نے سبزی فروخت کی اور شاداں و فرحاں گھر کی سمت چل دیا۔
گھر وہی تھا لیکن اس میں کافی حد تک بہتری آچکی تھی۔ فرش پر اینٹیں ڈال کر کچا فرش تیار کر دیا تھا اور دیواروں پر
چونے سے سفیدی پھیلا دی گئی تھی۔
بوڑھی صحن میں بیٹھی تسبیح کے دانوں کو گرائے جا رہی تھی اور وہ لڑکی کچن میں کھانا بناتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آج
اس کا باپ کتنا خوش ہوگا جب دیکھے گا اس نے ان کی پسند کا پلاؤ پکایا ہے۔
یہ اس شہر کے فٹ پاتھوں کے روشن اور تابناک خواب ہیں۔
لیکن ابھی تک تاریکی ان پر غالب ہے۔ شاید کسی روز خواب حقیقت بن جائیں۔ اب جاگ جاؤ تم بھی تم نے بس
اتنا ہی دیکھنا تھا۔
کسی نے اس کے شانے کو ہلایا تو وہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
وہ اپنے کمرے میں تھا۔
کیا یہ خواب تھا۔ اس نے کنپٹی پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک لمحے کو سوچا۔
اگر خواب تھا میں اسے حقیقت کروں گا۔ وہ دوبارہ لیٹ کر خواب سوچنے لگا تھا۔
اگلی صبح اس نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ایک چھوٹی سی فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کا مقصد غریب لوگوں
سے ہمدردی اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ان کی مدد کرنا تھا۔ وہ اور اس کے دوست لوگوں کو باور کراتے
تھے کہ وہ چھوٹی موٹی چیزیں ایسے لوگوں سے خریدیں جن کی زندگی کا پہیہ روز کی آمدنی پر چلتا تھا اور ساتھ ہی وہ علاقے
میں پھیلے اسکولز میں جاتے تھے اور انتظامیہ کو غریب بچوں کی مفت تعلیم پر قائل کرتے تھے اور پھر اچھتے بچوں کو اسکول میں
لاتے تھے۔ ان کی کاپیاں کتابیں خریدتے تھے۔
ان کی تنظیم کا نام 'فٹ پاتھ کے خواب' تھا۔
اور وہ خوابوں کو حقیقت میں بدل رہے تھے۔
یہ شروعات تھیں ایک ایسے معاشرے کی جہاں محبت اور انسانیت پنپ سکتی تھی۔
اور بہت کم لوگ جانتے تھے۔
انسانیت میں کتنا سکون تھا۔

.....☆☆.....

خوشبوئوں کا سفر

نسیم سکینہ صدف

عائشہ گھر سے نکل تو پڑی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کہاں جائے؟ کوئی ایسا رشتے دار بھی نہ تھا جس کے گھر چلی جاتی..... وہ دوڑتی ہوئی سیالکوٹ ریلوے اسٹیشن پر آ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی۔ ٹرین میں بیٹھ کر کہیں چلی جاتی ہوں' سوتیلی ماں کے ظلم کیا کم تھے کہ میری شادی ایک آوارہ' بدمعاش اور بوڑھے سے کی جا رہی ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ جیسے تیسے باپ نے عائشہ کو ہائی اسکول تو کرا دیا لیکن مزید آگے پڑھانے کی ان کی پوزیشن میں گنجائش نہیں تھی وہ آگے نہ پڑھا سکے..... اور رات دن اسی کوشش میں رہتے کوئی بھلا سا رشتہ آجائے اور وہ بچی کے ہاتھ پیلے کردیں لیکن غریب کی بچی کو کون پوچھتا ہے' اگر بھولے بھٹکے رشتہ آ بھی جاتا تو گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ لگالیتا کہ یہاں سے جہیز میں کچھ ملنے والا نہیں ہے تو پھر پلٹ کر نہ آتا اور آج کل جہیز دینے والوں اور لینے والوں نے بھی انتہا کردی ہے' غریب' بیچارے اپنی بیٹیوں کو لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ عائشہ کے باپ حمید نے دیکھا کہ کوئی رشتہ نہیں آتا ہے تو سوچا بچی کو کہیں ملازمت کروا دیتے ہیں۔ بچی نوکری کرے گی تو کچھ بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا اور کوئی رشتہ بھی مل جائے گا' کیونکہ آج کل سروس والی لڑکیوں کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ملازمت کے لیے بھی وہی شرط' رشوت دینے کے لیے رقم یا پھر لڑکی کو خود..... جب نوکری بھی نہ ملی تو ایک دن حمید کی بیوی نے کہا۔

اگر تم میری بات مانو..... تو ایک رشتہ میں بتاتی ہوں' ہمارے محلہ میں ایک صاحب ہیں بھائی فضل ان کی شادی نہیں ہوئی ہے' محلے والوں نے خواہ مخواہ ان کو بدنام کیا ہوا ہے۔ بہت شریف اور اچھے انسان ہیں' میں جب جاتی ہوں آپا آپا کہہ کر ان کا منہ نہیں سوکھتا' اپنا ذاتی مکان ہے' اور چھوٹا موٹا دھندہ بھی کرلیتے ہیں۔ لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ بس تھوڑی عمر زیادہ ہے' اگر تم کہو میں بات کروں؟'' حمید نے مجبور ہو کر کہا.....

جیسا تم چاہو..... تم بھی آخر اس کی ماں ہو۔ تم کوئی اس کا برا تھوڑی چاہو گی۔

ٹھیک ہے میں آج فضل بھیا سے جا کر کہتی ہوں' تمہارا رشتہ پکا ہوگیا ہے تم شادی کی تیاری کرو۔

عائشہ باورچی خانے میں بیٹھی ساری باتیں سن رہی تھی اور وہ فضلو کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

اسکول آتے جاتے دودھ والے کی دکان پر کھڑے ہوکے لڑکیوں کو چھیڑتا تھا اور لڑکیوں کی گالیاں کھاتا رہتا۔ وہ یہ سن کر کانپ گئی' فضلو سے شادی ہو کر جینے سے تو موت کہیں اچھی ہے اور اس نے فیصلہ کیا مجھے گھر سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں' بنا سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑی' وہ اتنی بڑی دنیا میں خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی پھر اس نے سوچا کیوں نہ میں اپنی سہیلی نادیہ کے گھر چلی جاؤں' وہی اب اس کی سچی دوست ہے اور وہ نادیہ کے گھر چلی گئی۔ عائشہ کو دیکھ کر نادیہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے گلے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

تم اکیلی آئی ہو' چچا نہیں آئے۔ اس نے روتے ہوئے اپنی پوری کہانی نادیہ کو سنا دی۔ نادیہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

چل تو یہاں آ گئی ہے' فکر نہ کر سب ٹھیک ہوجائے گا۔

نہیں نادیہ ابو کو ہرگز مت بتانا ورنہ وہ مجھے آ کر لے جائیں گے اور پھر مجھے اسی جہنم میں جانا پڑے گا' میری شادی سوتیلی ماں اسی بدمعاش سے کردیں گی۔ نادیہ خاموش ہوگئی لیکن اس کے دل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا کہاں تک مناسب ہے۔ اس کے ذہن میں بھی ایک وہم ابھر رہا تھا کہیں میرا شوہر کاشف خود ہی

عائشہ کو نہ پسند کرنے لگے۔ کیونکہ عائشہ ہر لحاظ سے نادیہ سے بہتر اور خوبصورت ہے۔ نادیہ نے ایک ہفتہ پتہ نہیں کس طرح اس کو رکھا اور اپنے شوہر سے بالکل بات نہ کرنے دی' بلکہ ایک طرح سے پردے میں رکھا' اور پھر اپنی سسرال جانے کا بہانہ کر کے اس نے کہا۔ عائشہ تم دو چار دن کے لیے کسی اور سہیلی یا رشتہ دار کے ہاں چلی جاؤ' کیونکہ میری ساس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے ہم دونوں کل ان کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ پھر تم آ جانا۔

یہ کہہ کر خود جانے کی تیاری کرنے لگی' عائشہ نے دل میں سوچا میرے لیے اس دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں' میری قسمت میں شاید موت ہی ہے' مجھے مر جانا چاہیے' اور پھر یہ سوچ کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگی۔ اسٹیشن پر جا کر وہ ایک ٹرین میں بیٹھ گئی۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ جب ٹرین چل پڑی تو وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی' اور آنکھیں بند کر کے ٹرین تیز ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

جیسے ہی ٹرین تیز ہو گی وہ چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے گی۔ ٹرین جب فراٹے بھرنے لگی اور ٹرین کا بلاوا اور اس کی اپنی بجھتی زندگی اور قوت ارادی پر حاوی ہو گیا' اس نے اسی وقت ریل کی پٹریوں کے آہنی جال کی طرف دیکھا اور چھلانگ لگا دی مگر اگلے لمحے نہ ریل کی پٹریوں نے اسے اپنی آغوش میں لیا نہ موت نے بلکہ دو مضبوط اور فولادی ہاتھوں نے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا۔ ہاتھ ثاقب کے ہی تھے۔ اس نے اسے مرنے سے بچایا تھا جو اس کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا پتہ نہیں یہ لڑکی کوئی نشہ تو نہیں کر کے آئی ہے۔ عائشہ نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

آپ نے مجھے کیوں بچا لیا میں مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے مر جانے دو۔

ثاقب نے اس سے کہا

زندگی موت سے کتنی خوبصورت ہے' جی کر دیکھو۔ یہ کہہ کر اس نے عائشہ کو سیٹ پر ایک طرف بٹھا لیا اور ٹرین رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین کے رکتے ہی اسے اپنے ساتھ ہاتھ پکڑ کر اتار لیا' اور کہا۔ تمہارا گھر کہاں ہے پہنچا دوں ورنہ تم پھر اپنی جان گنوانے کھڑی ہو جاؤ گی۔

عائشہ نے کہا

میرا کوئی گھر نہیں ہے' ماں باپ بہن بھائی اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے' میں اکیلی ہوں' بالکل اکیلی۔

اگر یہ سچ ہے تو تم میرے گھر چلو' میرے ساتھ رہنا' میں ایک شریف آدمی ہوں' یونیورسٹی اسٹور میں سیلز مین ہوں' ایک کرائے کے مکان میں تنہا ہوں' کھانا خود پکاتا ہوں' کنوارہ ہوں' تم میرا کھانا پکا دیا کرنا' اور میرے گھر میں بغیر کسی ڈر کے رہنا' میں امی کو لے آؤں گا' اگر تم کھانا اچھا پکاؤ گی تو میں تمہیں اپنے گھر میں رکھ لوں گا' امی کو لڑکی ڈھونڈنے کی پریشانی بھی نہ ہو گی۔ عائشہ نے پہلی بار ثاقب کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک مہذب شریف انسان کھڑا تھا۔ اسی دن دونوں نے مسجد میں جا کر نکاح کر لیا۔ گھر کی چابی عائشہ کو دے دی' عائشہ کو ماں' بہن' بھائی بھی مل گئے۔ ایک خوشگوار زندگی اس کی منتظر تھی' وہ خوشبوؤں کے سفر پر روانہ ہو گئی' جہاں چاروں اور پھول ہی پھول تھے۔

.....☆☆.....

رد عمل
شہباز اکبر الفت

''رک جاؤ صبوحی، رک جاؤ، میری بات تو سنو'' احمد حسن نے چلا کر کہا مگر وہ چلتی رہی، نہ اس کے قدم رکے نہ ڈگمگائے،

''خدا کے لئے رک جاؤ، پلیز ایسا مت کرو'' وہ تقریباً روہانسا ہو گیا، اس بار اسے اپنی آواز بہت کھوکھلی اور کہیں دور

سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی "میری بات تو سنو، پلیز..... فار گاڈ سیک، آخری بار" اس بار وہ رک گئی، احمد حسن تقریباً بھاگتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا

احمد حسن اور صبوحی کی کہانی میں کچھ نیا نہ تھا، دونوں فرسٹ کزن، ہم عمر، ہم جماعت.. اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی تک ساتھ ساتھ پہنچے، بچپن میں تو دوستی بھی خوب رہی، اکٹھے اسکول جانا، کھیلنا کودنا، کھانا پینا سب ایک ساتھ، صبوحی پڑھائی میں تیز تو احمد حسن بھی بلا کا ذہین، فرسٹ پوزیشن کے لئے دونوں میں مقابلہ ہوتا اور اس مقابلے میں اکثر صبوحی جیت جاتی۔

احمد حسن اتنا ذہین ہونے کے باوجود بچپن سے ہی تھوڑا ضدی اور گرم مزاج واقع ہوا تھا، بات بات پر ہتھے سے اکھڑ جانا، مار پیٹ اور بس نہ چلنے پر چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لینا اس کی عادت بن چکی تھی جو کالج میں آ کر اور بھی پختہ ہو گئی، صبوحی نے اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اس کی جھاڑ سن کر چپ ہو جاتی اور پھر چپکے سے خود کو کمرے میں بند کر کے پہروں روتی رہی، احمد حسن کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا کہ صبوحی کس اذیت میں ہے مگر کسی کی پروا کرنا اس نے سیکھا ہی کب تھا، پھر احمد حسن کے بڑے بھائی شاویز حسن کی شادی پر صبوحی نے بھی کبھار کی اذیت کو ترک کر ایک مستقل روگ اپنے دل کو لگا لیا

شاویز کی شادی پر احمد حسن کی خوشی دیدنی تھی، ہر ایک سے ہنسی مذاق، ہر بات کی فکر، ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا، گھر میں پہلی شادی تھی اور اس کے بعد اسی کا نمبر، نمرہ اس کی بہن تو ابھی بہت چھوٹی تھی اسی سال میٹرک کیا اور شاویز کی شادی کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لینا تھا، مایوں، مہندی، بارات اور ولیمہ کے فنکشنز میں دلہا کے بعد احمد حسن ہی سب سے نمایاں نظر آیا... مہندی کی رات صبوحی کی اچانک اس پر نظر پڑی تو نہ چاہنے کے باوجود اسے دیکھتی ہی رہ گئی، وائٹ شلوار قمیص... گلے میں پیلا پٹکا اور تازہ کلین شیو، خوشی سے نہال چہرہ اس کے دل میں ہی کھب کر رہ گیا تھا، اس نے خود کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر ہر کوشش بے سود، محبت کا کیوپڈ اس کے دل پر وار کرنے سے باز نہ آیا، شاویز کی شادی ہوتے ہی صبوحی کے ابو نے صبوحی کے لئے رشتے کی تلاش کا حکم جاری کر دیا

صبوحی اس نئی افتاد سے گھبرا گئی، بولائی بولائی پھرنے لگی بات ہی گھبرانے والی تھی، ایک طرف اس کے دل میں کسی کے لئے تازہ تازہ پیار پنپ رہا تھا اور جس سے پیار ہوا تھا اسے پتہ ہی نہیں تھا، پتہ ہوتا تو اس نے کون سا پروا کرنی تھی، صبوحی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس کو بتائے کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی "میں کنوں کنوں دساں اپنا راز دیاں گلاں" اس میں اپنے گھر والوں، گھر میں اماں اور حتیٰ کہ احمد حسن سے بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی اور ویسے بھی کالج دور سے ہی دونوں کے راستے تقریباً الگ ہو چکے تھے، احمد حسن اپنی موٹر بائیک پہ یونیورسٹی جاتا جو اس کے ابو نے اسے میٹرک میں اے پلس نمبر حاصل کرنے پر بطور انعام لے کر دی تھی اور جس کا وہ اپنی کسی محبوبہ کی طرح خیال رکھتا تھا اور پھر کالج دور میں بہت سے لڑکے اس کے دوست بن چکے تھے جن کے ساتھ اس کی مصروفیات کے باعث صبوحی سے اس کے رابطے بہت کم رہ گئے تھے، حتیٰ کہ ایک ہی گھر اور ایک ہی یونیورسٹی میں ہونے کے باوجود کئی کئی دن ان کی ملاقات نہ ہو پاتی

دوسری طرف صبوحی کی شادی کا اعلان سن کر پورے گھر میں گویا ہلچل سی مچ گئی، آباؤ اجداد کا ترکہ اس بڑی سی، پرانی طرز کی شاندار حویلی میں شروع سے ہی جوائنٹ فیملی سسٹم رائج چلا آ رہا تھا، صبوحی کے ابا عبدالرحمان جن کا کل اثاثہ ان کی بیگم کے علاوہ ناز و میں پلی، ان کی ہونہار اور اکلوتی بیٹی صبوحی عبدالرحمان ہی تھے جبکہ چھوٹے بھائی حسن زمان کا گھرانہ ان کی بیگم، بیٹوں شاویز حسن، احمد حسن اور ایک بیٹی نمرہ حسن پر مشتمل تھا، روایتی جوائنٹ فیملی سسٹم کے باوجود دونوں گھرانوں میں خوب ہم آہنگی تھی، دونوں بھائیوں نے کوئی خط کھینچنے کی ضرورت محسوس کئے بغیر ہی حویلی کو اس طرح سے دو حصوں میں بانٹ لیا تھا کہ باہر سے تو کیا گھر آیا مہمان بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ اس حویلی کا بٹوارہ ہو چکا، دونوں بھائیوں نے الگ بیٹھ کر صلاح مشورہ کیا اور شادی کے اخراجات کا تعین کر کے بجٹ کو حتمی شکل

دی، چھوٹے بھائی نے منع کرنے کے باوجود آدھے اخراجات اپنے ذمہ لے کر مطلوبہ رقم کا چیک بھی بڑے بھائی کے حوالے کر دیا، صبوحی کی اماں تو جیسے اسی ازن کی منتظر تھیں، جھٹ پٹ میں رشتے کروانے والی خالہ کو بلوا کر دو ہزار روپے اس کی ہتھیلی پہ رکھے اور حسب نسب، تعلیم اور اخلاق کے کوئی ہم پلہ رشتہ ڈھونڈنے کا ٹاسک سونپ دیا اس کے ساتھ ساتھ کئی رشتہ داروں کو بھی خوشخبری سنادی کہ ہم اپنی صبو کی شادی کر رہے ہیں کوئی اچھا رشتہ نظر میں ہو تو ملوانے میں دیر نہ کرو

قسمت نے صبوحی کو ایک عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، ایک طرف اماں تھی جس کے سامنے وہ ہمیشہ بھیگی بلی بن جاتی، تمام تر لاڈ پیار کے باوجود اس کے اندر بچپن سے ہی اماں کی بارعب شخصیت کا بہت خوف تھا، اماں نے کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی آنکھ سے والے فارمولے پر اس کی تربیت کی تھی، ابا سے تو وہ اتنی بڑی بات کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لے دے کے اماں کا ہی ایک آسرا تھا اور وہ تھوڑا حوصلہ کر کے ڈھکے چھپے لفظوں میں اماں سے اپنے دل کا حال کہہ بھی دیتی مگر احمد حسن... کیا احمد حسن اسے اپنا لے گا؟ یہ سوال کسی آسیب کی طرح اسے ڈرا رہا تھا، اسے احمد حسن سے محبت تو اب ہوئی لیکن اس کی اکھڑ مزاجی، جارحانہ طبیعت اور بے پروائی کے باوجود اسے کبھی احمد حسن ناپسند بھی نہیں رہا تھا، اسے پتہ تھا کہ کتابوں سے جنون کی حد تک پیار کرنے والا احمد حسن کبھی غلط نہیں ہو سکتا، اس کی دوستی کچھ آوارہ مزاج لڑکوں سے ضرور ہو گئی تھی جس کی وجہ وہ تھوڑا بد دماغ ہو گیا تھا

لیکن اسے یقین تھا کہ تھوڑے پیار اور توجہ سے وہ اسے بدل سکتی ہے، یونیورسٹی سے واپس آ کر اس نے کھانا کھایا اور ایک کتاب ہاتھ میں لے کر لان میں ٹہلنے آ گئی، کتاب ہاتھ میں لیکن دھیان اسی کی طرف تھا، وہ کتنی ہی دیر ٹہلتی رہی، سوچتی رہی، اس کے دل و دماغ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی، وقت تھا ہی کتنا اس کے پاس، کوئی اچھا رشتہ ملنے کی دیر تھی بس، اماں کے ارادے تو "جھٹ منگنی پٹ بیاہ" والے لگ رہے تھے۔

"ہائے اللہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں، اب تو ہی مدد کر" وہ سر پکڑ کر جھولے پر بیٹھ گئی، تبھی قریب سے احمد حسن گزرا، وہ کہیں باہر جا رہا تھا

یہ کوئی جھولا جھولنے کی عمر ہے تمہاری" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو صبوحی کو جیسے ہوش آ گیا

"نن.. نن.. نہیں تو۔" وہ ہڑبڑا کر بولی اور جھولے سے اٹھ گئی

"ہونہہ"... اس نے منہ بنایا اور آگے بڑھ گیا

"تم کب بدلو گے احمد حسن" وہ بے اختیار سسک پڑی" میں چاہتی ہوں تم بدل جاؤ، میں تمہیں پھر سے وہی بچپن والا ہنس مکھ اور کھلنڈرا، سب کا خیال رکھنے سب کا احساس کرنے والا احمد حسن بنتے دیکھنا چاہتی ہوں، تم تو میرے بچپن کے دوست ہو نا، میں تو ہمیشہ تمہاری ہر بات مانتی تھی نا، آج تک تم نے جیسا چاہا، میرے ساتھ برتاؤ کیا، میں سب کچھ چپ چاپ سہتی رہی، اب بھی چپ ہوں، تم نہ بولو تو بھی چپ ہی رہوں گی، کچھ نہیں بولوں گی لیکن میری دھڑکنیں تمہیں پکار رہی ہیں، مجھے اپنا بنا کے لے جاؤ، بس ایک بار اپنا نام دے دو، پھر چاہے کسی کونے میں ڈال دینا۔

"کیا ہوا صبو؟ کیوں رو رہی ہو؟" وہ چونک پڑی، اس آواز کو تو وہ آنکھیں بند کر کے ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی، وہ کب واپس آیا، اسے پتہ ہی نہیں چلا، اور اب وہ اس کے سامنے کھڑا اس سے اس طرح بے ساختہ رونے کی وجہ پوچھ رہا تھا، خلاف توقع اس بار لہجہ بھی تھوڑا نرم تھا۔

"کچھ نہیں۔" صبوحی نے سر جھکا کر آہستگی سے کہا اور پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

"اوپر دیکھو، میری طرف، میری بات بری لگی، سوری؟" اف اتنا حیات بخش لہجہ، صبوحی کو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا، اوپر سے سوری بھی، وہ تڑپ سی گئی

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں"

"پھر کیا بات ہے؟" اس نے پھر پوچھا

"ایسے ہی بس" اسے سمجھ نہیں آرہی تھی، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو
"تمہاری تو شادی ہو رہی ہے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے اور تم یہاں بچوں کی طرح رو رہی ہو۔" وہ ہنسا تو صبوحی دل تھام کر رہ گئی، اس ہنسی کی آواز سننے کو تو اس کے کان ترس گئے تھے، پے در پے حیرتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ رہے تھے، اس نے اوپر، آسمان کی طرف دیکھا، اللہ نے شاید اس کے آنسوؤں کی لاج رکھ لی تھی۔
"میں شادی نہیں کرنا چاہتی" اس نے آہستگی سے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا
"کیوں؟" وہ حیرت سے بولا
"بس.. نہیں کرنی"
"کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو جس کا تائی اماں کو بتا نہیں سکتیں؟" اتنی بڑی بات وہ کتنی آسانی سے کہہ گیا تھا، کاش وہ خود ہی جان لے، اس نے حسرت سے سوچا مگر کچھ کہہ نہیں پائی، بس اتنا منہ سے نکلا
"نہیں"
"صبو، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں" اسے اپنی سماعت پر پھر شبہ ہوا
"جی بولیں"
"مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا کہوں، میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ غلط برتاؤ کیا، سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے جیلس تھا، میں لاکھ کوشش کرتا، دن رات دل لگا کر پڑھائی کرتا، مگر تم ہمیشہ مجھ سے نمبر لے جاتی ہو، رفتہ رفتہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوتا چلا گیا
"مجھے لگتا تھا کہ میری کوئی اہمیت نہیں، اس سوچ نے میرے اندر تلخی بھر دی، تم میری کزن بھی تھیں اور دوست بھی لیکن تم نے بھی پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا اور میں تنہا ہوتا چلا گیا بس یہ ہے میری غلط رویئے کی اصل کہانی"
"آئی ایم سوری" صبوحی نے سر ہراتے ہوئے لہجے میں کہا، اسے اپنا دکھ بھول گیا تھا۔
"نہیں، سوری کی ضرورت نہیں، غلطی میری بھی ہے، مجھے تمہاری کامیابیوں کو بھی اپنی کامیابیاں سمجھ کر انجوائے کرنا چاہیئے تھا مگر نہیں کر سکا اور تمہیں مسلسل اذیت دیتا رہا" وہ رکا تو صبوحی بولی
"کوئی بات نہیں"
اب میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں" احمد حسن نے سر جھکا کر کہا تو صبوحی کا سارا خوف جاتا رہا، اب وہ شیر ہو گئی تھی، اس نے پوچھ ہی لیا
"وہ کیوں اور کس طرح جناب؟"
"تم سے شادی کر کے، سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا مگر شاویز بھائی کی شادی پہ مہندی کی رات، جب تم مہندی کا تھال لے کر نکل رہی تھیں تو لمحہ بھر کے لئے میری تم پر نظر پڑی، اس لمحے، کینڈل لائٹ کی روشنی میں، تمہارے جگمگاتے ہوئے چہرے پر ایک سچی خوشی رقصاں دیکھی اور میں دل تھام کر رہ گیا، وہ لمحہ ہی ایسا تھا کہ تمہارے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولا اور مجھے تمہارا دیوانہ بنا گیا، اس دن سے پاگلوں کی طرح تمہیں اپنانے کے خواب دیکھ رہا ہوں" وہ اپنی بات کہہ کر چپ ہو گیا۔
صبوحی کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے، وہ شرارت سے بولی "تو مجھ سے کہا کیوں نہیں؟"
"میں تم سے ڈرتا تھا" احمد حسن نے آہستگی سے کہا
"مجھ سے ڈرتے تھے؟ وہ کیوں؟" صبوحی نے حیرت سے پوچھا
"کیونکہ میرا ہر عمل ہمیشہ تمہارے خلاف رہا لیکن اب کچھ اب تم سے کچھ کہنے سے پہلے میں تمہارے ردعمل سے ڈر رہا تھا" احمد حسن نے جواب دیا
"اور اب آپ میں اتنی ہمت کیسے آگئی جناب"

تمہیں سسکتا دیکھ کر آگے نہیں بڑھ سکا تھا، پاؤں من من بھاری ہو گئے تھے، میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم سمجھ رہا تھا، صرف تمہارے آنسو پونچھنے کیلئے پلٹا اور تمہارے نرم لہجے سے حوصلہ پا کر اپنے دل کی بات کہہ دی اور اب مجھے تمہارے ردعمل کا انتظار ہے"

"میرا ردعمل تمہاری سوچ کے عین مطابق ہے،" "نہیں" صبوحی نے ٹھنڈی آہ بھر اپنا فیصلہ سنایا اور اندر جانے کیلئے مڑ گئی

"رک جاؤ صبوحی، رک جاؤ، میری بات تو سنو" احمد حسن نے چلا کر کہا مگر وہ چلتی رہی، نہ اس کے قدم رکے، نہ ڈگمگائے۔

"خدا کے لئے رک جاؤ پلیز، ایسا مت کرو" وہ تقریباً روہانسا ہو گیا، اسے اپنی آواز کھوکھلی اور کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"میری بات تو سنو پلیز... فار گاڈ سیک، آخری بار" اس بار صبوحی رک گئی، احمد حسن تقریباً بھاگتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا

"تم مجھے ہاں کیوں نہیں بول سکتیں، میں نے خود تمہاری آنکھوں میں اپنی محبت کے دیئے جلتے دیکھے، مہندی کی رات بھی اور آج بھی جب تم رو رہی تھیں" اس کے لہجے میں ایک پختہ یقین تھا

"ہاں، میں تم سے پیار کرتی ہوں اور مجھے بھی تم سے پیار اسی لمحے ہوا جب تم مجھے دیکھ کر راستہ دینے کے لئے تھوڑا پیچھے کو ہٹے تھے، ہاں میں بھی تمہیں اپنانا چاہتی ہوں لیکن تمہیں ہاں نہیں کہنا چاہتی" صبوحی نے صاف صاف کہہ دیا تھا

"مگر کیوں؟" احمد حسن نے مریل سی آواز میں کہا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی ڈھے جائے گا۔

"کیونکہ تم مجھ پر اپنا وقت ضائع کر رہے ہو" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "میرے بدھو اگر شادی کرنی ہے تو تم یہ بات جا کر چچا جی سے کہو تا کہ وہ میرے ابا اور اماں سے آ کر تمہارے لئے میرا رشتہ مانگ لیں، اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ نا، شادی کرنی ہے کہ نہیں؟ صبوحی نے قہقہہ لگا کر کہا تو احمد حسن خوشی سے جھوم اٹھا، آج اس کی سمجھ میں آیا کہ اچھے عمل کا ردعمل بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔

.....☆☆.....

کفن
مونا نقوی

ٹریفک کا بے ہنگم شور اور اُس پہ پھیری لگانے والوں کی آوازیں اور بھی خیالات کو منتشر کر رہی تھیں۔ کبھی سبزی بیچنے والوں کی آواز تو کبھی پھل فروشوں کی آوازیں اور آوازیں بھی مختلف اور لہجے بھی عجب کرخت سے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس ٹھونس کے اِن آوازوں اور رکشے، بسوں کے عجیب و غریب ہارنز سے اپنی سماعتوں کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس جو پچھلے دو گھنٹے سے اپنے اگلے کالم کے لیے کسی بہتر ٹاپک کے لیے غور و فکر میں مصروف تھی یہ آوازیں بار بار میرے خیالات میں مخل ہو رہی تھیں۔ میں کسی اچھوتے موضوع پہ لکھنا چاہ رہی تھی۔ مگر اس شور و شرابے میں کچھ بھی سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اِس سے پہلے بھی اِسی قسم کے ماحول میں ہی میں نے بہت اچھے اچھے کالمز لکھے تھے مگر آج مجھے اِس سب سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ بلا خر اِن آوازوں کے سبب سر درد سے پھٹنے لگ گیا تھا اور ذہن لکھنے کی طرف سے ہٹ

گیا تھا۔ الفاظ اور خیالات کو بھی بریک سی لگ گئی تھی۔ میں نے پینسل نوٹ پیڈ پہ رکھی اور اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی بند ہونے کے باوجود اِن سب بھدی آوازوں کو میری سماعتوں تک پہنچا رہی تھی اُس کا اک پٹ کھول کے کھڑی ہو گئی۔ میں اپنی سماعتوں کو اس سارے شور کا عادی بنانا چاہ رہی تھی۔ نیچے گلی میں ہر زبان اور ہر رنگ و نسل کا بندہ اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ ہمارا گھر بازار کے عین سامنے تھا۔ اِس لیے صرف سڑک کراس کر کے ہر ضرورت کی چیز مل جاتی تھی سڑک کے اُس پار بازار تھا تو سڑک کے اِس پار پھیری والوں ٹھیلے لگانے والوں کا راج۔ اور گداگروں کا بھی سارا دن بہتات رہتی تھی۔ ہر عمر کے گداگر مرد و زن اور بچے لوگوں کے دامن پکڑ پکڑ کے اُن کی جیب سے پانچ، دس نکلوا کے ہی اُنہیں آگے بڑھنے دیتے تھے۔ مجھے کبھی بھی گداگروں کی یہ نیچر سمجھ نہیں آئی لاکھ لوگ جھڑکیں لاکھ برا بھلا کہیں وہ ساتھ ساتھ چپکے ہی رہتے ہیں اگر کوئی ترس کھا کے تھوڑی سی مدد کر دے تو پھر آگے سے آگے اُن کے سوال بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی پرانے کپڑے دے دے تو جوتے مانگنے لگ جاتے ہیں کوئی دونوں چیزیں دے دے تو چھوٹے بہن بھائیوں یا بچوں کے لیے کپڑے جوتے کا سوال ڈال دیتے ہیں انسان کی نیکی ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ ہاتھ ہلا کے کھانے کے بجائے اُنہیں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر کھانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے اور سڑک کنارے ٹھیلے لگانے والے بھی دن بھر کی محنت کے بعد گھروں کو لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بچی کچی چیزیں اونے پونے جلد سے جلد بیچ کر گھروں کو لوٹ جانا چاہتے تھے۔ دن بھر کا شور شرابا اب کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ میں نے آج کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر کے کھڑکی بند کرنے ہی لگی تھی کہ میری نظر تین چھوٹے چھوٹے بچوں پہ پڑی۔ ڈرے سہمے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ میں کھڑکی کے قریب جا کے نیچے جھانک کے دیکھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ لوگ گھر سے نکلے اور شاید گھر کا رستہ بھول چکے تھے۔ میں سارا معاملہ سمجھنا چاہ رہی تھی اگر وہ گم ہو چکے ہیں تو یہی ارادہ کیا کہ نیچے کہ اُنہیں گھر لے آؤں گی اور خود جا کے اُنہیں اِن کے گھر پہنچا آؤں گی۔ وہ کافی ڈرے ہوئے تھے۔ خوف اُن کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ وہ اک دوسرے کا سہارا لیے اور اک دوجے کے پیچھے چھپتے چھپاتے بڑھتے رہے اُن سب سے جو بڑا بچہ تھا وہ دس، گیارہ سال کا تھا باقی اک لڑکا اور لڑکی اُس سے چھوٹے تھے۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھے اور نیچے کھڑے اک ٹھیلے والے کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ انکل تھوڑی امداد کر دو ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ ہمارے ابو آج فوت ہو گئے ہیں۔ ہمارے ابو کا کفن بنانے کے لیے حسب توفیق مدد کر دیں۔ ٹھیلے والے نے دس کا نوٹ جیب سے نکال کر بڑے لڑکے کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ میرا دل دہل کے رہ گیا تھا بچوں کا سوال سن کے۔ کیا کوئی ایسا بھی بدنصیب ہو سکتا ہے کہ جب وہ مر جائے تو اُس کے بچوں کو اُس کے کفن کے لیے بھی در در پھر کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر مدد کے نام پہ بھیک مانگنا پڑے۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور سماعتوں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ میں پچھلے قدموں پیچھے ہٹی تھی اور روم کا دروازہ کھول کے تیزی سے سیڑھیاں اُترتی گیٹ کو جلدی سے کھول کے باہر گلی میں نکلی آئی وہ بچے ابھی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھر رہے تھے۔

میں نے اُن بچوں کو گلے سے لگا لیا اور بس روئے جا رہی تھی میرا اِن بچوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی اُن کے دکھ پہ میرا دل کٹ رہا تھا۔ کیا ہوا آخر کیوں رو رہی ہو یوں بیٹا مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ کب بابا بھی میرے پیچھے باہر آ گئے تھے میں نے آنسو پونچھے اور روتے اور ہچکیاں لیتے بچوں کا بتانے لگی۔ بابا بھی بہت ہمدرد دل رکھتے تھے۔ یہ اُنہیں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ میں کسی غریب کا نہ دکھ دیکھ سکتی تھی نہ ہی برداشت کر سکتی تھی۔ بابا کو بھی بے حد دکھ ہوا تھا اُنہوں نے واپس گھر جا کر اپنا والٹ لیا اور گاڑی نکلوائی ہمارے اک ملازم اور ڈرائیور کو ساتھ لیکر اُن بچوں کے بتائے پتہ اُن کے گھر پہنچ گئے۔

.....☆☆.....

وہ ٹوٹا پھوٹا چھوٹا سا گھر تھا۔ اک پرانی سی چارپائی پہ اُن بچوں کے ابو کی میت پڑی تھی اور وہ جو چارپائی سے لگی

بیٹھی تھی شاید اُن بچوں کی ماں تھی۔ غم اور بھوک سے نڈھال وہ عورت بس اس مرنے والے کی چارپائی سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ بچوں کی طرح اُس عورت پہ بھی پژمردگی سی چھائی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں بڑھ کے اُس کے قریب بیٹھ گئی اور مرنے والے کا افسوس کیا۔ اُس نے بتایا کہ مرنے والا اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پڑھا لکھا تھا مگر کوئی نوکری نہ مل سکی۔ مجبوراً اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اک فیکٹری میں مزدوری کر رہا تھا روزانہ اتنے پیسے ملتے تھے اک رات دن کا کھانا نصیب ہوتا تھا۔ دو دن پہلے فیکٹری جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا اُس کا اور اُن کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ اُسے اسپتال لے جاتی وہ۔

مرنے والے کے ماں باپ کچھ عرصہ قبل فوت ہو گئے تھے۔ اور اُس نے گھر سے بھاگ کے بچوں کے باپ سے شادی کی تھی اور اُس کے میکے والوں نے ہمیشہ کے لیے اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اُس کے خاندان والوں کا پوچھنے پہ اُس عورت نے بتایا۔ بابا نے جس ملازم کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں لانے کو بھیجا تھا وہ چیزیں لے آیا تھا۔ میں نے بچوں اور اُن کی ماں کو وہ کھانے کو پیش کیں۔ جو انہوں نے فوراً کھانی شروع کر دیں۔ آج مجھے احساس ہوا تھا کہ بھوک کس بلا کا نام ہے بچے اور اُن کی ماں تین دن سے بھوکے تھے۔ جواں سال شوہر اُس کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا اور اُس کی میت سامنے رکھے وہ لوگ کھانے پہ ہی توجہ دیئے کھانا کھانے میں مصروف تھے کھانے کے چند نوالے اندر اتارتے ہی اُن کے چہروں پہ زندگی رمق نظر آنے لگی تھی۔

.....☆☆.....

دل اس قدر ملول تھا خود پہ کنٹرول کے باوجود بار بار آنسو آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ آج میں نے غربت اور اِس کی ذلالت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ تین معصوم بچے اپنے باپ اور واحد سہارے کی میت پہ آنسو بہانے کے بجائے در بدر اُس کے کفن کے لیے بھیک مانگ رہے تھے۔ میت کو اِس وقت غسل دیا جا رہا تھا اور اُس پڑوس کے کئی مرد بھی آ چکے تھے اور عورتیں بھی۔ جب کہ آج سے پہلے اِن لوگوں نے کبھی بھی اِن لوگوں کا حال احوال بھی نہیں لیا تھا۔ اگر پوچھا ہوتا تو اِن کا واحد کفیل یوں بھری جوانی میں علاج معالجے کے پیسے نہ ہونے کے سبب ایڑیاں رگڑ کے نہ مر جاتا اور نہ اُس کے بچے تین دن سے بھوکے ہوتے۔ اِن لوگوں کی اُس کی بیوی نے منتیں بھی کیں مگر اُن کا سٹیٹس دیکھ کے کسی نے مدد کرنا ضروری نہ سمجھا کہ کل کو بھلا کہاں سے لوٹا پائیں گے یہ علاج پہ لگنے والی رقم۔ انسانی جان اور خون جتنا اِس دور میں ارزاں ہے شاید ہی کسی اور دور میں ہوتا ہوگا۔ ہم لوگوں کے اندر احساس ہی مر چکا ہے نہ کسی کا غم دیکھ کے دکھ ہوتا ہے نہ کسی کی موت کو دیکھ کہ ہم اپنی موت ہی کو یاد کرتے ہیں بس آج کے انسان کو مال جمع کرنے کی ہوس ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہوں گے اِس جہاں میں جو دوسروں کے دکھوں پہ دکھی ہوتے ہونگے۔ مگر ہمیں لوگوں کے احساس اور ضمیر کو جھنجوڑنا ہوگا۔ تاکہ پھر کبھی کوئی معصوم بچہ اپنے باپ کے مرنے پہ کفن بنانے کے لیے بھیک نہ مانگتا پھر رہا ہو۔ میت دفن کرنے کے بعد بھی اُن کے محلے والے اپنے اپنے گھروں کو چل دیے کسی نے بھی شفقت سے اِن یتیم بچوں کے سروں پہ ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔ مجھے انسان کی عظمت کی بلند دیوار زمین بوس ہوتی نظر آئی بچے سہمے ہوئے اپنی ماں کے گرد بیٹھے تھے وہ سب سے چھوٹے بچے کو گود میں لیے بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

.....☆☆.....

اب ان بچوں اور اُن کی ماں کا کیا بنے گا کہاں جائیں گے یہ لوگ۔ بابا نے دکھ بھرے انداز میں بچوں اور اُن کی ماں کو اک نظر دیکھ کر کہا۔

ہمیں اِن کے لیے کچھ کرنا ہوگا بابا۔

ہاں بیٹا میں بھی یہی سوچ رہا۔

ہم اِنہیں گھر لے جائیں گے بابا اِن بچوں کو کسی اچھے سکول میں داخل کروا دیتے ہیں۔

ہاں بیٹا کیوں نہیں ایسا ہی کریں گے۔ پہلے بچوں کی ماں سے تو پوچھیں وہ کیا چاہتی۔ شاید وہ اپنے گھر والوں کے

پاس واپس جانا چاہ رہی ہو۔
میں نے بابا کی بات کی تائید کرتے ہوئے سر ہلایا اور بچوں کی ماں کی طرف اُس کا فیصلہ پوچھنے کے لیے چل پڑی۔
پوچھنے پہ اُس نے بتایا کہ اُس کا کوئی رشتہ دار نہیں جو اُسے اور اُس کے بچوں کو سہارا دے۔ سب نے اُس سے ناتا توڑ لیا تھا۔
کیا تم ہمارے ساتھ چلو گی۔ تمہارے بچوں کا کسی اچھے اسکول میں ایڈمیشن کروایا جائے گا۔
چلنے کو تو چلوں بی بی جی پر میں کسی کے احسانوں کے سہارے زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔
میں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں گی۔
وہ تھوڑی خوددار عورت لگی مجھے۔
فی الحال تم ہمارے ساتھ چلو بیٹی۔ اِس حال میں تم لوگوں کا یہاں رہنا بہتر نہیں۔ بابا نے شفقت سے اُس عورت کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
وہ خاموشی سے اُٹھی اور اپنے بچوں کو لے کے پیچھے گاڑی میں آ بیٹھی۔

.....☆☆.....

رات دو بجے کے قریب ہم لوگ گھر پہنچے۔ بابا نے ملازم کو انہیں کھانا کھلا کر انہیں اک کمرے میں پہنچا دینے کا کہا۔ میں اپنے روم میں آ گئی تھی۔ آج میں نے زندگی کا اک بہت بھیانک اور بدصورت روپ دیکھا تھا۔ میرا دل ہمیشہ ایسے لوگوں کو دیکھ کے دُکھتا تھا۔ دل میں آتا تھا کہ اِن لوگوں کے لیے کچھ کیا جائے۔ اُنہیں بھی بہتر اور اچھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ کاش ہر صاحبِ ثروت ایسے لوگوں کا سہارا بن جائیں اُنہیں بہتر زندگی کی مراعات دیں کسی اک انسان کی زندگی سنوارنے کا بیڑا اُٹھا لیں تو اک دیئے سے کئی دیئے جل اُٹھیں۔ مگر کاش لوگ اپنی جیبیں اور تجوریاں بھرنے کے بجائے ایسے غریب اور پسماندہ لوگوں کا حصہ بھی نکالیں تو اک معاشرے کی حالت بدل جائے گی۔ انہیں خیالوں میں غلطاں نجانے رات کس پہر میری آنکھ لگ گئی پتہ ہی نہ چل سکا۔

.....☆☆.....

اگلے دن بابا نے اُن بچوں کو نئے کپڑے دلوائے اور اپنے ساتھ اک اسکول لے جا کر اُن کا ایڈمشن کروایا۔ بابا اک ویکیشنل ٹریننگ اسکول کے ہیڈ تھے اُن کی ماں کو سلائی کڑھائی سیکھ لینے کا مشورہ دیا تا کہ وہ یہ سب سیکھنے کے بعد کوئی چھوٹا موٹا کام گھر بیٹھے کر سکے۔ اُس نے بابا کی بات مان لی تھی اور عدت کے بعد ٹریننگ کے لیے بابا کے سکول جانے کی ہامی بھر لی تھی۔ بچوں کے تمام تعلیمی ضروریات کا تمام خرچ میں نے اُٹھا لیا تھا۔ اور آج سے میں نے اِن بچوں کو جہاں بہترین مستقبل دینے کا عہد کیا تھا وہیں اِن جیسے کئی اور بچوں کو بھی بہتر مستقبل دینے کا اک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر شاید مشکل ہو مگر ناممکن نہیں تھی۔ جہاں میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا وہیں مجھے اپنے نیو کالم کا ٹاپک اور تھیم بھی مل گیا تھا۔ کالم کا ٹاپک تھا کفن۔ کل کا سارا واقعہ نگاہوں میں پھر گیا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ کر میرے رخساروں پہ چمکنے لگی تھیں۔

.....☆☆.....

نمکین آلو
شمائلہ زاہد

کالج سے تھکی ہاری گھر لوٹی اور آتے ہی تخت پر گرنے کے انداز میں بیٹھی۔
"میری بچی کیا ہوا ماں نے فکرمندی سے مہر سے پوچھا۔"

"امی ہونا کیا ہے، میں دھوپ میں کھڑی گاڑی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور گرمی دیکھی ہے آپ نے آج تو لگتا ہے سورج سوا نیزے پر ہے، امی ہم اتنے بدنصیب کیوں ہیں کہ ہمیں بسوں کے لیے گھنٹوں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے امی آپ کو پتہ ہے میری ساری دوستوں کے گھر اتنی بڑی بڑی گاڑیاں ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ صبا کے ابو کے پاس اتنی بڑی اور خوبصورت گاڑی ہے مہر کے لہجے میں میں حسرت بول رہی تھی "میری گڑیا رانی دوسروں کی چیزوں کو دیکھ کر یوں حسد نہیں کرتے تم کالج سے تھکی ہاری آئی ہو تم نہا دھو لو میں کھانا گرم کرتی ہوں "امی آج کیا بنایا ہے بھوک تو بہت زوروں کی لگی ہوئی ہے " آج تو کچھ اچھا ہی ہوگا مہر نے دل میں سوچا"۔ میں نے اپنی رانی کے لیے نمکین آلو بنائے وہ بھی زیرہ ڈال کے " کیا ماں آپ روز ہی آلو ہی بنا لیتی ہیں مجھے نہیں کھانے آپ کے آلو" وہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں بند ہوگئی اپنے خوابوں میں محو سفر اے کاش میں امیر گھر میں پیدا ہوئی ہوتی چلو کیا ہوا جو میں امیر گھر میں پیدا نہیں ہوئی اے اللہ بس آپ کسی بھی طرح میری شادی ہی امیر لوگوں میں کروا دیں اللہ جی اس کے بعد آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ وقت گزرتا گیا اور مہر کی شادی ہوگئی۔

ارے، بہو آؤ نہ وہاں کیوں کھڑی ہو یہ کھانا کھاؤ نا سب کچھ تمہارے لیے ہی تو ہے اور بہت اعلیٰ بھی ہے۔ شادی کی پہلی صبح جیسے ہی اس کی نظر ناشتے کی میز پر پڑی تو وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوئی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ آج یہ سب کھائے گی جس کے بارے میں وہ صرف سوچ سکتی تھی۔ ارے کھاؤ نہ بھابھی تم جیسے فقیروں نے تو کبھی اتنا عمدہ ناشتہ خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ حلوہ پوری کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے پرنم نگاہوں سے اپنی نند کو دیکھا جو بڑے مزے سے جویں پی رہی تھی مانوں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شارق ناشتہ کی میز پر اس طرح چپ بیٹھے ناشتہ کرنے میں مگن تھے جیسے بے عزتی ان کی بیوی کی نہیں بلکہ کسی نوکرانی کی ہو رہی ہو۔ وہ پھولوں جیسے نرم کارپٹ پر ہاتھ پھیرتی اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی کہ اس ہی وقت اس کی سماعت سے ایک ناگوار بات ٹکرائی۔ اس کا دیور اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا بول رہا تھا۔

او عاس۔ تو دیکھ رہا ہے اس لڑکی کو وہ ہے شارق بھائی کی بیوی ارے ارے میں غلط بول گیا بلکہ یہ ہے وہ دل بہلانے کا سامان جس پر میرے ڈیشنگ بھائی ان کے بقول مرمٹے۔ دیور تو بات کر کے چلا گیا، لیکن وہ رونے لگی اپنی توہین پر اپنی عزت نفس کچل جانے پر آنسو بھل بھل پلکوں کی باڑ توڑ کر اپنے گلابی رخسار بھگو گئے۔

اگلی صبح ہلکی خنکی لئے ہوئے طلوع ہوئی وہ لان میں واک کر رہی تھی جب، اس نے شارق کو نیک سیک سے تیار گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔

شارق آپ اتنی صبح کہاں جا رہے ہیں۔

تم سے مطلب میں جہاں بھی جاؤں میں نوکر نہیں ہوں تمہارے باپ کا کہ تمہیں بتا کے جاؤں۔ اب ہٹو کیوں راستے میں بت بن کر کھڑی ہو۔ وہ اپنے حواس میں لوٹی تو شارق کی بات پر حیران رہ گئی سنو امی کو بولنا کہ شام کو سب تیار رہیں آج باسل کے گھر دعوت ہے۔

امی مجھے لگتا ہے یہ لڑکی ہمارے گھر میں دولت حاصل کرنے آئی ہے، آپ نے دیکھا شکل سے کتنی معصوم لگتی ہے۔ مہر جو اپنے مجازی خدا کو واقعی خدا سمجھتی تھی، اس کا پیغام دینے اپنی ساس کے کمرے میں جا رہی تھی یہ سب سن کر واپس پلٹ گئی اور اپنے کمرے میں آ کر زار و قطار رونے لگی اے اللہ یہ سب کیا ہو گیا میرے ساتھ اللہ جی میں کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہا، کیا غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی کیا آپ نے امیروں کو یہ حق دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں غریب کی عزت تار تار کر دیں یہی سب سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے پتہ ہی نہ چلا۔

دو گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو ایک دم اٹھ کر سدرہ بیگم کے کمرے کی طرف بھاگی، السلام علیکم امی وہ شارق نے کہا ہے کہ آج شام باسل بھائی کے گھر دعوت ہے اور ہم سب کو جانا ہے۔

اچھا تم جاؤ ہم تیار ہو جائیں گے شام تک۔

شام کو شارق کا فون آیا کہ وہ آفس سے ہی باسل کہ گھر پہنچ جائے گا، مہر سدرہ بیگم اور نرمین کے ساتھ گاڑی میں آ جائے گئی۔ سب تیار ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں چلے گئے تھے جب کہ سدرہ بیگم اور نرمین جانے کے لیئے تیار تھے۔

امی میں کس کے ساتھ جاؤں گئی مہر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تم تمہاری اوقات کہاں کے تم ایسی والی گاڑی میں بیٹھو چلو گاڑی کے پیچھے بھاگو فقیرنی کہیں کی۔

وہ گاڑی کی رفتار سے اپنی رفتار ملانے کے لیے بھاگ بھاگ کر تھک چکی تھی پاوں مارے درد کے چلنے سے انکاری تھے وہ وہیں نڈھال سی گر گئی۔ کار میں بیٹھی نرمین کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا امی آج کے لیے اتنا کافی ہے بٹھا لیتے ہیں اس فقیرنی کو بھی گاڑی میں۔ سدرہ بیگم نے اسے گاڑی میں بیٹھا لیا۔ پارٹی سے واپسی پر سب انتہائی خوش تھے مہر کا دل ٹوٹ چکا تھا وہ آتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مہر سوچ رہی تھی کہ کیا غریب ہونا سنگین جرم ہے یا پھر غریب کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ سدرہ بیگم جیسے لوگ اس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ شارق کو اپنی طرف متوجہ پا کر مہر نے سوچا کے اپنے جیون ساتھی سے امی اور نرمین کے برے برتاؤ کے بارے میں بات کرے۔

شارق مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔

ہاں بولو۔ آپ دیکھ رہے ہیں نہ نرمین اور امی میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں، کچھ دن پہلے تو نومان بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر میرا مذاق بنا رہا تھا۔

دیکھو مہر انہوں نے کبھی کچھ غلط تو نہیں کہا نہ وہ بس یہی تو کہتے ہیں کے تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ مل گیا ہے۔ دیکھو اگر میں تم سے شادی نہ کرتا تو تم آج بھی وہاں ہی ہوتی تنگ اور گھٹن زدہ گھر اور تاریک گلیوں میں۔

بس شارق بس بہت بول لیا آپ نے اور بہت سن لیا میں نے۔ آپ بھی مجھے ہی طعنے دے رہے ہیں میں جا رہی ہوں مجھے نہیں رہنا اس گھر میں جہاں میری کوئی عزت ہی نہیں ہے مجھے وہ گھٹن زدہ گھر ہی قبول ہے وہ کمرے سے نکلی اور میں گیٹ پار کر گئی۔ اپنے گھر میں داخل ہوئی اور ماں کو آواز دی امی امی کہاں ہیں آپ۔

ارے میری لاڈلی آئی ہے ماں تین ماہ بعد اپنی لاڈلی کو دیکھ کر خوش ہو گئیں میری گڑیا میری لاڈلی بتا کر تو آتی میں تیرے لیے کچھ اچھا بنا لیتی تو بیٹھ میں مرغی لے کر آتی ہوں تجھے پسند ہے نہ۔ امی آپ میرے لیے مرغی نہیں بلکہ نمکین آلو بنائیں مہر کی بات پر ماں حیران ہوئی اور بولی بیٹی وہ تو تجھے پسند نہیں ہیں پھر اب کیوں۔ امی وہ پہلے کی بات تھی اب مجھے یہی کھانے ہیں۔ ماں نے جلدی سے نمکین آلو بنائے اور مہر نے پیٹ بھر کر کھائے۔

میں مہر آج جان گئی ہوں اور اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ عزت کہ نمکین آلو بے عزتی کے مرغ مسلم سے ہزار گناہ بہتر ہے۔ اے کاش میں یہ سب پہلے جان لیتی تو میرے نصیب میں خسارے نہ ہوتے اے کاش۔

.....☆☆.....

حوا کی بیٹی

ریحانہ سعیدہ

حوا کی بیٹی کب تک مصلوب ہوتی رہے گی۔ مہرو گھر میں داخل ہوئی تو سکندر اسے آتا دیکھ کر رک گیا۔

اماں میں نے کتنی دفعہ کہا ہے اس اسکول مت بھیجو۔ چار جماعتیں پڑھ گئی تو دماغ خراب ہو جائے گا اور آنکھوں سے شرم وحیا ختم ہو جائے گی۔

پتر پڑھنے کا شوق ہے اسے۔ جھلی ہے پڑھنے دے تیرا کیا لیتی ہے۔

بس اماں میں نے کہہ دیا نا کہ اب اسکول نہیں جانا تو نہیں جانا میں نے اسکول جاتے دیکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔

ادا مجھے پڑھنے دے مجھے ڈاکٹر بنا ہے۔ مہرو نے سکندر کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ سکندر ٹھوکر مارتے

ہوئے بڑی آئی ڈاکٹرنی بنے گی اور گھر سے نکل گیا۔
اماں ادا مجھے پڑھنے کیوں نہیں دیتا۔ کیا پڑھنا بری بات ہے۔ پڑھنے سے غیرت شرم وحیا ختم ہو جاتی ہے۔ مہرو نے گویا ماں سے فریاد کی۔ اماں نے مہرو کے بال سہلاتے ہوئے کہا ہے۔
نا جھلی تو کیوں ایسا سوچتی ہے۔
تو اماں پھر ڈاکٹرنیاں اچھی نہیں ہوتی تو میں استانی بن جاؤں گی۔
نہیں دھیئے ڈاکٹرنیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ مریضوں کا علاج کرتی ہیں خدمت کرتی ہیں۔
اماں تم مجھے اسکول نہیں بھیجے گی۔ تو میں ڈاکٹرنی نہیں بن سکوں گی ماں اللہ کے واسطے ادا کو کہو نہ مجھے پڑھنے دے۔ میں اس کی بات مانوں گی۔ اماں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
دھیئے گوٹھ میں رہنے والی بچیاں گھر کی چار دیواری میں خوش رہتی ہیں میری بچی تو بھی اپنے نصیب پہ شاکر ہو جا۔
سکندر اپنے آوارہ دوستوں میں بیٹھا اپنا یک طرفہ عشق بیان کر رہا تھا کہ اس کی نظر پانی بھر کر لاتی زینب پر پڑی اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اونچی آواز میں گنگنانے لگا دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں دو قدم آگے چل کر زینب کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔
دیکھ زینی اگر تو آج ہاں کر دے تو میں اماں کو تیری طرف بھیجوں۔ زینی نے سکندر پر غصے بھری نظر ڈالی سکندر اگر میرا ویر نہیں جو تیرا راستہ روک سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو سرِ عام مجھے تنگ کرتا پھرے۔ آئندہ میں نے تجھے اپنے راستے میں دیکھا تو پنچائت میں شکایت کردوں گی زینی نے سکندر کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔
اور اپنی سہیلیوں کی طرف بڑھ گئی۔
واہ سکندر یہ چھٹانک بھر لڑکی تیری بے عزتی کر گئی۔'' رب نواز نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔
تو صرف نام کا سکندر ہے یار۔
یہ بات نہیں گوٹھ کی ہر لڑکی میرے اشاروں پر ناچتی ہے۔ بس یہی چکنی مچھلی اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔
او یار اگر تو کہے تو کسی بندے کے ساتھ الزام لگوا کر کاری کروا دیتا ہوں۔ رب نواز نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ تیرا جگر بھی ٹھنڈا ہو جائے گا اور اس کا غرور بھی مٹی میں مل جائے گا۔
نہیں یار اسے برباد نہیں اپنے گھر میں آباد کرنا چاہتا ہوں میں اس پری سے پیار کرتا ہوں شادی کرنی ہے مجھے اس سے۔ مسئلہ کوئی نہیں اسے اٹھا کے ڈیرے پہ لے جا دو چار گھنٹے رکھ پھر چھوڑ دے خود ہی مان جائے گی اپنی عزت کی خاطر رب نواز نے تجویز دی۔
ہاں یہ ٹھیک ہے سکندر نے مہر لگادی۔ سوہنی پانی بھرنے نہیں جانا نہیں زینی کل سے بخار سے جسم ٹوٹ رہا ہے۔ تو آج اکیلی چلی جا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل آج پریشان ہے اور تو بھی نہیں جا رہی گھر میں پانی کی بوند نہیں ورنہ میں بھی نہ جاتی۔
میں نہیں جا رہی تو کیا تو تو شیرنی ہے اپنے گوٹھ کی کیسے سکندر کو منہ توڑ جواب دیتی ہے۔ تجھے کس بات کا خوف بھلا جا چلی جا۔ ہمارا پانی تو اماں آج صبح لے آئی تھی کہ میرا بخار بڑا تیز تھا۔'' سوہنی نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔
اچھا رب راکھا زینی نے اپنا گھڑا اٹھایا۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے زینی نے نسبتاً چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھی جب اس نے سکندر اور رب نواز کو آتے ہوئے دیکھا رب نواز نے آواز لگائی۔
یار سکندر آج قسمت کی دیوی تجھ پر مہربان ہے پری اکیلی پھر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ زینی کچھ کرتی دونوں نے مل کر اسے پکڑا اور ڈیرے کی طرف لے گئے۔ کمرے میں پھینکتے ہوئے سکندر نے کہا۔
دیکھ زینی اگر تو سیدھی طرح میری محبت قبول کر لیتی تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی نہ کرنی پڑتی۔
لعنت ہو تم پر سکندر تمھاری بہن بھی اسی گوٹھ میں جوان ہو گی تو جو آج میرے ساتھ کر رہا ہے وہی کل تیری بہن

کے ساتھ ہوگا۔

خبردار جو میری بہن کا نام لیا اس کا ویر اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والے کی آنکھیں نکال لے گا۔تو اپنی فکر کر۔مان گئی تو عزت سے رشتہ بھیج کے اپنا لوں گا ورنہ......

چل سکندر اسے یہیں بند رہنے دے جب تک ہوش ٹھکانے نہیں آتے۔رب نواز نے سکندر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا،سکندر نے آگے بڑھ کر زینب کا ہاتھ پکڑا دیکھ ابھی بھی وقت ہے مان جا۔ورنہ جو ہم تیرے ساتھ کریں گے وہ تیری نسلوں کو یاد رہے گا سکندر نے زینب کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا زینب نے خوف سے چیخیں مارنی شروع کردی۔قسمت کی مہربانی چاچا کریم بخش شہر سے واپس آرہا تھا چیخ سنی تو گرجدار آواز میں بولا۔

اوئے کون ہے جھنی۔زینی نے آواز لگائی۔

چاچا میں ہوں بچاؤ مجھے۔رب نواز اور سکندر نے کھڑکی سے بھاگنے کی کوشش کی۔اور زینب نے دروازہ کھول دیا۔

چاچا چاچا بچالو مجھے۔" روتے ہوئے یہ مجھے زبردستی یہاں لائے تھے۔یہ جھوٹ بولتی ہے دروازہ کھلا ہے یہ خود آئی تھی یہاں اپنی مرضی سے،سکندر نے مڑتے ہوئے کہا۔چپ کرو پنچائت اس کا فیصلہ کرے گی۔چلو دھیئے تم گھر جاؤ۔

پنچایت نے تمام واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی یا سکندر لے کے گیا ہے دونوں صورتوں میں لڑکی کی بدنامی ہے جو اس کی شادی میں رکاوٹ بن سکتی ہے اسلئے ہم نے سکندر اور زینی کی شادی کا فیصلہ کیا ہے اور کیونکہ سکندر نے گوٹھ کی عزت پر بری نظر ڈالی اس کی سزا کے طور پر اس کی بہن کی شادی زینی کے باپ سے ہوگی کیونکہ اس کے خاندان میں کوئی مرد نہیں اور اگر سکندر یہ شرط پوری نہیں کرے گا۔تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔پنچائت نے فیصلہ سناتے ہوئے مزید تاکید کی اس فیصلے پر عمل درآمد دو دن میں ہونا چاہیے۔

اماں مہرو کو یہ کپڑے پہنا کے تیار کردے آج اس کا نکاح ہے منشی اللہ داد کے ساتھ۔

سکندر تو پاگل تو نہیں ہوگیا کہاں وہ ٦٠ سال کا بڈھا اور کہاں میری بارہ سال کی معصوم بچی۔پنچائت کے فیصلے کو میں نہیں مانتی۔

ٹھیک ہے نہ مان پھر میں سنگسار ہو جاتا ہوں تو اس لڑکی کو بچا کو اپنی نسل ختم کردے۔

نیک بختہ کے یہ گھبرو پتر وارث ہے میرا دایاں بازو ہے چھوری کی آج نہیں تو کل ویاہ ہی کرنا ہے کل نہیں تو آج ہی سہی۔"

اماں دیکھ میں زندہ رہا تو تیری نسل بڑھے گی پوتے پوتیاں گودی کھلاؤ گی۔

لو دیکھ مہرو آ گئی ہے۔اماں چھنو کہہ رہی ہے چاچے اللہ داد سے میرا ویاہ ہے اماں بتا نہ یہ سچ ہے بول نہ اماں میں تو اسکول بھی نہیں جاتی۔میں ڈاکٹر بننے کی ضد بھی چھوڑ دی میں نے۔میں نے تو کوئی بے غیرتی نہیں کی پھر میرے ساتھ یہ ظلم کیوں اماں بول نہ تو بولتی کیوں نہیں مہرو نے ماں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

دھیئے گوٹھ میں رہنے والی لڑکیاں بھائیوں کو بچانے کے لئے قربانی دینے کے لئے پیدا ہوتی ہیں جا یہ لال جوڑا پہن کر آ۔یہ محض کہانی نہیں بلکہ سوال ہے کہ کب تک ہم حوا کی بیٹیاں آدم کے بیٹوں کے ہاتھوں مصلوب ہوتی رہیں گی۔کب تک کاروکاری۔ونی۔اور قرآن کی دلہن بنا کر انہیں دیواروں میں چنوایا جائے گا کب تک آخر کب۔

گوشۂ ابن صفی

ادارہ

اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ایشیا کے معروف ترین اور ممتاز ادیب جناب ابن صفی کو اگر دنیا کا انتہائی مظلوم ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا انہوں نے اردو کی حقیقی ترقی واشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور ناول نگاری کے فین کو بلندیوں پر پہنچایا اور پاکیزگی واخلاقیات کا پابند کیا وہ ادب میں لامحدود غیر معمولی اور لامحدود آزاد خیالی کے قائل نہیں تھے بلکہ ادبی لطافت، اعلیٰ ذوق اور طنز ومزاح کی چاشنی کو اہمیت دیتے تھے ان کی تحریروں میں استعارہ وکنایہ کو امتیازی اہمیت حاصل ہے انہوں نے بڑی سے بڑی بات کو چھوٹے سے چھوٹے جملے میں اس طرح ادا کیا کہ ادب کے طالب علم عش عش کر اٹھے اور اس سے علم کی روشنی پائی۔

ابن صفی کی تحریر کے اس ہی کمال کا نتیجہ ہے کہ ان کو ہم سے بچھڑے تقریباً اڑتیس برس ہونے کو ہیں اتنی مدت بعد محبان ابن صفی جو بالکل نو مشق ہی ہیں بلکہ نوآموز بھی ہیں نے جس جس طرح اپنے جذبات واحساسات کو قلم بند کیا ہے حیرت ہوتی ہے واقعی یہ ابن صفی صاحب کی تحریر کا کمال ہے کہ جب ان کے قارئین نے قلم اٹھایا تو لفظوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے ایسی ہی جادو اثر تحریروں کا گلدستہ جو "دی گریٹ ابن صفی فینز کلب" کے ارکان جناب سید اسد عال الحسینی، حمیرا ثاقب، زویا خان اور دیگر منتظمین کی کوشش ولگن کا نتیجہ ہیں ہم نے ان تمام عقیدت مندوں کی عقیدت وجذبات کو یکجا کر کے آپ کے لیے پیش کر دیا ہے۔

مجدد عصر

تحریر: مشتاق احمد قریشی

محترم ابن صفی صاحب کے قلم کا سفر غالباً 1951ء سے شروع ہوا تھا، شاید میں کچھ غلط لکھ گیا ہوں، دراصل سفر نہیں ایک نئے عہد کی ابتدا ہوئی تھی، اب ابن صفی کسی شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عہد کا استعارہ بن چکا ہے۔

ابن صفی نے جب قلم سنبھالا اس وقت لکھنے والوں یا ناول نگاروں کی ایک بھیڑ تھی جو بھیڑ چال چل رہی تھی، وہی لگے بندھے جملے، وہی لگے بندھے مکالمے، منظرنامے اور قاری کی دلچسپی کے لئے بے ہودہ اور فحش نگاری کی جارہی تھی۔

یوں تو اردو ناول کی ابتداء کا سہرہ ڈپٹی نذیر احمد کے سرجاتا ہے جوان کے ناول "مراۃ العروس" سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد ایک طویل سلسلہ ہے جو منشی پریم چند تک پہنچتا ہے، ان کے بعد ہی ناول کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آئی اور ناول اخلاق سوز ہوتا چلا گیا، اس دورِ پُرفتن میں ابن صفی نے ایک مجدد بن کر اپنے قلم کا علَم بلند کر؟ا، وہ اس میدان غلاظت میں اترے تاکہ معاشرے میں پھیلی ایک کریہہ الصورت رسم تحریر کو غلط اور غلیظ ثابت کر کے اس سے پڑھنے والوں کو نجات دلائی جاسکے، یقیناً یہ ایک بڑا چیلنج تھا جسے انہوں نے نا صرف سچ ثابت کر دکھایا بلکہ لوگوں میں اردو پڑھنے اور سمجھنے کا شعور اور شوق بھی پیدا کیا، ہندوستان یعنی بھارت جہاں اردو دم توڑ رہی تھی کسی قریب المرگ مریض کی مانند ایڑیاں رگڑ رہی تھی کو ابن صفی کے قلم نے سہارا ہی نہیں دیا بلکہ نئی زندگی بھی دی، بھارت میں تمام پڑھے لکھے لوگوں نے، اشاعتی اداروں نے اردو نستعلیق کی جگہ دیوناگری رسم الخط اپنا لیا تھا، ابن صفی کے ناول اس اندھیری کال کوٹھڑی میں روشنی کی کرن بن کر سامنے آئے، ان کے جادو اثر قلم نے وہ کر دکھایا جو اس وقت کے جغادری لکھاری سوچتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔

ابن صفی کے عہد ساز قلم نے نا صرف قارئین میں اردو ناول پڑھنے کا ذوق پیدا کیا بلکہ معاشرے سے قلم کی گندگی کا صفایا بھی کیا، اب ابن صفی کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ایک عہد ہے جوان کے پڑھنے والوں کو قانون کی پاسداری، فحش لغویات سے دوری واجتناب، بڑوں کی عزت واحترام کرنے کا سلیقہ، اپنے اردگرد کی سازشوں سے ہوشیار ہوتے ہوئے معاشرے کے سلگتے ناسوروں، جرائم پیشہ افراد سے نمٹنے اور اپنے اخلاق اپنے آپ کو سنبھالنے کا فن سکھاتا ہے۔

اب آتے ہیں ابن صفی ایک رجحان کیسے ہیں۔۔۔؟ ابن صفی نے جو بھی لکھا، جیسا بھی لکھا وہ اس بات کی گواہی ہے کہ انہوں نے خوب بہت خوب لکھا، آج ابن صفی کی پہلی تحریر کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس کا اثر آج بھی اسی طرح محسوس کیا جارہا ہے جیسا کہ اس وقت جب وہ تحریر لکھی گئی تھی، ان کی تحریروں کا یہی حسن اور یہی خوبی ہے کہ وہ وقت کے گرداب میں کہیں گم نہیں ہوئیں، اس کے پڑھنے والے اب بھی اس سے اسی طرح محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے ہیں، جو ابن صفی کے رجحان کا منہ بولتا ثبوت ہے، اسی رجحان نے اُن کے بے پناہ پیروکار پیدا کیئے (میں نقال نہیں لکھ رہا) جنہوں نے ان کے کرداروں کے ساتھ جو بھی کیا جیسا بھی کیا وہ اپنی جگہ لیکن وہ تمام ہی لکھنے والے کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیتوں کے باوجود ابن صفی کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے، بقول کئی لوگوں کے مکھی پہ مکھی مارنے کے باوجود وہ اپنے قلم کے جوہر اس طرح نہیں دکھا سکے جیسا کہ ابن صفی دکھا گئے کسی بھی لکھنے والے کی پیروی اس وقت ہی ممکن ہے جب نئے لکھنے والے اور شائع کرنے والے کو یہ یقین ہو کہ وہ اگر ابن صفی کی پیروی کرے گا تو ضرور پسند کیا جائے گا، کامیاب ہو جائے گا ورنہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گا، اسی باعث ابن صفی صاحب کی پیروکاروں کے بھی پیروں کار سامنے آتے چلے گئے (یعنی نقال در نقال) یقیناً ابن صفی صاحب نے اپنے قلم کے جادو سے اردو دنیا کو خصوصاً ایک رجحان بخشا ہے، وہ ایک رجحان ساز شخصیت کے حامل تھے، اگر میں یوں کہوں کہ وہ جدید ناول کے مجدد تھے تو غلط نہ ہوگا، ناول کی

اس جہد کو ڈپٹی نذیر احمد نے روشناس کیا تھا (پاکیزہ و بااخلاق) اسے ابن صفی نے از سر نو نا صرف زندہ کیا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔

ابن صفی کو قلم سنبھالے نصف صدی سے زیادہ تقریباً چھیاسٹھ برس گزر چکے ہیں، ان کی تمام تحریریں آج بھی زندہ جاوید ہیں، وہ اسی طرح پر اثر اور دلچسپی لئے ہوئے ہیں جیسا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال قبل دلچسپ تھیں، جبکہ ان کے تمام ہم عصر ناول نگار جنھوں نے بے پناہ لکھا صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہوئے ہیں اپنے وقت کے بڑے بڑے اور اہم نام آج گمنام ہو چکے ہیں، اس بھیڑ کو چیر کر سامنے آنے والا اپنے قلم کو تیشہ بنا کر لکھنے والا آج بھی اسی طرح مقبول اور ہر دل عزیز ہے اور خوب پڑھا و سمجھا جا رہا ہے، اللہ ان کے پڑھنے والوں، ان کے چاہنے والوں، اور تمام محبانِ ابن صفی کو سلامت رکھے اور قدم قدم کامیابیوں سے ہمکنار کرے، آمین۔

......☆☆......

میرے والد، میرے استاد

تحریر: ابرار احمد صفی

اب تک کی تحریروں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ نئی نسل مطالعے کی شوقین ہے اور اچھی تحریروں کی تلاش میں سرگرداں ہے، بس اک راہ دکھانے والا ہونا چاہئے، اب یہ راہ گھر کے کس فرد کی طرف سے بتائی اور سمجھائی جائے یا پھر اس کو وہ ماحول میسر آ جائے جہاں مطالعے کا رجحان ہو۔

ہاں تو کہہ رہا تھا کہ عادل میاں نے رابطہ کیا اور اس ایونٹ کے شروع کرنے کی نوید دی اور ساتھ میں کچھ لکھنے کی فرمائش بھی کر دی، لکھنا ہمارے لیے ہمیشہ ہی سے کارِ محال رہا ہے، اب یہ فرمائش میرے لئے جاڑے کا بخار ثابت ہوئی، اس پر سونے پہ سہاگہ یہ کہ موضوع بھی دے دیا، "میرے والد، میرے استاد"

یہ دیکھ کر بچپن سے لے کر ابو کی وفات تک کا عرصہ نظروں میں گھوم گیا، ویسے تو والد کی ہر بات ہی ایک درس ہوتی ہے مگر اب ان باتوں کا تجزیہ کون کرتا ہے کہ سبق کیا ہے جب تک اولاد باشعور نا ہو جائے۔

ویسے تو کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ وہ ایک والد کا کردار ادا کرتے، سامنے بٹھا کر ذرا کڑک دار لہجے میں کہتے کہ "میاں ہوش کے ناخن لیں، یہ کیا حرکتیں جاری و ساری ہیں"، انھوں نے ہمیشہ ہم سب کے ساتھ ایک مشفقانہ اور دوستانہ رویہ روا رکھا، ہر قسم کے موضوع اور مسائل پہ گفتگو کی، بعض اوقات ہماری والدہ ہم لوگوں کی گفتگو سن کر دبے لہجے میں کہتیں کہ آپ کیوں ان کو بگاڑ رہے ہیں...! جواب ہمیشہ یہی سنا کہ باہر سے کہیں غلط معلومات ان کو حاصل ہوں اس سے بہتر یہی ہے کہ میں ان سے کھل کے گفتگو کروں۔

ہمارے موضوعات میں مذہب، معاشرت، فلسفہ اور سیاست کے ساتھ ساتھ انگلش اور اردو فلموں پہ سیر حاصل تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا، ہمیں یاد ہے کہ جب جیمز بانڈ کی فلمیں نو عمروں کے لئے شجر ممنوعہ ہوتی تھیں ہم وہ ساری فلمیں اپنے والد کے ساتھ دیکھتے، وہ ٹکٹوں کی بکنگ بھی ہم کو ہی کرنے کے لئے کہتے تھے، ہمارے کزن ہماری خوش قسمتی پہ نازاں و حیراں ہوا کرتے تھے مگر بعد میں سمجھ آیا کہ یہ فلمیں ہمارے لیے دانہ گندم کبھی بھی ثابت نا ہو سکیں کہ جس کو کھا کر آدم کو جنت سے بے دخل ہونا پڑتا۔

ان فلموں کی حقیقت بے وقعت ہو چکی تھی اور وہ فلمیں جو کہ دوسرے دانت کچکچا کر دیکھا کرتے تھے ہمارے لیے باعث ملال ہی ہوتی تھیں، ہمیں یاد ہے کہ ایک زمانہ میں جب ہیرالڈ رابنسن صرف بالغان کا مصنف ہوتا تھا، ہم اور ہمارے والد ان

ناولوں کی باری لگاتے تھے اور اس طرح یہ چیپٹر بھی ہمارے لئے بے وقعت ہو گیا، تو یہ تھی ان کی استادی۔

مصوری ہو یا کیلی گرافی انہوں نے ہر میدان میں رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی، بہت سی باریکیاں اور فنی پہلو ہم پہ اجاگر کیے، آج ہماری صاف ستھری لکھائی اور مصوری ان ہی کی دین ہے، یہی نہیں بلکہ گھر پر آنے والے تمام آرٹسٹوں اور مصوروں کو ہماری بنائی تصاویر دکھاتے اور ان سے بھی رائے اور مشورہ دلاتے۔

والد صاحب ایک کشادہ ذہن اور دوسرے کی رائے سننے والی شخصیت تھے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ جو مجھے یاد آرہا ہے جو یہاں تذکرہ کرنا ضروری ہے تاکہ قارئین کو بھی اس بات کا اندازہ ہو جائے۔

یہ بات اس وقت کی تھی کہ جب میٹرک کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اور جو کہ بہت طویل ہوتی تھیں، عیاشی ہی عیاشی تھی، طرح طرح کی ایکٹیوٹیز کی جاتی تھیں، اسی میں ایک یہ تھی کہ محلہ کے ایک معمر دودھ فروش کی شادی ہم لڑکوں نے ایک انجمن کے تعاون سے طے کرادی اور شادی کا دن مقرر ہو گیا۔

روزانہ شام کو ہم سب لڑکے ڈھول لے کر اس معمر دولہے کو بیچ میں بٹھا کر اس کے گرد بھنگڑا ڈالا کرتے تھے، بس پھر ایک دن غضب ہو گیا والد صاحب کہیں سے واپس آرہے تھے اور انہوں ہم کو بھی وہیں رقص کرتے دیکھ لیا، ڈرائیور نے ازراہِ وفاداری ہارن بھی دیا کہ ہم سن لیں اور ادھر اُدھر ہو جائیں مگر جو ہونا تھا سو ہو گیا، جب رات کے کھانے کے لیے بلاوا آیا تو بڑے بھائی ایثار مرحوم نے چپکے سے کان میں پھسپھسایا کہ "بچو آج تیری خیر نہیں، ابو نے دیکھ لیا ہے"۔

کمرے میں داخل ہوئے تو پوچھا کہ "یہ کیا حرکت ہے شریفوں کی" پتہ نہیں کیوں ہمارے منہ سے یہی نکلا، "شریف ہیں جبھی خود ناچ لئے ورنہ کیا کسی کو نچوا کر دیکھتے"، بس جاننے کہ سب کو سانپ سونگھ گیا، سب تیار تھے کہ ابھی ایک کڑاکے دار دھماکہ ہوگا کنپٹی کے نیچے، مگر ایسا نہ ہوا، ہلکی آواز میں یہ سنائی دیا کہ "صحیح، مگر سڑک پہ ذرا گاڑیوں کا دھیان رکھنا"،

تو یہ مثال ہے ان کی کشادہ دلی وسیع الذہنی کی

ایک ایک بات لکھنا شروع کریں تو دفتر کے دفتر جمع ہو سکتے ہیں۔

ابو شکار کے شوقین تھے، ان کی اپنی دو بندوقیں تھیں، ایک اک نالی اور دوسری دو نالی، ایک برٹش اور دوسری رشین، ایک جرمن میڈ ڈائنا ایر گن بھی تھی، جو کہ بعد میں ہمارے ہاتھ لگی، ان کی صفائی اور دیکھ بھال ہمارے ذمہ ہوئی تو بندوقوں کے بارے اپنی وسیع معلومات کا خزانہ ہم پہ برسا دیا۔

جب کچھ اور بڑے ہوئے تو پیکیجیشن میں اپنے ساتھ رکھا اور اسکے اسرار و رموز سے واقف کرا دیا، تیز رفتار مطالعہ کی عادت بھی ان ہی کی دین ہے اور ہر چیز جو لکھی ہو پڑھ جاؤ کا اصول بنوا دیا، اخبار میں سرخی سے لے کر زندہ طلسمات کا اشتہار تک ہر چیز اور ان کے درمیان چھپنے والی ہر سطر۔

تو میاں عادل اور جملہ قارئین!

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں، یار زندہ صحبت باقی، پھر ملیں گے اور ہاں! ان محفلوں کو یادوں اور تذکروں سے سجائے رکھنا، اللہ تم سب کو اور جملہ منتظمین کو خوش رکھے۔

ابو، میرے دوست، میرے تربیت کار

تحریر: احمد صفی

"احمد! آج تمہاری سالگرہ ہے نا۔۔۔ سنو میں نے تمہارے لیے ایک نظم لکھ ڈالی ہے۔۔۔" ابی کی آنکھوں میں شرارت

تھی۔ میں تھکا ہوا کالج سے آیا تھا۔ صبح فریج پر اپنا پیغام لکھ گیا تھا کہ " آج مابدولت کی سالگرہ ہے اور جو حضرات اس سلسلے میں تحائف جمع کرانا چاہیں شام تک کرواسکتے ہیں اور ہاں بہنوں کو خیال ہو اور کچھ سپیشل اس سلسلے میں پکا کر کھلانا چاہیں تو بندہ قطعاً مایوس نہ کرے گا۔" اب ظاہر ہے کہ بہنوں کی جان کاہے نہ جل کر رہ گئی ہوگی۔ اسی کا شاخسانہ یہ تھا کہ ہماری بڑی بہن ثروت جنہیں ہم اپی کہتے ہیں کچھ لکھ کر چھیڑنا چاہ رہی تھیں۔ خیر ہمارے ارشاد کہنے سے قبل ہی انہوں نے کلام سے نوازنا شروع کر دیا:

"اجن کی ہے سالگرہ
ڈھول بجاؤ ڈھم ڈھم ڈھم
کرے سنگی چیں چیں چیں
اور مجیرہ ٹنک ٹن
کیک نہ کاٹو کاٹو بھینس
شوق سے بھینس کے کوفتے کھاؤ
اجن کی ہے سالگرہ
دوست جو آئے ہیں ان کے
مجھ کو لگتے ہیں سنکے
بول رہے ہیں بن بن کے
پھر بھی اب کیا کچے بھائی
اجن کی ہے سالگرہ
ڈھول بجاؤ ڈھم ڈھم ڈھم
کرے سرنگی چیں چیں چیں
اور مجیرہ ٹنک ٹن"

میں نے نظم سنی، پہلے تو بگڑنے اور ہنگامہ کرنے کا خیال دل میں آیا کہ نہ صرف میرا بلکہ میرے دوستوں کا بھی اس میں مذاق اڑا دیا گیا تھا، لیکن پھر دفعتاً خیال آیا کہ ہو ہی نہیں سکتا، اپی اور نظم لکھیں؟؟؟

انہیں کبھی ایسا کوئی شوق نہیں رہا تھا۔۔۔ بس پھر ان کے پیچھے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ابو (یعنی ابن صفی) نظر آئے جن کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ ان کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نے یہ راز کھول دیا کہ کس نے یہ نظم لکھ کر اپی کو دی تھی اور پھر ہر ایک نے اس نظم کو پڑھ کر میرا ریکارڈ لگایا۔۔۔ یہ تھے ابو جو ہمارے والد بھی تھے، دوست بھی، استاد بھی اور تربیت کار بھی۔

ان کی شخصیت اور فن پر بہت مضامین موجود ہیں جو محققین اور محبین ابن صفی نے لکھے ہیں اور مسلسل مزید مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ان لکھنے والوں فاضل لوگوں کی صف میں کھڑا ہونے کا اہل نہیں سمجھتا لہٰذا میں نے سوچا کہ دنیا جسے اسرار ناروی اور ابن صفی کے نام سے جانتی ہے ان کی ذاتی زندگی کے کچھ پہلو آپ کے سامنے لے آؤں۔ اس مضمون میں میں انہیں ابن صفی نہیں بلکہ صرف ابو کہہ کر یاد کروں گا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

ابو ایک بہت نرم طبیعت اور اصول پسند آدمی تھے۔ ان کی شخصیت میں ذہانت،
فہم و فراست اور اصول پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھیان کے قارئین اس بات کو فوراً سمجھ لیں
گے کہ وہ بیک وقت فادر ہارڈ سٹون بھی تھے اور عمرانیت کا پیکر بھی۔ عمومی محفل میں لوگ ان کی بارعب شخصیت سے دب جا
کرتے تھے لیکن آپ ان کو ان کے بے تکلف دوستوں کی انجمن میں دیکھ لیں تو ایک سے ایک شگوفہ چھوڑ رہے ہوتے تھے اور
ایسی محفل ان کی موجودگی میں زعفران زار ہی بن جایا کرتی تھی۔ موضوع سنجیدہ ہو تو ان کی ہر بات اس قدر وزن رکھتی تھی اور
ایسی مدلل ہوتی تھی کہ اس سے متفق ہوئے بغیر چارہ نہ ہوتا تھا۔

ہم گھر والوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ ان کی خوش مزاجی ہم
سب کو ان سے بے تکلف ہونے پر اکساتی تھی اور ہم اپنے سب چھوٹے بڑے مسائل
پر ان سے بلا تکلف گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ امّی (اُم سلمیٰ خاتون) ان کی دست راست اور مددگار تھیں۔ یہ بات اس لئے
کہی کہ ابو کو وہ تمام گھریلو مسائل سے دور رکھتی تھیں اور کوشش کرتی تھیں کہ ان کو کسی معاملے میں الجھانا نہ پڑے۔ میرا خیال ہے
کہ اس طرح ابو بغیر پریشان ہوئے اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول ہو سکتے تھے اور یکسوئی سے کام کر لیا کرتے تھے۔ گھر
سودا سلف، دیکھ ریکھ، بچوں کے مسائل یہ سب امی ہی دیکھا کرتی تھیں۔ ابو ان کو چھیڑنے کے لیے اپنے سات بچوں کی
مناسبت سے "ام الخبائث" بھی کہا کرتے تھے، جو رعایتِ لفظی سے اپنی شریکِ حیات کے لیے ایک تعریفی سند بھی تھی۔

ابو ایک یک شخصی ادارہ تھے۔ کتاب لکھنے، کتابت کرانے، چھپائی کے لئے، کاغذ خریدنے، سرورق بنوانے اور چھپوانے
ناول پریس میں چھپوانے، چھپوا کر تقسیم کے لیے، اپنے سول ایجنٹ تک پہنچوانے، ملک بھر میں ایجنٹوں کو بھجوانے کے لیے
ڈاک خانے میں پیکٹس پہنچوانے اور کتابیں پوسٹ کرنے جیسے تمام کام وہ بذاتِ خود انجام دیا کرتے تھے۔ اب سمجھ میں آتا
ہے کہ وہ ان تمام کاموں کے لیے اگر کسی پر انحصار کرتے تو شائد زیادہ تر وقت الجھتے ہی رہتے۔ ان کی اسرار پبلیکیشنز وا
مصروفیات میں ہم بہن بھائی بھی شریک رہا کرتے تھے۔ میں اور مجھ سے پہلے میرے بڑے بھائی ایثار بھائی جان مرحوم ا
ابرار بھائی ایک کام ضرور انجام دیا کرتے تھے اور وہ تھا ایجنٹوں کو پوسٹ کارڈ تحریر کرنا تا کہ وہ روانہ کی گئی ناولوں کے وی
پیکٹ وصول کر کے رقم ڈاک کے ہرکارے کو ادا کر دیا کریں۔ مجھے اس کی عبارت آج تک یاد ہے، "مکر
جناب۔۔۔۔۔۔، آج آپ کے مستقل آرڈر کے مطابق عمران سیریز/ جاسوسی دنیا کے نئے ناول۔۔۔۔۔۔ کی۔۔۔
کاپیاں وی پی روانہ کر دی گئی ہیں۔ وصول کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام مینیجر"

اس مینیجر یل کام کے مبلغ دس روپے ابو سے وصول کرنا مجھے یاد ہے! جب زمانے سادہ تھے مجھے یاد ہے کہ ناولوں کے
پیکٹ بھی گھر ہی میں بنائے جاتے تھے اور امی اور دادی پیکٹوں کو چپکانے کے لیے لئی بھی گھر ہی میں بنا لیتی تھیں۔ یہ سب
شائد اس لیے کہ ناول کی لاگت کم سے کم رہے اور وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ بعد کو ایجنٹوں والے پوسٹ کارڈ
بھی فارم کی صورت چھپوا لیے گئے تھے اور ان پر صرف خالی جگہیں پُر کی جاتی تھیں اسی طرح ناولوں کی تعداد بڑھ جانے کے
بعد دفتری خانے ہی سے پیکٹ بن کر ڈاکخانے پہنچ جاتے تھے۔ البتہ اعزازی کاپیوں کے پیکٹ ابو گھر میں خود ہی بنا لیا کر
تھے اور ان پر پتے بھی خود ہی لکھا کرتے تھے۔ یہ کام ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والی کتابوں کیلیے ہم بھائیوں نے اس
طرح کیا۔ اس کا تذکرہ ابوالخیر کشفی صاحب نے کمالِ محبت سے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا ہے۔

کتابوں کے ٹائٹل اکثر کئی مصور خود سے بنالایا کرتے تھے جو ابو ان کو مناسب قیمت دے کر لے لیا کرتے تھے اور پھر ان ٹائیٹلز کو اپنی کہانی میں اس طرح گوندھ دیتے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کہانی سنا کر مصور سے ٹائٹل بنوایا گیا ہو۔ بہت سے ٹائٹل ایسے ہوتے تھے جو ان کو پسند نہیں بھی آتے تھے مگر وہ انہیں قیمت دے کر رکھ لیا کرتے تھے خواہ بعد کو استعمال نہ کریں۔ ٹائیٹلز کا تذکرہ اس لیے نکل آیا کہ ابو ہم سب میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ہماری ہر کاوش کو سراہا کرتے تھے۔ ابرار بھائی اس وقت ایک طالبعلم ہی تھے جب ان کے تخلیق کردہ ٹائٹلو کراچی ایڈیشنز کی زینت بنے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابرار بھائی کی مصورانہ صلاحیتیں خوب ابھریں۔ اگر وہ ایک انجینیر نہ بن گئے ہوتے تو شائد ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ ضرور بنتے۔ اب بھی ان کا ہاتھ رواں ہے بس سنجیدگی سے اس طرف نہ آئے۔ ان کے ایک اسکیچ پر جس میں ایک موم بتی کے گرد ایک چھپکلی لپٹی ہوئی ہے اور لو پر پروانے رقص کناں ہیں، ابو نے فی البدیہہ شعر کہا تھا جس پر بعد میں ایک غزل بھی ہوئی

" سنبھل سنبھل کے بڑھو روشنی کے متوالو

تہہِ چراغ اندھیرا تمہاری گھات میں ہے!"

ابو خود ایک اچھے مصور تھے۔ ان کے مسودوں پر ان کے اسکیچ جابجا نظر آتے ہیں۔ جب وہ سوچ رہے ہوں یا غور و فکر کی کیفیت میں ہوں تو اسکیچ بناتے رہتے تھے جو سوچ کی مناسبت سے گنجلک ہوتے چلے جاتے تھے۔ عموماً جس صفحے پر بہت تفصیلی اور گنجلک اسکیچ موجود ہوں اسی صفحہ پر کہانی کوئی اہم موڑ لیتی نظر آتی ہے۔ ہماری بڑی بہن نزہت افروز (نزہت سلمان) سرسید کالج میں شعبہ سیاسیات (پولیٹیکل سائنس) میں تھیں اور انہوں نے وہاں سے بی اے میں گولڈ میڈل کے ساتھ ٹاپ کیا تھا۔ ایک بار ایک مینا بازار سرسید کالج میں منعقد ہوا جس میں ان کے شعبہ نے چاٹ اور دہی بڑے وغیرہ کا شال لگایا۔ ابرار بھائی نے اس کے لیے پوسٹر بنایا جسے دیکھ کر ابو نے ایک شعر کہا جو پوسٹر پر درج ہوا اور پھر مینا بازار میں بہت مقبول بھی ہوا۔

اس سمت آیئے یہ سیاست کی چاٹ ہے

" چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

ابو کی اصول پسندی کے کئی واقعات ہیں مگر جو ہمارے ذہنوں پر نقش ہیں ان میں سے چند ایسے ہیں جو دلوں پر نقش رہیں گے۔ ہمارے بڑے بھائی ایثار احمد صفی مرحوم نے ایف ایس سی کے امتحانات پری میڈیکل گروپ سے دیے لیکن ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے درکار نمبروں سے کچھ کم نمبر حاصل کیے۔ اس وقت سندھ کے صوبائی وزیر تعلیم عبدالوحید کٹپر صاحب تھے۔ ان تک یہ معاملہ کسی نے پہنچادیا۔ وہ خود ابو کے پرستار تھے، انہوں نے کہلا بھیجا کہ ابن صفی صاحب اگر آ کر مل لیں تو یہ کام تو وہ خود کرا دیں گے۔ اطلاع پہنچانے والے صاحب نے دن تاریخ طے کر کے ابو کو بتا دیا کہ میں خود لے چلوں گا۔ جس دن یہ ملاقات طے تھی ابو اس سے پچھلی رات سوئے نہیں اور ساری رات ٹہل ٹہل کر گزاری امی پریشان ہوئیں تو کہا کہ میں نے کبھی کسی وزیر سفیر کے یہاں حاضری نہیں لگائی نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ امی سمجھ گئیں کہ بھائی جان کا مستقبل بھی سامنے ہے اور عزتِ نفس کا سوال بھی ہے۔ انہوں نے ابو کو تسلی دی اور کہا آپ سویئے، کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ اللہ مالک ہے وہ بہتر انتظام کرنے والا ہے۔ ابو کو گویا قرار آ گیا اور اگلے دن انہوں نے انہی صاحب کے توسط سے معذرت کر لی۔ اسی معاملے میں ایک اور کرم فرمانے اطلاع پہنچائی کہ سیٹ اور داخلہ ایک طے شدہ رقم دے کر خریدے جاسکتے ہیں، آپ

اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو کیا جواب دیا گیا ہوگا۔ بعد میں ابو نے اس سے کہیں زیادہ خرچہ اٹھا کر ایثار بھائی جان کو اٹلی بھجوایا جہاں سے انہوں نے لا سپینزا یونیورسٹی روم سے ایم ڈی کی سند حاصل کی وہاں پر بھی پریکٹس کی پھر پاکستان آ کر آخری دم تک ایک ہسپتال میں خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ ایک فلاحی ہسپتال میں رضا کارانہ طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

نزہت باجی کی شادی سن انیس سو اٹھتر میں ہوئی جب حکومت کی طرف سے شادی کی تقریبات میں کھانا کھلانے پر نئی نئی پابندی عائد ہوئی تھی۔ صرف ریفرشمنٹس اور ماکولات کی اجازت تھی۔ ابو کھانے کا انتظام کر چکے تھے۔

ایسے میں ہمارے محلے میں رہنے والے ایک سیشن جج صاحب نے ابو کو پیشکش کی
تھی کہ وہ اپنی تقریب میں بلاخوف وخطر کھانے کا بندوبست کرلیں کوئی پولیس والا شادی ہال کے قریب نہ پھٹکے گا۔ ابو نے شائستگی کے ساتھ ان کی پیشکش
کو رد کر دیا تھا کہ وہ قانون شکنی نہ کریں گے۔ لہٰذا اس تقریب میں جو اس وقت کے لحاظ سے ایک ہزار مہمانوں پر مشتمل بڑی تقریب تھی صرف سموسے، چپس، پھل اور سافٹ ڈرنکس ہی پیش کیے گئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کے احترامِ قانون کا اظہار ہوتا ہے۔

میرے اپنے بچپن میں کچھ ایسے واقعات ہیں جنہوں نے میری ذہنی تربیت کی غالباً پہلے بھی کہیں درج کر چکا ہوں مگر دہرا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک بار جب میں بہت ہی چھوٹا تھا کسی بات پر ناراض ہو کر امی پر چپل اُٹھائی تھی انہوں نے ابو کے آنے پر معاملہ ان کے گوش گزار کر دیا تھا۔ ابو نے ہم بچوں میں سے کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ یہ کام انہوں نے امی پر چھوڑ دیا تھا جو ڈانٹ بھی دیتی تھیں اور حسب ضرورت جوتے کاری بھی کر دیتی تھیں۔ لیکن اگر کبھی ابو کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہو گیا اور ابو سنجیدہ ہو گئے تو گھر بھر کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ ابو نے مجھ سے کہا کمرے میں چلے آؤ، اور دروازہ بند کر دیا۔ باہر بہنیں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں کہ شائد آج پٹائی ہو ہی جائے۔ ابو نے مجھے سامنے بٹھا کر صرف اتنا کہا، "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" یہ جملہ اس قدر زور سے میرے دل پر لگا کہ میں زور زور رونے لگا۔ باہر سب سمجھے کہ میری واقعی پٹائی ہو گئی۔ شائد وہ میری پٹائی کر دیتے تو مجھ پر وہ اثر نہ ہوتا۔ اس واقعہ کے بعد ساری زندگی کبھی پلٹ کر امی کی کسی بات پر ایک لفظ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسی طرح ایک بار وہ گاڑی سے اتر رہے تھے اور میں سڑک پر بائسکوپ کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک ریڑھے پر فلمی پوسٹرز کا شو ہوتا تھا جو عموماً ایک آنے میں اس وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ آنکھیں ایک لینز سے لگا دیتے تھے اور تماشا دکھانے والا باہر سے رسی کھینچ کھینچ کر پوسٹرز بدلتا رہتا تھا۔ ابو نے دیکھا کہ میں تماشے میں مصروف ہوں اور میرا چھوٹا بھائی افتخار اور چھوٹی بہن محسنہ پاس ہی کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں فارغ ہوا تو ابو نے گھر میں آنے کا اشارہ کیا۔ اندر آنے پر مجھ سے کہا کہ تم نے اکیلے تماشہ دیکھنا کیسے گوارہ کیا کہ جب تمہارے بھائی بہن حسرت سے تمہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے عذر پیش کیا کہ میرے پاس ایک ہی آنہ تھا۔ انہوں نے کہا، "تب تو انہی کو دکھانا چاہیئے تھا۔" میری شرمندگی کا حال نہ پوچھیئے۔ اس کے بعد سے مجھے سبق ملا کہ اگر وسائل محدود بھی ہوں تو پہلے دوسروں کا خیال کرو پھر اپنی فکر کرو۔ بڑے ہونے پر میں نے سوچا کہ ابو کیلیے اس وقت کیا مشکل تھا کہ دو آنے جیب سے نکالتے اور افتی اور موشی کو بھی تماشہ دکھا دیتے مگر ایسا کرنے سے میری

تربیت کا وہ موقع ہاتھ سے نکل جاتا جس نے میرا انداز فکر ہی بدل ڈالا۔ واضح رہے کہ وہ ہم بچوں کی جائز خواہشات اور تفریحات کا خیال بھی رکھتے تھے اور ان کے لیے خرچ بھی کرتے تھے۔

ایک اور واقعہ سنا کر مضمون کو ختم کرتا ہوں جو شائد زیادہ ہی طویل ہو گیا۔ مگر ذکر ان کا ہو تو سمیٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ محلے میں ایک عمر رسیدہ دودھ والے چاچا غنی صاحب تھے جو اپنے بھتیجوں کے ساتھ دکان چلاتے تھے۔ یہ غیر شادی شدہ تھے۔ محلے کے شریر لڑکوں نے اور نگی ٹاؤن کی ایک مہاجر بیوہ سے ان کی شادی طے کرادی۔ بس پھر کیا تھا لڑکوں کے ہاتھ ایک تفریح آ گئی روز سڑک پر ان کی ڈھولکی ہوا کرتی تھی۔ سرِ شام سے اکٹھے ہو کر دیر گئے تک ریکارڈنگ ہوتی اور چاچا غنی کے نام کے بھنگڑے ڈالے جاتے۔ ایسی ہی ایک شام ہمارے ابرار بھائی بھی لڑکوں کے ساتھ سڑک پر محوِ رقص تھے۔ ابو گاڑی میں گھر کی طرف جا رہے تھے گاڑی رُکوا کر ابرار بھائی کو گھر آنے کا اشارہ کیا۔ ابرار بھائی آئے تو ابو ناراض بیٹھے تھے پوچھا یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ یہ شرفاء کا طریقہ نہیں کہ سڑکوں پر ناچیں۔ ابرار بھائی نے سر جھکایا مگر ساتھ ہی کہا" ہم خود ناچ رہے تھے، شرفاء تو کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اسے نچواتے ہیں۔" ابو نے یہ جواب سنا تو سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہ،" میں غلط تھا، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم نے اپنے دور میں اس شرافت کے خلاف بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ جاؤ جا کر انجوائے کرو۔ تم اور تمہارے دوست درست کر رہے ہیں۔" اس واقعہ نے ہم سب کے ذہن پر یہ اثر مرتب کیا کہ آج بھی اپنے سے چھوٹوں کی بات سنتے ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں کہ نجانے کس وقت کہاں سے درست رائے مل جائے۔ اپنی رائے کو حتمی سمجھ کر بے جا طور پر دوسروں پر مسلط نہیں کرتے۔

ابو نے اپنے عمل سے ہماری تربیت کی اور ہماری دعا ہے کہ ہم ان کو کبھی شرمندہ نہ کرائیں۔ اس میں ہمارے ساتھ آپ سب پڑھنے والے شامل ہیں کیونکہ ان کی تحریروں کی وجہ سے ہم اب تک ان کی نصیحتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں اور تربیت کا باب ہم سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ انہیں اپنی بہترین دعاؤں میں یاد رکھیے۔

.....☆☆.....

سید اسد عادل

محترم ابن صفی کے قلم کا سفر غالباً 1951ء سے شروع ہوا ہے شاید میں کچھ غلط لکھ گیا ہوں دراصل سفر نہیں ایک نئے کی ابتدا ہوئی اب ابن صفی کسی شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عہد کا استعارہ بن چکا ہے ابن صفی نے جب قلم سنبھالا اس وقت لکھنے والوں یا ناول نگاروں کی ایک بھیڑ تھی جو بھیڑ چال چل رہی تھی وہی لگے بندھے جملے وہی لگے بندھے مکالمے منظر نامے اور قاری کی دلچسپی کے لیے بے ہودہ اور فحش نگاری کی جا رہی تھی یوں تو اردو ناول کی ابتدا کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے جو ان کے ناول مراۃ العروس سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد ایک طویل سلسلہ ہے جو پریم چند تک پہنچتا ہے ان کے بعد ہی ناول کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آئی اور ناول اخلاق سوز ہوتا چلا گیا اس ہی دور پرفتن میں ابن صفی نے ایک مجدد بن کر اپنے قلم کا علم بلند کیا وہ اس میدان غلاظت میں اترے تا کہ معاشرے میں پھیلی ایک کریہہ رسم تحریر کو غلط اور غلیظ ثابت کر کے اس سے پڑھنے والوں کو نجات دلائی جا سکے یقیناً یہ ایک بڑا چیلنج تھا جسے انہوں نے نا صرف سچ ثابت کر دکھایا بلکہ لوگوں میں اردو پڑھنے اور سمجھنے کا شعور اور شوق بھی پیدا کیا ہندوستان یعنی بھارت جہاں اردو دم توڑ رہی تھی کسی قریب المرگ مریض کی مانند ایڑیاں رگڑ رہی تھی کو ابن صفی کے قلم نے سہارا ہی نہیں دیا بلکہ نئی زندگی بھی دی بھارت میں تمام پڑھے لکھے لوگوں، اشاعتی

اداروں نے اردو نستعلیق کی جگہ دیوناگری رسم الخط اپنا لیا تھا ابن صفی کے ناول اس اندھیری کال کوٹھڑی میں روشنی کی کرن بن کر سامنے آئے ان کے جادو اثر قلم نے وہ کر دکھایا جو اس وقت کے جغادری لکھاری سوچتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ابن صفی کے عہد نے نا صرف قارئین میں اردو ناول پڑھنے کا ذوق پیدا کیا اور معاشرے سے قلم کی گندگی کا صفایا بھی کیا اب ابن صفی کوئی نام نہیں ایک عہد ہے جوان کے پڑھنے والوں کے درمیان قانون کی پاسداری، فحش لغویات سے دوری و اجتناب بڑوں کی عزت و احترام کیسے کرنا ہے اور اپنے اردگرد سے کیسے ہوشیار ہوتے ہوئے معاشرے کے سلگتے ناسوروں جرائم پیشہ افراد سے کیسے نمٹنا ہے اور اپنے اخلاق اپنے آپ کو کیسے سنبھالنا ہے۔

اب آتے ہیں ابن صفی ایک رجحان ابن صفی نے جو بھی لکھا جیسا بھی لکھا وہ اس بات کی گواہی ہے کہ انہوں نے خوب بہت خوب لکھا آج ابن صفی کی پہلی تحریر کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کا اثر آج بھی اسی طرح محسوس کیا جا رہا ہے جیسا کہ اس وقت جب وہ تحریر لکھی گئی تھی ان کی تحریر کا یہی حسن اور خوبی ہے کہ وہ وقت کے گرداب میں کہیں گم نہیں ہوئی اس کے پڑھنے والے اب بھی اس سے اس ہی طرح محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے ہیں جو ابن صفی کے رجحان کا منہ بولتا ثبوت ہے اس ہی رجحان نے ان کے بے پناہ پیروکار پیدا کیے (میں نقال نہیں لکھ رہا) جنہوں نے ان کے کرداروں کے ساتھ جو بھی کیا جیسا بھی کیا وہ اپنی جگہ لیکن وہ تمام ہی لکھنے والے کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیتوں کے باوجود ابن صفی کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے بقول کئی لوگوں کے مکھی پہ مکھی مارنے کے باوجود وہ اپنے قلم کے جوہر اس طرح نہیں دکھا سکے جیسا کہ ابن صفی دیکھا گئے کسی بھی لکھنے والے کی پیروی اس وقت ہی ممکن ہے جب نئے لکھنے والے اور شائع کرانے والے کو یہ یقین ہو کہ وہ اگر ابن صفی کی پیروی کرے گا تو ضرور پسند کیا جائے گا کامیاب ہو جائے گا ورنہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گا، اسی باعث ابن صفی صاحب کے پیروکاروں کے بھی پیروں کار سامنے آتے چلے گئے (یعنی نقال در نقال) یقیناً ابن صفی صاحب نے اپنے قلم کے جادو سے اردو دنیا کو خصوصاً ایک رجحان بخشا ہے وہ ایک رجحان ساز شخصیت کے حامل تھے اگر میں یوں کہوں کہ وہ جدید ناول کے مجدد تھے تو غلط نہ ہوگا ناول کی جس جہد کو ڈپٹی نذیر احمد نے روشناس کیا تھا (پاکیزہ و با اخلاق) اسے ابن صفی نے از سر نو نا صرف زندہ کیا ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔

ابن صفی کو قلم سنبھالے نصف صدی سے زیادہ تقریباً چھیاسٹھ برس گزر چکے ہیں ان کی تمام تحریریں آج بھی زندہ جاوید ہیں وہ اسی طرح پر اثر دلچسپی لیے ہوئے ہیں جیسا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال قبل دلچسپ تھیں جبکہ ان کے تمام ہم عصر ناول نگار جنہوں نے بے پناہ لکھا صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہوئے ہیں اپنے وقت کے بڑے بڑے اور اہم نام آج گمنام ہو چکے ہیں جبکہ اس

بھیڑ کو چیر کر سامنے آنے والا اپنے قلم کو تیشہ بنا کر لکھنے والا آج بھی اسی طرح مقبول اور ہر دل عزیز ہے اور خوب پڑھا اور سمجھا جا رہا ہے اللہ ان کے پڑھنے والوں ان کے چاہنے والوں اور محبان ابن صفی کو سلامت رکھے اور قدم قدم کامیابیوں سے ہمکنار کرے، آمین۔

.....☆☆.....

ابن صفی ایک عہد ساز ادیب

گل مہر

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ تجھ کو پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شاعر نے یہ شعر شاید ایسے ہی کسی بے مثال ماہرِ فن کے لئے ہی کہا ہوگا کہ جن کا نام سنتے ہی بقول فیض۔

پھر نظر میں پھول مہکے
دل میں پھر شمعیں جلیں

والی کیفیت طاری ہو جائے، اگر بات اُردو ادب میں جاسوسی ناول نگاری کے حوالہ سے کی جائے تو اِس میدان میں ایک ہی نام ایسا ہے جو آج بھی روزِ اول کی طرح پوری آب و تاب اور توانائی سے آفتاب کی مانند جگمگا رہا ہے، اور وہ کوئی اور نہیں صرف اور صرف ابنِ صفی ہیں۔

کتنے ہی لوگوں نے اُن کے رنگ کو اپنانا چاہا، اُن کے انداز کی تقلید کرنا چاہی مگر کر نہ پائے، آج بھی اگرچہ بہت سے لوگ اُن کے کرداروں پہ کہانیاں لکھ رہے ہیں، اُن کے دکھائے ہوئے راستے پہ چل کے روٹی روزی کما رہے ہیں مگر ابنِ صفی کے رنگ کی تابانی آج بھی روزِ اول کی طرح قائم ہے، جاسوسی ناول اُردو ادب کا ایک نہایت اہم اور مقبول شعبہ ہے، مجروح سلطان پوری کے بقول۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ابنِ صفی سِرّی ادب کا ایک ایسا نام کہ جو اپنے میدان میں یکتا ہے، جاسوسی ناول نگاری کی دُنیا کے آسمان کا آفتاب کہ جس کے سامنے کتنے ہی لوگ آئے مقابلے کی ٹھان کے مگر ایک بھی نہ ٹک پایا۔

ایسا نہیں تھا کہ ابنِ صفی سے پہلے اُردو ادب کی دُنیا میں جاسوسی ناول نگاری کا خانہ خالی تھا، ابنِ صفی سے پہلے کئی لوگوں نے اس نئے شعبہ میں طبع آزمائی کی، جیسے کہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری، ظفر عمر، مگر ایک تو اُن لوگوں کے ناول طبعزاد نہیں تھے دوسرے کسی اور معاشرے کی کہانی کو لاکھ اپنے ماحول کے رنگ میں ڈھالا جائے وہ لطف ہرگز نہیں آسکتا جو آپ کے اپنے اِردگرد کے ماحول کی کہانی کا ہو سکتا ہے، یعنی وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

ابنِ صفی میں لکھنے لکھانے کا جوہر خُدا داد تھا اور جس میں لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اُسے پڑھنے سے بھی شغف ہوتا ہے اور ویسے بھی مطالعے کے بغیر لکھا جا ہی نہیں سکتا، سو ابنِ صفی نے بھی اُس دور کا دستیاب ادب پڑھا اور اُس میں موجود کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا، دراصل مغربی ماحول مشرقی ماحول سے اور خاص طور پر اُس زمانے کے مشرقی ماحول سے بے حد مختلف تھا، مشرقی ماحول میں اُس بے باکی کا قطعی تصور نہیں تھا جو اُس وقت بھی مغربی ماحول کا حصہ تھی۔

اُن ناولوں کے مطالعے سے ابنِ صفی اِس نتیجے پہ پہنچے کہ جاسوسی ناول لکھنا، قلم آزمائی کے لئے، ایک وسیع میدان ہے اور یہ شعبہ گویا اُن جیسے کسی جوہرِ قابل کی تحریروں کا ہی منتظر ہے، پس اُنھوں قلم اُٹھایا اور اپنا پہلا ناول دلیر مجرم لکھ دیا، جو کہ قارئین اور بطورِ خاص سِرّی ادب کے قارئین کے لئے بہار کے تازہ اور خوشگوار جھونکے کی مانند تھا۔

یہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ابنِ صفی جب ابنِ صفی نہیں صرف اَسرار احمد تھے تو اُنھوں نے شاعری کے شعبہ میں بھی طبع آزمائی کی، اگر وہ ناول نگاری کی طرف نہ آتے اور شاعری کے میدان میں ہی مشقِ سخن کرتے

رہتے تب بھی اُن کا نام بامِ عروج پر ہوتا، کیونکہ اُن کا فنی جوہر تھا ہی اِتنا توانا، اور سچ تو یہ ہے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خُدا بخشندہ

شاعری اُن کا شوق تو تھا اور اِس فن کی صلاحیت اُن میں اللہ کی عطا کردہ تھی، لیکن وہ جو کچھ اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتے تھے اُس کے لئے شاعری کا عروض اور بحروں کی پابندیوں میں جکڑا ہُوا فن ناکافی تھا اِس بات کو غالب نے یُوں بیان کِیا ہے۔

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مِرے بیاں کے لیے

اور ہونا یہ تھا کہ سِرّی ادب کی دُنیا کی شہنشاہیت کا تاج اُن کے ہی ہاتھوں سر ہونا تھا، لہٰذا وہ آج بھی اِس اقلیمِ فن کے اپنے انداز کے واحد تاجدار ہیں۔

اُن کی تحریر کے محاسن کا جائزہ لیا جائے تو بُہت سی وہ خُوبیاں ملیں گی جو دُوسرے لکھنے والوں کے یہاں نہیں، یا کم از کم اُن کے انداز جیسی نہیں، اگر اِن سب پہ بات کی جائے تو گفتگو خاصی طویل ہو سکتی ہے جس کے لئے اِس مضمون کا دامن بُہت مختصر ہے۔

اُن کی تحریر کی خُوبیوں پہ بُہت کُچھ کہا گیا ہے اور تقریباً ہر پہلو پہ ہی اِظہارِ خیال ہُوا ہے، مگر ہم اُن کی تحریر کے اُس پہلو پہ بات کریں گے جو کہ ہم سمجھتے ہیں بُہت زیادہ زیرِ بحث نہیں آیا، اور وہ اُن کی تحریر کی لازوال اور بے مِثال خُوبی ہے، اور وہ ہے اُن کی تحریروں کا عریانیت اور فحاشی سے پاک ہونا۔

ابنِ صفی سے پہلے اردو کے اکثر ناولز اور خاص طور پہ وہ ناولز جو انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کئے جاتے تھے اُن میں ایک بڑا عُنصر بے باکی اور فحاشی کا ہُوا کرتا تھا، ایسے ناول ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے تھے، بیشک اُن میں سے اکثر ناولز کے پلاٹ کمزور بھی ہُوا کرتے تھے، مگر بے باک اور عریاں منظر نگاری کے باعِث ایک ڈھکے چُھپے اور روایتوں کی زنجیروں میں بندھے مُعاشرے کے نوجوانوں کو اپنی طرف راغِب کرتے تھے، بیشک یہ اُن کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے مگر مشرقی تہذیب سے قطعی طور پر مُتصادم تھے، کیونکہ ہمارے مُعاشرے میں یہ چیز آج بھی پسندیدہ نہیں اور نہ ہماری تہذیب اور روایات ہمیں اِن باتوں کی اِجازت دیتی ہیں کہ حسن وعشق کے معاملات کو اس حد تک بیان کیا جائے کہ وہ ہوس تک جا پہنچیں، اِس لئے ایسے ناولوں کے قارئین کو یہ کُتب چُھپ چُھپا کے پڑھنا پڑھتی تھیں مُبادا کوئی دیکھ لے اور دیکھنے والے پر اُن کا تاثر خراب پڑے۔

ابنِ صفی نے اِس بات کو بُہت گہرائی میں جا کے سمجھا، اور سوچا کہ ایسا ادب کیوں تخلیق کیا جائے جو صِرف کِسی مخصوص گروہ تک محدُود ہو، ایسا کچھ کیوں نہ لکھا جائے جو گھر کے سب افراد کے سامنے بلاجھجک پڑھا جا سکتا ہو۔

تب اُنھوں نے وہ ادب تخلیق کِیا جس کے کِردار ایک مِثالیہ بن گئے، اگرچہ کچھ ایسے کِردار بھی اُن کے ناولوں میں نظر آتے ہیں جو بظاہر عاشق مِزاج ہیں، مگر وہ ایک حد میں رہ کر ہی عِشق کرتے ہیں، اور بسا اوقات تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ عِشق ہے ہی نہیں فقط تفریحِ طبع کے لئے دل لگی ہے، جیسا کہ غالب نے کہا۔

"چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد"

اور اس دل لگی میں بھی کردار کی پاکیزگی متاثر نہیں ہوتی، اس کی مثال حمید کا کردار ہے جو شوخ ہے، کھلنڈرا ہے، خواتین کی صحبت پسند کرتا ہے، مگر کبھی بھی ہوس کے ارذل جذبے کے ہاتھوں بے بس نہیں ہوتا، دوسری طرف فریدی جیسا عورت بیزار شخص ہے، جس کی زندگی میں عورت نام کی رنگینی کا عمل دخل تو دور کی بات تصور بھی نہیں، عموماً دیکھا گیا ہے کہ عورت بیزار لوگ درشت مزاج اور غصہ ور قسم کے ہوتے ہیں، مگر فریدی کے مزاج میں شگفتگی کا عنصر بدرجہ اُتم موجود ہے، وہ آرٹسٹک مزاج کا ہے، مصوری اور سنگ تراشی جیسے فنونِ لطیفہ سے بھی بہرہ ور ہے، عورت بیزار ہونے کے باوجود وہ خواتین کا حد درجہ احترام کرتا ہے، اور کبھی اُن سے بدتمیزی سے پیش نہیں آتا، بلکہ اُن سے پورے ادب و احترام کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور اُن کی تمام تر بات توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتا ہے۔

پھر ہے ہمارا پیارا سا کھلنڈرا عمران جو بیک وقت ایک معصوم بچہ بھی ہے، اور وقت پڑنے پر مجرموں کے لئے بے حد خطرناک بھی، کردار اُس کا بھی بے داغ اور اعلیٰ ہے، ان تینوں ہیروز کی مثال ہم نے اِس لئے دی کہ اگرچہ یہ تینوں بظاہر ایک دوسرے سے مزاجاً خاصے مختلف ہیں، مگر کردار کی بلندی تینوں کا امتیازی وصف ہے اور کبھی بھی انھوں نے اپنے کردار کی پاکیزگی پر حرف نہیں آنے دیا۔

یہی ابنِ صفی کی تحریر کا وہ اِمتیازی وصف ہے، جس کے باعث وہ اتنی دہائیاں گزر جانے کے باوجود لاکھوں قارئین کے محبوب مصنف ہیں اور شاید اِسی بات کی طرف اُنھوں نے اِشارہ کیا تھا جب ایک مرتبہ ضیا محی الدین شو میں ان سے ضیا صاحب نے سوال کیا کہ کتابوں کی الماری میں آپ کی کتابوں کی جگہ کہاں ہے، تو ابنِ صفی نے بہت مدھم مگر بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ میری کتابوں کی جگہ بستر کے سرہانے کی میز ہے تاکہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کے اُٹھا لیں اور پڑھ لیں، الماری میں تو وہ کتابیں رکھی جاتی ہیں جو کبھی کبھار پڑھی جائیں۔

سوچئے تو کتنی زبردست بات کہی اُنھوں نے، واقعی جو کتاب آپ ہر وقت پڑھ سکتے ہوں وہ یقیناً ایسی ہی ہوگی جسے آپ سب کے سامنے بلا جھجک پڑھ سکتے ہیں، اِس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ عریانیت اور فحش بیانی سے پاک ہے۔

ابنِ صفی کی تحریریں محض تفریحِ طبع یا وقت گزاری کا ذریعہ نہیں، بلکہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں اِس انداز کے کرداروں کو پیش کر کے قارئین خصوصاً نوجوان نسل کی اعلیٰ اخلاقی تربیت بھی کی ہے اور پڑھنے والوں تک یہ پیغام بھی پہنچایا کہ عورت نہ تو کوئی حقیر مخلوق ہے نہ ہی ناکارہ جنس ہے، بلکہ مرد کی طرح ہی ذہین اور باصلاحیت ہے، اس بات کو جولیا کے کردار سے بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایکس ٹو کی نائب یا ایکس ٹو کی نمبر دو کے طور پر اہم ذمہ داریاں ادا کرتی ہے، اور کئی دیگر سیکرٹ ایجنٹوں جیسے صفدر، تنویر اور چوہان وغیرہ سے اس کا عہدہ بڑا ہے۔

ایک جولیا ہی نہیں، ابن صفی کے ناولوں میں جو عزت و تکریم خواتین کو دی گئی ہے اس کی شاندار مثال روشی، نیلم اور رشیدہ جیسی بہت سی لڑکیاں ہیں، جو مردوں کے دوش بدوش شانہ سے شانہ ملا کر کھڑی نظر آتی ہیں، اور وہ کسی طرح بھی مردوں سے کم نہیں۔

ابنِ صفی کے رنگ میں جتنے لوگوں نے بھی لکھا یا لکھنے کی کوشش کی اُنھیں مقبولیتِ عام کا وہ درجہ نہ مل سکا جو ابنِ صفی کو آج بھی حاصل ہے۔

نہ ہُوا پر نہ ہُوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اگرچہ اُن کے مُقلدین، بلکہ اُنھیں نقال کہنا زیادہ مناسب ہوگا نے بھرپور کوشش کی کہ اُن کے کرداروں کو اُن کی دی گئی صفات سے متصف کر کے کہانی کا تانا بانا بُنیں، مگر ناکام رہے، کسی نے عمران کو عقلمند احمق بنانے کے چکر میں چھچھورا بنا ڈالا، تو کسی نے شُستہ ہنسی مذاق کے بجائے بےتکی و بھونڈی گفتگو کو اِس قدر طول دیا کہ پڑھنے والے باذوق لوگوں کی طبیعت ہی اُکتا گئی، اِسی طرح فریدی کی عورت بیزاری کو یوں نمایاں کیا گیا کہ اُس کے کردار کی دیگر خوبیاں دفن ہو کر رہ گئیں، وہ عورتوں سے اپنی بیزاری چھپانے کی کوشش ہرگز نہیں کرتا، جیسا کہ ابنِ صفی نے ہمیشہ دِکھایا، نقالوں کے ناولوں میں اس کی عورت بیزاری اِس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ خواتین کے کے ساتھ درشتی سے پیش آتا ہے، یقیناً ابنِ صفی نے فریدی کو ایسا نہیں سوچا تھا، نہ ہمارے سامنے اُسے ایسا پیش کیا، اِن کرداروں کو اِس رنگ میں دیکھ کر ابنِ صفی کے چاہنے والوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، اُن کی زندگی میں بھی اگر اُن سے شکایت کی جاتی کہ کچھ لوگ اُن کے کرداروں پر کہانیاں لکھ رہے ہیں اور وہ چھپ بھی رہی ہیں اس لئے آپ اس سلسلے میں کچھ کریں، تو وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے تھے، اور کہتے کہ اگر اِس طرح وہ نقال چار پیسے کما لیتے ہیں تو کیا حرج ہے، بلکہ مجھے اپنے ان کماؤ پوتوں (فریدی، عمران اور حمید) پر فخر ہے جو اُن کا پیٹ پال رہے ہیں۔

ایک دفعہ وہ بہت شگفتہ موڈ میں تھے جب یہ بات اُن کے سامنے کہی گئی کہ اب تو لوگ اُن کے نام سے ملتے جلتے نام سے ناول چھپوا رہے ہیں تو اُنھوں نے ازراہِ تفنن کہا ہاں بس اب تو ایک ہی قافیہ رہ گیا ہے اور وہ ہے ابنِ خصی، یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ابنِ صفی کے کرداروں میں اُن کے اپنے ذاتی کردار کی خوبیاں جھلکتی ہیں، یعنی کہ بلند کرداری، خوش طبعی اور ذہانت وغیرہ، جیسا کہ ایک کہاوت ہے کہ جو کچھ برتن میں ہے وہ ہی باہر آئے گا تو ایک اچھے کردار کا ادیب ہی اچھی تحریر لکھے گا۔

ابنِ صفی کو مرحوم کون کہے گا......؟ جب تک ہم سب کے محبوب کردار، احمق و شرارتی عمران، بذلہ سنج و حاضر جواب حمید اور نرم گفتار و خاموش طبع مگر بہترین فنونِ لطیفہ سے متصف فریدی ہم سب کے دِلوں میں زندہ ہیں ابنِ صفی بھی اپنے کرداروں کی بدولت ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، اُن کے لازوال کرداروں نے اُنھیں ہمیشہ کی زندگی بخش کر انھیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

اجل بھی اُس کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساسِ زندگی ہو جائے

ابنِ صفی کے بارے میں کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے، مگر آخر میں مختصراً ہم اِتنا ہی کہیں گے کہ وہ کل بھی اپنی مِثال آپ تھے اور آج بھی کوئی ادیب اُن کے فن کا جواب پیش نہیں کر سکا، اور یہ مصرعہ اُن کے لئے بالکل حسبِ حال ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

......☆☆......

ابن صفی ایک ہمہ جہت شخصیت

تحریر: ایمانے زارہ شاہ

اردو سرّی ادب کا جب بھی تذکرہ ہوگا "ابنِ صفی" کے ذکر کے بغیر اتنا ہی ادھورا اور نامکمل ہوگا جتنا چاند کے بغیر آسمان......!!

میری ابن صفی سے شناسائی تو اتنی پرانی نہیں ہے لیکن یہ نام گھر میں برسوں سے سنائی دیتا رہا ہے، اس لیے اسرار احمد کے اسرار جانے پہچانے ہیں "عمران سیریز" کا نام تو بچے بچے کو ازبر ہے (بس مجھ سے بڑے ابھی تک نہیں پڑھ پائے.......... نالائقی کی انتہا)...... ہمیں اب جیسے ہی موقع اور وقت ملا ہے تو ہم بھی "جاسوسی دنیا" کو چاٹنے وحفظ کرنے میں مگن ہوگئے ہیں.......... مگر ہنوز دلی دوراست..!

ابن صفی نے تھکے ہوئے ذہنوں کیلئے صحت مند تفریح مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لوگوں میں کچھ نہ کچھ پڑھتے رہنے کی عادت ڈلوائی ہے، اس کے علاوہ برصغیر میں ریڈنگ لائبریریوں (LibrariesReading) کارواج ابن صفی ہی کا کارنامہ کہا جاتا ہے (مجھ جیسے کتابی کیڑوں کو اسکی افادیت کا اندازہ ہے)

آج کا قاری اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زندگی میں بھی ابن صفی کا ناول ایک ہی نشست میں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ کمال کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہیں ہے، (کم ازکم میرا اپنا تو یہی حال ہے، جب بھی ان کا کوئی ناول پڑھنے لگتی ہوں تو اس دوران دنیا ومافیہا سے غافل ہو جاتی ہوں)

کچھ عرصہ قبل جاسوسی ادب سے متعلق ایک آرٹیکل نظروں سے گزرا تھا کہ اردو سری ادب میں طبع زاد لکھنے والوں میں نہ ابن صفی سے پہلے کوئی تھا نہ ان کے بعد ہے، امریکی وانگریزی ادب کی مترجم شدہ کہانیوں کو اپنے ماحول میں ڈھال کر شائع کرنا کوئی کارنامہ نہیں ہے...... ایسے میں ابن صفی کا برصغیر کے ماحول کے مطابق جاندار پلاٹ، دلچسپ زبان ومنظر نگاری کے مطابق لکھنا انہیں فن کی بلندیوں پہ لے گیا۔

1952 میں جاسوسی دنیا کے پہلے ناول دلیر مجرم سے جو آغاز ہوا وہ بڑھتا ہی چلا گیا...... ابن صفی اٹھائیس برس تک اپنے قلم کا جادو جگاتے رہے، ان کا کوئی ہم عصر ان جیسی بلندی اور سرفرازی حاصل نہ کرسکا، ان کے خیالی کردار زندہ جاوید ہو گئے، جن کے ناولوں کا گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور صدر ایوب خان بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے رہے ہوں وہ بلاشبہ اردو کے سری ادب کے بے تاج بادشاہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

کہتے ہیں کہ پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو ان کے ناول بہت پسند تھے اور اپنے جاننے والوں سے ابن صفی کے نئے ناول کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے، نیا ناول شائع ہو چکا ہوتا تو اسے مارکیٹ سے منگواتے اور پڑھنے کے بعد نہایت اہتمام سے ان ناولوں کو اپنی کتابوں کے شیلف میں جگہ دیتے تھے، پہلے وہ اگاتھا کرسٹی، پیٹر چینی اور انگریزی کے دوسرے ناول پڑھتے تھے، مگر بعد میں انہیں چھوڑ دیا، وہ کہا کرتے تھے۔ "ابن صفی مجھے خاص طور پر اس لئے پسند ہے کہ وہ نیک نیتی سے لکھنے والا ہے، وہ مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ اس نے اردو ادب کو انگریزی ادب کے برابر لا کھڑا کیا ہے اور کہیں کہیں تو اس کا قد غیر ملکی لکھنے والوں کے مقابلے میں نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔"

ابن صفی شاعری، مزاح نگاری، طنز نگاری، ناول، افسانہ اور سراغ رسانی میں تو ید طولی رکھتے ہی تھے اس کے ساتھ ساتھ مصوری میں بھی ان کو خاصا درک حاصل تھا، ان بنائے ہوئے کچھ خاکے ان کے شعری مجموعہ متاع قلب ونظر کے سرورق کی زینت ہیں.....!

وہ کہتے ہیں نا کہ برگد کے سائے میں کوئی دوسرا درخت پنپ نہیں سکتا اسی طرح ابن صفی کے سامنے کوئی اور نام ٹک نہ سکا.....وہ اپنی مثال آپ تھے..!!

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے

اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے..... آمین۔

.....☆☆.....

ابنِ صفی ایک رجحان ساز فنکار

تحریر: معوذ سید

بات رجحان سازی اور عہد سازی کی ہے، ابنِ صفی کو ایک رجحان ساز تخلیق کار کے طور پر لکھا گیا ہے، اول تو یہ موضوع بہت وسیع ہے، دوم یہ کہ میں بالکل کورا ہوں، بس کچھ نکات سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آخر رجحان سازی کا سہرا ابنِ صفی کے سر ہی کیوں باندھا جا رہا ہے.....؟ کون سی باتیں ابن صفی کو اوروں سے ممتاز کر رہی ہے...؟

(1) مقصدیت:

ابنِ صفی کا سب سے پہلا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی تخلیق میں مقصدیت پائی جاتی ہے، وہ ادب کو ذریعہ ابلاغ کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اس ذریعے سے انہوں نے قانون کی بالادستی اور لاقانونیت کی روسیاہی کا مثبت پیغام دیا ہے، انہوں نے قلم ہی مشن کے ساتھ اٹھایا تھا، ان کے ایک مضمون "بقلمِ خود" سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت برصغیر میں لاقانونیت کا ننگا ناچ ہونے کے بعد انہوں نے قانون کے ایسے محافظ کا خواب دیکھا تھا جو جرم ولاقانونیت کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جائے..... فریدی ان کے اسی خواب کی تعبیر تھا، اسی مضمون میں یہ بھی مذکور ہے کہ ادب میں پھیلی فحاشی کے جواب میں متبادل پیش کرنے کے مقصد سے انہوں نے جاسوسی ادب تخلیق کرنے کا تہیہ کیا تھا، یعنی ان کی تخلیقیت مثبت مقاصد میں استعمال ہوئی۔

سماج میں پھیلی انارکی اور ادب میں پھیلی بیہودگی کا سدباب!

(2) فکر کا استحکام:

ابنِ صفی ایک حقیقت پسند اور پریکٹیکل فنکار واقع ہوئے تھے، انھوں نے جو کچھ کہا اسے کر کے دکھایا، ان کی سوچ میں بلا وجہ کا اضطراب وانتشار نہیں تھا، جذباتیت سے انہوں نے ازحد گریز کیا، ان کا ایک جملہ بڑا شاندار ہے:

"میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ جب جتنے پیگ کا نشہ ہو اتنے کا بیان داغ دیا۔"

انہوں نے ہوائی قلعے بنانے یا خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے زمین کی حقیقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا وژن پیش کیا، اسی لئے وہ نوجوانوں کو رومان زدگی کے فریب سے نکالنے میں کامیاب ہوئے، وہ کیا ہی خوب جملہ ہے کہ:

"حالانکہ فطرت کا تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان دو سے تین ہو جائے۔"

(3) عینک کا فرق:

چونکہ ناول کا عنوان زندگی ہے اور زندگی میں اچھائی اور برائی دونوں ہیں اِس لئے ابن صفی کے ناولوں میں ہر قسم کی برائیوں، کشت وخون، سازشوں پر عمل درآمد سے لیکر شراب وکباب ہر چیز کا ذکر ہے، مگر ابنِ صفی اُن تنازع پسندوں سے ممتاز ہیں جو "سماج کو آئینہ دکھانے" اور "سماج کی سچائی بیان کرنے" کے نام پر "متنازع چیزیں" لکھ جاتے ہیں اور اس امتیاز کی بنیاد ہے "عینک کا فرق!" جی ہاں عینک کا فرق۔

جب ادیب معاشرے کو موضوعِ تخلیق بنائے گا تو ذکر برائیوں کا بھی آئے گا، مگر نقطہ امتیاز یہ ہوگا ادیب اُس برائی کو برائی کی عینک سے دیکھتا ہے یا برائی کو حمایت کی عینک لگا کر دیکھتا ہے! اس کی آسان سی مثال فلموں میں ملتی ہے کہ کبھی پولیس کو ہیرو بنایا جاتا ہے اور کبھی مجرم ہی فلم کا ہیرو ہوتا ہے، آرٹسٹ اس معاملے میں مختار ہوتا ہے کہ قاری یا ناظر کی ہمدردی جرم کے ساتھ رکھے یا قانون کے ساتھ۔؟ برائی کے ساتھ رکھے یا اچھائی کے ساتھ؟

لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی الگ ہے، سلام ابنِ صفی پر کہ جو کشت وخون اور شراب وکباب کا ذکر تو کرتے ہیں مگر برائی کو برائی کی عینک سے دکھا کر قاری کی ہمدردی قانون کے ساتھ اور اُس کا رجحان اچھائی کی طرف ہی رکھتے ہیں، مرحوم کا ایک ریڈیو انٹرویو یوٹیوب پر موجود ہے جس میں خود انہوں نے یہ بات کہی ہے۔

(4) تاثر لینے اور مرعوب ہونے کا فرق:-

ابن صفی نے عالمی سطح کی ادب کے انگریزی ناول بھی پڑھ رکھے تھے اور یقیناً انہوں نے جو کچھ پڑھا اس سے انہیں بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا ہوگا، ظاہر ہے کہ دنیا میں جس زبان کا عروج ہے اس کا ادب عالمی ادب کے طور پر تسلیم کیا جائے گا اور ہر پڑھنے والے کے ذہن پہ اس کا تاثر ضرور قائم ہوگا۔

اس بنیاد پر کچھ بیچارے لوگ مغربی ادب سے بڑے مرعوب رہتے ہیں، اگر انھوں نے انگریزی کی چار کتابیں پڑھ لیں تو اردو بیچاری ان کی نظر میں مظلوم ہوگئی!

مگر ابنِ صفی نے مغرب سے مرعوب ہونے کی بجائے اپنی زبان اور اپنے کلچر میں مغرب کے سامنے عالمی سطح کا ادب تخلیق کر کے کھڑا کر دیا، مغرب زدہ مرعوب لوگ اپنی گفتگو کے دوران مغربی ادیبوں کا نام لے کر فخر محسوس کرتے ہیں، جبکہ ابنِ صفی نے وہ ادب تخلیق کیا کہ مغرب کے سرخیل سراغ نویسوں کے برابر میں کھڑے ہوگئے، جی ہاں! ابنِ صفی کا موازنہ آرتھر کانن ڈائل، اگاتھا کرسٹی اور این فلیمنگ سے میں نے نہیں بلکہ شمس الرحمٰن فاروقی کا انٹرویو لیتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے کیا تھا۔

تو اے مداحانِ ابنِ صفی! آپ ایک رجحان ساز ادیب کے قاری ہیں، چنانچہ ادب پڑھنے اور لکھنے میں مقصدیت اپنائیں، فکر میں ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا کریں، اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی سمجھیں اور بنا کر پیش کریں، برائی کو حمایت کی عینک سے نہ دیکھیں (مطلب "منٹو" نہ بنیں۔) اور مغربی ادب سے مرعوب ہونے کے بجائے مشرق کا عالمی ادب تخلیق کریں، یہی ابنِ صفی کی ۳۷ ویں برسی پر انہیں بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔

اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے... آمین

.....☆☆.....

ابن صفی ایک بے مثال مصنف

تحریر: حیدر الحسینی (ڈیشنگ ایجنٹ)

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

میری مثال اُس بڑھیا کی سی ہے جو دھاگے کی ایک اٹی لے کر حضرت یوسف (علیہ السلام) کو خریدنے چلی آئی تھی اور محض خریداروں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی تھی، یوں سمجھ لیجئے کہ میں بھی اس سلسلہ "ابن صفی ایک عہد ایک رجحان" میں اپنا نام درج کروانے آیا ہوں، دیہاتی انسان ہوں، کتابوں سے آشنائی آٹھویں کلاس میں اس وقت ہوئی جب پہلی بار انتہائی پختہ تحریر جو ٹیپو سلطان کے متعلق تھی پڑھی۔

وقت گزرتا گیا، ٹارزن اور عمرو عیار کو پڑھتا رہا، آخر کار میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت کے دور میں عمران سے ملاقات ایک بہن کے توسط سے ہوئی، ایک لمبا عرصہ مظہر کلیم کو پڑھتا رہا، عمران سیریز کا کردار تنویر اشرف بہت پسند آیا، فیس بک آئیڈی کا نام بھی اسی کے کوڈ نیم پر رکھ لیا۔

حال ہی میں ابن صفی صاحب کے ناولوں سے ایک دوست کے توسط سے واقفیت ہوئی، ایک ماہ کے اندر اندر ان کے تیرہ ناول پڑھ لئے، سب سے پہلے میں نے دوسرے مصنفین کی لکھی عمران سیریز پڑھی تھی جو کہ حقیقت سے بہت دور ہوا کرتی تھیں، لیکن جب ابن صفی کا پہلا ناول ڈاکٹر دعا کو پڑھا تو بھی کردار حقیقت کے بہت قریب محسوس ہوئے، کہیں بھی کوئی بھی بھونڈا مزاح نظر نہیں آیا، عمران انسان ہی لگ رہا تھا کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں، ورنہ تو دوسرے نقل لکھنے والوں نے اس کو سوپر مین بنا دیا تھا، سائنس وہ تھی جو ہماری سمجھ میں آتی تھی اور جاسوسی کی تو بات ہی نا کیجئے، کہیں بھی کسی بھی موڑ پہ عمران فون اٹھا کر معلومات خریدتا ہوا نظر نہ آیا۔

ابن صفی کی کردار نگاری، مکالمہ سازی، منظر کشی، اپنی مثال آپ تھی، مثبت کرداروں کی تو بات ہی الگ ہے، کمال کی بات تو یہ ہے کہ لوگ ان کے منفی کرداروں کو بھی نہیں بھلا پائے، آپ ٹی تھری بی کو ہی لے لیجئے، آپ کو اس کا کردار دوسرے کرداروں سے منفرد اور بالکل مکمل نظر آئے گا، فیچ کو کون بھول سکتا ہے، بوغا کا کردار بھی کسی طور کم نہ تھا، ڈاکٹر سلمان (شعلے سیریز) کی عجیب وغریب دنیا کو بھلا کون نہیں جانتا ہوگا؟ ڈاکٹر دعا گو کیا کسی بھی عمدہ کردار سے کم تھا؟ الغرض مثبت کرداروں کے علاوہ ان کے منفی کردار بھی آج تک پوری آب وتاب برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ابن صفی صاحب کو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا، محاورات بسا اوقات اتنے برجستہ ہوتے کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا، کچھ پبلشرس کے مطابق لوگ اعتراض کرتے تھے کہ آپ کی فلاں کہانی انگریزی سے ماخوذ ہے، لیکن آپ بوغا سیریز کی آخری کہانی "ظلمات کا دیوتا" پڑھیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ انگلش فلم کنگ کانگ کا دوسرا حصہ 75 فی صد اس ناول کی نقل ہے۔

کچھ لوگ ابن صفی صاحب کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے اگاتھا کرسٹی وغیرہ کا نام لیتے ہیں تو ان کو یہ کہنا چاہوں گا کہ سورج کو کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی، جب وہ نکلتا ہے تو ہر نظر والے کو اس کی چمک نظر آجاتی ہے اور حدت محسوس

ہونے لگتی ہے۔

میں کوئی عالم نہیں ایک ادنیٰ سا قاری ہوں، فی الحال اسی پہ گزارہ کیجئے۔

.....☆☆.....

ابن صفی دنیائے اردو ادب کا منفرد مصنف

تحریر: فخرالدین کیفی

ابن صفی سے ہمارا رشتہ مصنف اور قاری والا ہی تھا، لیکن اب..... ذرا ٹھہریئے پہلے یہ بتادیں یہ رشتہ کب اور کیسے قا
ہوا، یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے، شاید 1958 میں ہم اپنے ماموں کے گھر گئے ہوئے تھے، اس زمانے میں ہمیں ناو
وغیرہ پڑھنے کی اجازت نہ تھی، بس اسکول لائبریری سے انگریزی کی ''اسٹوری بکس'' ملتی تھیں، ان میں سے ہمیں اینڈ
بلائیٹن (BlytonEnid) ایسی بھائیں کہ پھر عرصے تک کسی اور مصنف کو ہاتھ نہیں لگایا، ماموں کے گھر کوئی مصروفیت
تھی، اکتاہٹ کا شکار ہو کر وہاں موجود کتابوں کی طرف دیکھنا پڑا، ایک کتاب ''نیلے پرندے'' نے ہماری توجہ اپنی جانب
مبذول کرالی تو ہم اسے لے کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

اردو میں پڑھنے کی رفتار بہت کم تھی، اس لیے تقریباً دو گھنٹوں میں مکمل کر سکے، کتاب ایسی بھائی کہ پھر ابن صفی کے اسیر ہ
گئے، دوسری کتاب ''پاگل خانے کا قیدی'' تھی، پھر یہ سلسلہ چل نکلا، ایک آنا روز والی لائبریری سے تعارف ہوا، اور روز ا
ہی دوپہر کسی نہ کسی کتاب کی نذر ہونے لگی، پھر چاآنے روز کے ساتھ ساتھ ہر پندرھویں دن نئی کتاب بھی خریدنے لگے۔

ایک دن فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں میں ابن صفی کی کتابیں دیکھیں تو مزا آ گیا، جتنی ہاتھ لگیں خرید لائے، اس زمانے میں
توجہ صرف ابن صفی کے ناولوں پر رہی، کوئی تجسس نہ تھا کہ مصنف کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتے۔

ایک دن ''ہیروں کا فریب'' خرید کر لائے تو معلوم ہوا کہ نقلی ہے، پھر اصلی کتاب ملنے پر آگاہی ہوئی کہ کئی لوگ ابن صفی
سے ملتا جلتا نام استعمال کر رہے ہیں، زیر، زبر اور پیش کے ساتھ نقطوں (یا نکتوں) کا استعمال بھی دھوکہ دہی میں اتنا ہوا ک
ابن صفی کو کتاب کے لیئے ٹریڈ مارک (TradeMark) بنوانا پڑا، جو شاید دنیائے اردو ادب میں ایک منفرد قدم تھا، پ
کتابوں کو چربہ سازی سے بچانے کی ابتدا تھی، جو بالآخر ابن صفی صاحب کی تصویر تک پہنچ گئی، لیکن چربہ سازی کو نہ روک سکی
بازار میں بیسیوں ابن صفی، بن صفی، این صفی، ابن صفی اور ابن صفی کی بھرمار اتنی ہوگئی کہ سنا ہے یہ ابن صفی صاحب کی بیماری کی
سبب بن گئی، ابن صفی کی اس بیماری کی وجہ سے قارئین تقریباً تین سال تک نئی کتابوں سے محروم رہے، تین برسوں میں ہر ماہ
دو کتاب کے حساب سے ہم تقریباً 72 کتابوں سے محروم کر دیئے گئے۔

اس تعارف کے بعد اپنے ابتدائی کلمات کی طرف چلتے ہیں کہ ابن صفی سے ہمارا رشتہ مصنف اور قاری والا ہی تھا، لیکن
اب.....؟..... جی اب عقیدت والا ہے، عقیدت کے رشتے سے پہلے استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی ہوگیا، عقیدت مندی اور
شاگردی والے دونوں رشتے ابن صفی صاحب کی بعد از وفات قائم ہوئے، قاری والا رشتہ ان کی زندگی میں ہی قائم ہوگیا تھا
اور وہ بھی بہت مضبوط، مطلب یہ کہ قاری تو کسی ایک کتاب کے پڑھنے سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن یہاں تو ان کی تمام تصانیف
کے ایسے قاری تھے کہ ہر کتاب کم از کم دس بار پڑھی، کچھ کتابیں ایسی بھی جو محاورتاً نہیں حقیقتاً کہہ سکتے ہیں ''بیسیوں بار پڑھی
ہیں، لیکن اس معاملے میں بھی ہم نمبر دو ہوگئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سندھی بولنے والے ڈاکٹر سے دوران گفتگو معلوم

ہوا کہ انہوں نے اردو ابن صفی کی وجہ سے سیکھی، اور ہر کتاب اتنی بار پڑھی کہ انھیں ازبر ہوگئی، ان سے کسی کتاب کا کوئی جملہ پوچھا جاتا تو وہ کتاب کا نام بتا دیتے تھے، ہم نے آزمایا اور، درست پایا، اس دن یہ بھی علم ہوا کہ ابن صفی نے یہ بالکل درست لکھا تھا کہ مجھے اس وقت حقیقی خوشی ہوتی ہے جب کسی بنگالی بھائی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ میں نے اردو آپ کی کتاب کی وجہ سے سیکھی۔

استاد اور شاگردی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا جب ہم نے ریٹائیرمنٹ کے بعد لکھنے لکھانے کا شغل اپنا لیا، اس وقت محسوس ہوا کہ ہمارے قلم میں روانی (یہ خود نمائی نہیں) ابن صفی صاحب کی مرہون منت ہے، کیونکہ کالم وغیرہ لکھتے ہوئے عموماً ابن صفی سے رہنمائی مل جاتی ہے، رفتہ رفتہ یہ رشتہ عقیدت میں بدل گیا جس کا احساس اس وقت ہوا جب جناب احمد صفی صاحب (فرزند ابن صفی) سے فیس بک پر واقفیت ہوئی، اس وقت نہیں معلوم تھا کہ احمد بھائی فرزند ابن صفی ہیں، ایک دوست کی بدولت یہ علم ہوا تو ہمیں ایک خاص کشش کا احساس ہوا، اور اتفاق سے اُدھر سے بھی کچھ ایسی ہی پذیرائی ہوئی، ساتھ ہی احمد بھائی نے ہمیں کینی بھائی کے درجے پر فائز کر دیا، اس تعلق کے بعد ابن صفی صاحب کے بارے میں علم ہوا کہ ان کو بھارت میں وہ مقام مل رہا ہے جو پاکستان میں نہیں مل سکا، اسی دوران جناب خرم شفیق سے بھی غائبانہ تعارف ہوا، جنہوں نے ابن صفی کی تصانیف کے اقتباسات پر مبنی ''سائیکو مینشن'' ہمیں ارسال کی، اس کے علاوہ انہوں نے ''رانا پیلس'' بھی تحریر کی لیکن وہ ہمیں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی۔

ہم نے ایک دو کالموں میں ابن صفی کے ریفرنس بھی دیئے، انہیں کئی مضامین میں کوٹ (Quote) بھی کیا، لیکن تشفی نہ ہوئی، یا یہ کہیئے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' اس لیے دو ایک مضامین ابن صفی پر لکھے جو روزنامہ 'نوائے وقت'' میں شائع ہوئے، ایک مضمون ابن صفی پر لکھی گئی کتاب ''ابن صفی کون؟'' میں بھی شامل ہوا۔

جناب خرم شفیق صاحب کی کاوشوں سے ایک تحریک ہوئی، ہم نے ایک مضمون میں قارئین کو مشورہ بھی دیا کہ ابن صفی پر مقالہ لکھنے کی کافی گنجائش ہے، ان کی منظر نگاری پر لکھا جا سکتا ہے، وہ منظر نگاری مختصر الفاظ میں بھی اتنی پُر اثر انداز میں کرتے ہیں کہ کئی کئی صفحات پر مشتمل منظر نگاریاں ماند پڑ جاتی ہیں، یہ ابن صفی کا خاصہ ہے کہ بڑے سے بڑے مسئلے کو سو/ ڈیڑھ سو صفحات میں نمٹا دیتے ہیں، جس کے لیے کئی ادیب ہزار پانچ سو سے کم صفحات پر بس نہیں کرتے۔

دوسرا موضوع ابن صفی کے منفی کردار بھی بن سکتا ہے، ابن صفی نے جہاں فریدی، حمید اور عمران جیسے مرکزی کردار تخلیق کیئے وہیں ان تینوں مرکزی کرداروں کے حوالے سے ثانوی و معاون کردار بھی تخلیق کیے، مثلاً..... جاسوسی دنیا میں قاسم، شہناز، کنول، ملازم نصیر، ڈی آئی جی صاحب وغیرہ، اور عمران سیریز میں جوزف، صفدر، جولیانا، کیپٹن فیاض وغیرہ، یہ فقط چند کردار ہیں ورنہ یہ بھی اتنے ہیں کہ ان کا تعارف تو کجا، صرف نام لکھنے کے لیئے کئی صفحات درکار ہونگے، یہ سب ہی ذہن سے چپک کر رہ جانے والے کردار ہیں، ابن صفی کے منفی کرداروں کا کیا کہنا، جن کے بارے میں ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ ریسرچ کرنے والوں کے لیئے بہترین مواد بن سکتے ہیں۔

ہم نے پہلے ہی اعتراف کر لیا ہے کہ ہم سے اب تحقیقی کام نہیں ہوتا، اس لیے یہ چاہتے ہیں یہ کام کوئی اور اپنے ذمہ لے لے، یہ ہی وجہ ہے کہ منفی کرداروں کا سرسری جائزہ لے تو رہے ہیں لیکن یقین نہیں کہ حق ادا ہو جائے، بہر حال ایسے کرداروں میں تھریسیا اور سنگ ہی تو سرفہرست ہیں ہی لیکن ساتھ ہی فنچ یا ڈاکٹر ڈریڈ بھی کم نہیں، لیونارڈ اور جیرالڈ شاستری کا بھی تجزیہ کیا

جاسکتا ہے، ڈاکٹر ٹسڈل کی بے چارگی ہو یا ڈاکٹر نارنگ کی سفاکیت، یہ سب ہی ریسرچ کے لئے بہترین موضوع بن سکتے ہیں۔

ابن صفی کے کرداروں میں ایسے منفی کردار بھی ہیں جو قابل رحم بھی ہیں، جیسے "لاش کا بلاوہ" کے دو کردار، "سائے کی لاش" کی مجرمہ لیڈی تنویر، ناول "علامہ دہشتناک" کا کردار شہزور، بہرحال ایسے منفی کردار ابن صفی ہی تخلیق کر سکتے تھے جن سے بیک وقت ہمدردی بھی ہوتی تھی، لیکن انکا انجام بھی بدتر ہی چاہا جاتا تھا۔

مقالہ لکھنے والوں کو تقریباً دو سو سے زائد ایسے منفی کردار ملیں گے جن پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، مجرمانہ ذہنیت کی وجوہات بھی زیر بحث آسکتی ہیں۔

ابن صفی نے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، ہر معاملے میں پرفیکشنسٹ ہی رہے، مرکزی کردار ایسے کہ قاری نے اپنے ذہن میں ان کا خاکہ بنالیا، اس کا منفی پہلو یہ رہا کہ کوئی ان کرداروں کو فلمانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، ہم نے ہالی ووڈ، بالی ووڈ اور لالی ووڈ کے بہترین اداکاروں کو فریدی، حمید اور عمران کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن بری طرح ناکام رہے، کوئی بھی اداکار معیار پر پورا تو کیا تھوڑا بھی نہ اتر سکا۔

افسوس کہ اگر ان ناولوں کے مرکزی کرداروں کو کوئی اور نام دے کر بھی فلمایا گیا تب بھی ناظرین قبول نہیں کریں گے، یہ ناول اور کردار پڑھنے والوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح سے رچ بس گئے ہیں کہ اگر فریدی، حمید اور عمران کی کہانیوں کو مرکزی کرداروں کے نام بدل کر دوبارہ لکھا جائے تو بھی شاید لوگ اسے پسند نہ کر پائیں، یہی خوبی ابن صفی کو دوسرے لکھنے والوں سے منفرد و ممتاز بناتی ہے، اسی لئے آج کل نقال مصنفین عمران کے نام والے کردار پر ناول لکھ کر خوب کما رہے ہیں۔

دنیا کے بہترین مصنفین نے بھی کردار تخلیق کیے لیکن وہ کردار انفرادیت قائم نہ رکھ سکے، ان کرداروں کو کئی اداکاروں نے نبھایا، اور ناظرین سے خوب داد تحسین وصول کی، مثال میں ہم دنیا کے مشہور ترین مصنف آئین فلیمنگ کے کردار جیمس بانڈ 007 کو پیش کرتے ہیں، جسے ایک سے زائد ایکٹروں پر فلمایا گیا، لیکن ہر کردار جیمس بانڈ سے زیادہ شون کانری، راجر مور اور ٹموتھی ڈالٹن ہی رہا، ہر ایکٹر جیمس بانڈ کی بجائے ایکٹر ہی رہا۔

ہم دعوے سے کہتے ہیں، دنیا کا کوئی ایکٹر فریدی اور عمران کا رول نہیں ادا کر سکتا، عمران کے چہرے پر برسنے والی حماقت میں اس کی وجاہت اور مردانہ حسن کو برقرار رکھنا، اور وقت پڑنے پر اس طرح بدلنا کہ اس کے اپنے ساتھی جو اس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں کانپ جائیں، اس قسم کے تاثرات کسی بھی ایکٹر کی فن اداکاری سے بہت اونچی چیز ہیں، ان کو صرف سوچا اور محسوس ہی کیا جاسکتا ہے، اس پر عمل درآمد فی الحال اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کسی نقال لکھاری سے ابن صفی جیسے طرز تحریر کی توقع رکھنا۔

فریدی کی مردانہ وجاہت اور خوبصورت چہرے پر نیم غنودہ آنکھیں، کوئی بھی اداکار پیش نہیں کر سکتا، کوئی ایکٹر ایسا نہیں جو فریدی اور عمران کا رول کرے اور اس کامیابی سے کرے کہ کردار کی گہرائی میں اتر جائے کہ ناظرین بے اختیار کہہ اٹھیں کہ ہاں یہ فریدی ہے، یہ عمران ہے۔

ابن صفی نے ایک فلم دھماکہ بنائی لیکن عمران کی جگہ ظفر الملک کو دے دی، ہمیں یقین ہے کہ اس فلم کا ہیرو اگر عمران ہوتا تو فلم فلاپ نہیں ہوتی، لیکن مشکل یہ تھی کہ عمران کا کردار کون ادا کرتا؟

یہ ابن صفی کا کمال ہے کہ نا صرف کردار بلکہ کردار کی آواز کو بھی منفرد بنا دیا، ایکسٹو کا کوئی خاکہ نہیں، صرف آواز ہے، لیکن فلم میں ایکسٹو کی آواز بھی ناظرین نے قبول نہیں کی، حالانکہ یہ آواز خود ابن صفی کی آواز تھی۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ ابن صفی کے ناولوں کو فلمانا کتنا مشکل ہے، کرداروں کے نام بدل کر فلما تو سکتے ہیں، کہانی کی وجہ سے فلم کامیاب بھی ہو سکتی ہے، لیکن عمران اور فریدی کے چاہنے والوں کو اس طرح اپنی طرف نہ لا سکے گی جس طرح وہ عمران یا فریدی کے نام پر آتے ہیں۔

.....☆☆.....

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

تحریر: عبداللہ احمد حسن

یہ جولائی کا مہینہ ہے جو محترم ابن صفی صاحب سے ایک خاص نسبت رکھتا ہے۔

شاید اسی لئے برادرم سید اسد عادل الحسینی اور ان کی ٹیم نے ایک ایونٹ اس ماہ میں رکھا ہے، انہوں نے "دی گریٹ ابن صفی فین کلب" کے ممبران سے اس سلسلہ کے تحت مضامین لکھنے کی استدعا کی ہے، اسی سلسلے میں یہ ناچیز بھی ان کی نظر میں آ گیا، ان کا حکم ہے کہ ایک مضمون لکھ دوں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم ابن صفی پر کیا لکھیں؟

ابن صفی پر تو ایسے ایسے لوگ لکھ چکے ہیں جو آج لیجنڈ کا درجہ رکھتے ہیں، اس سلسلے میں برادر راشد اشرف کا نام نہ لینا زیادتی ہوگی کیونکہ انہوں نے ابن صفی پر جو کام کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے، ان کو تو اس کام کے حوالے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنا چاہیئے، وہ اس کے حقدار ہیں اتنے اعلیٰ درجہ کے مضامین کے درمیان ہمارا مضمون کیا حیثیت رکھتا ہے، ہم تو ابھی قلم کے میدان میں نو وارد ہیں، نو آموز ہیں، اس لئے ہم نے سوچا کہ ہم کسی اور طرح سے لکھیں، اپنے ہی انداز سے اور عام ڈگر سے ہٹ کر تو شاید قارئین کو پسند بھی آئے۔

26 جولائی **1928** کو برطانوی ہندوستان کے علاقے الٰہ آباد کی ایک ڈسٹرکٹ نارا میں رہائش پذیر جناب صفی اللہ صاحب کے گھر میں بچے کے رونے کی آواز گونجی تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے، بتایا گیا کہ لڑکا ہوا ہے سب نے صفی اللہ صاحب کو مبارک باد پیش کی۔

نومولود کا نام اسرار احمد تجویز ہوا۔

اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اسم با مسمیٰ ہوگا، یہ بچہ لوگوں کو اسرار اور تجسس کی ایسی دنیاؤں کی سیر کرائے گا جہاں پہنچ کر قاری اپنے دکھ درد اور پریشانیاں بھول جائے گا، اس کا نام برصغیر ہی نہیں چار دانگ عالم میں مشہور ہوگا۔

ابن صفی شاعر تھے مزاح نگار تھے، کہانی کار تھے، مگر اس کے علاوہ بھی کچھ تھا جو ابھی باقی تھا، کوئی کمی سی تھی، کہتے ہیں کہ نام کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے شاید یہی چیز بالآخر ان کو جاسوسی ناول نگاری کی طرف لے گئی، اردو زبان میں جاسوسی ناول تو اور بھی بے شمار لوگوں نے لکھے ہیں مگر جو جہانِ حیرت ابن صفی نے تخلیق کیا تھا ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ بات کسی میں پیدا نہ ہو سکی، جو کردار انہوں نے متعارف کروائے وہ بھی امر ہو گئے، درجنوں مصنفین تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں پر بھی ہاتھ صاف کیا اور اپنے گھروں کے چولہے جلائے، ان کے اپنے ڈھائی سو ناولز کے مقابلے پر

ہزاروں ناولز ان کے ہی کرداروں پر مشتمل آ گئے، مگر اصل اور نقل میں اتنا واضح فرق تھا کہ جس نے بھی ابن صفی کو پڑھا ہے اس کے سامنے سارے ناولوں کا ڈھیر لگا دیں، وہ اس میں سے اصل ناول نکال لے گا۔

اس فیس بک گروپ ''دی اگریٹ ابن صفی فین کلب'' میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ کئی ممبر کسی اور کے ناول پڑھتے تھے اور اسی کو اصل سمجھتے تھے مگر جب اصلی ناول ان کی نظر سے گزرے تو انہوں نے فرق محسوس کر کے دو نمبر سے جان چھڑالی، بہت سے نقالوں نے تو ان کا نام بھی استعمال کیا کئی لوگوں نے دھوکا دینے کے لیئے ان کے نام سے ملتے جلتے قافیئے بھی استعمال کیئے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

ابن صفی بلاشبہ عظیم ناول نگار تھے، مگر افسوس کہ ان کو اپنے ملک میں دنیائے ادب کی طرف سے وہ پذیرائی نہ مل سکی جو ان کا حق تھا، بلکہ ان کو ادیب بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ جیسا انہوں نے اشارہ کیا تھا کہ ادب عالیہ کی موٹی موٹی کتابیں الماریوں کی زینت بن کر گرد آلود ہوتی رہتی ہیں، اور ابن صفی لوگوں کے تکیوں کے نیچے ملتا ہے، اس سے زیادہ کسی کو اور کیا چاہیئے، کوئی مانے یا نہ مانے، مگر ان سے ان کا مقام کوئی نہیں چھین سکتا۔

ہمارے ایک دوست ہیں جو شعبہ صحافت سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے بتایا کہ ان کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ ابن صفی کا کوئی ناول نہ پڑھیں، روزانہ وہ مخصوص خالی وقت میں یہی پڑھتے ہیں، بھابھی ان کی عادت جانتی ہیں، اس لئے ہمیشہ یہ انتظام رکھتی ہیں کہ جیسے ہی ایک ناول ختم ہو وہ دوسرا نکال کر مخصوص جگہ پر رکھ دیں، تاکہ انہیں پوچھنا یا ڈھونڈنا نہ پڑے۔

آرتھر کونن ڈوئیل جنہوں نے شرلاک ہومز کا کردار تخلیق کیا تھا وہ برطانوی خفیہ اداروں کو لیکچرز دیتے تھے، یہی اعزاز ابن صفی کو بھی حاصل ہے کہ انہوں نے آئی ایس آئی کو لیکچرز دیئے، مسٹری کوئن کہلانے والی اگاتھا کرسٹی نے ان الفاظ میں ابن صفی کا ذکر کیا کہ " مجھے اردو نہیں آتی لیکن برصغیر کے جاسوسی لٹریچر سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہوں، اردو میں اگر کوئی اصلی ناول نگار ہے، تو وہ ابن صفی ہے، باقی اس کے نقال ہیں، کسی نے اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نہیں نکالی۔

ابن صفی کے کرداروں کے بارے میں کبھی لوگوں سے گفتگو ہوتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم جن کرداروں کا ذکر کر رہے ہیں وہ زندہ جاوید ہیں، ہم نے ان سب کرداروں کرنل فریدی، کیپٹن حمید، قاسم، عمران، صفدر، بلیک زیرو وغیرہ کو ہمیشہ اپنے آس پاس محسوس کیا۔

یہ ابن صفی کی ناول نگاری کا کمال تھا کہ انہوں نے جو بھی کردار بنائے وہ امر ہو گئے، جیسے منفی کردار سنگ ہی، تھریسیا، بوغا، ڈاکٹر سلمان، ڈاکٹر ڈریڈ، کنور شمشاد، الفرونزے، ایڈلاوا، الفانسے، اولیویا نارمن، فنچ، ہمبگ دی گریٹ، جیرالڈ شاستری، رانا پرمود، نانوتہ، ریما، اور دوسرے مرکزی یا معاون کردار جیسے فریدی، حمید، عمران، قاسم، صفدر، جولیا، خاور، چوہان، انور، نیلم، رشیدہ، روشی، تنویر، ثریا، اماں بی، سر سلطان، رحمان صاحب وغیرہ، غرض یہ کہ کہاں تک گنوائیں، بس یہ سمجھیں کہ کردار نگاری ان پر ختم تھی۔

انہوں نے اپنے ناولز میں سائنس فکشن بھی پیش کیا، اور اس میں ان کو، لیونارڈو ڈاونچی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، ڈاونچی آرٹسٹ تھا، اس نے اس زمانے میں جب کہ ہیلی کاپٹر کا وجود نہیں تھا، ہیلی کاپٹر کا خاکہ بنایا تھا، جو مستقبل میں سچ ہو گیا، اور تقریباً اسی ڈیزائن پر ہیلی کاپٹر بنایا گیا۔

ابن صفی نے بھی اپنے ناولز میں بہت سی ایسی سائنسی ایجادات پیش کیں جو بعد ازاں حقیقت کا روپ دھار گئیں۔ یہ موضوع خاصی وسعت رکھتا ہے مگر طوالت کے خوف سے ہم اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کبھی موقع ملا تو اس پر ان شاء اللہ تفصیلاً لکھیں گے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں بتایا کہ ابن صفی برطانوی ہند میں پیدا ہوئے اور ہجرت کے بعد باقی زندگی پاکستان میں گزاری، مگر اپنے ناولز میں بیرونی ممالک کی ایسی منظر کشی کی کہ لگتا تھا کہ وہ خود یہ سب دیکھ چکے ہوں، جن مقامات کا انہوں نے اپنے ناولوں میں ذکر کیا ہے وہ اکثر مقامات اسی طرح موجود ہیں۔

ہمارا بچپن کراچی میں گزرا ہے، وہیں ہم اسکول پڑھنے جاتے تھے، جب حروف سے آشنائی ہوگئی تو نصاب کے علاوہ بچوں کے رسالے، بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ، تعلیم و تربیت، نونہال وغیرہ پڑھنے شروع کیئے۔

ہم غالباً ابھی دوسری کلاس میں تھے کہ ایک دوست جو ہم سے عمر میں تین سال بڑے تھے ملنے آئے، کچھ دیر گفتگو کے بعد کہا چلو مجھے ایک کتاب لینا ہے، ہم اس کے ساتھ روانہ ہوئے، وہ ہمیں صرافہ بازار میں واقع ایک چھوٹی سی کیبن نما جگہ لے گئے، وہاں

ایک آدمی بیٹھا تھا جو کتابیں نکال کر دے رہا تھا، چھوٹا سا قد، دبلا پتلا جسم، آنکھوں میں سرمہ، شلوار قمیض میں ملبوس، سر پر سندھی ٹوپی، پتہ چلا وہ لائبریرین ہیں، سب انھیں حاجی حاجی کہہ کر پکار رہے تھے، ان کا اصل نام تو ہمیں آج بھی نہیں معلوم، ہاں اتنا پتا چلا کہ وہ حاجی قریشی کہلاتے ہیں اور پاکستان کے نامور ادا کار مصطفیٰ قریشی کے بہنوئی ہیں۔

یہاں کتابیں کرائے پر دستیاب تھیں، ہمیں بھی اس طریقہ کار میں دلچسپی محسوس ہوئی، ہم نے اپنے دوست سے کہا کہ ہمارا بھی تعارف ان سے کرادو ہم بھی کتابیں لیں گے، انہوں نے حاجی سے ہمارا تعارف کروادیا، ہم نے بچوں کے ناول مانگے حاجی نے آٹھ دس تھما دیئے، ہم نے ان میں سے ایک پسند کیا یوں وہاں ہمارا بھی کھاتہ کھل گیا، رفتہ رفتہ ہم نے وہاں موجود تقریباً سارے ہی بچوں کے ناول ختم کر لیئے۔

ایک دن ہم الجھن میں تھے کہ کیا لیں، اتنے میں حاجی نے کچھ کتابیں ہماری طرف بڑھائیں، اور کہا یہ بھی پڑھ کر دیکھو، ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ناول لے لیا، یہ عمران سیریز کا ناول تھا۔

یہ ہمارا عمران اور ابن صفی صاحب سے پہلا تعارف تھا، ہم تو بچوں کے ناولز کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے، مگر یہاں تو حیرت و تجسس کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، ایک نیا جہان حیرت تھا، جس نے ہمیں اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا۔

اس ناول نے ہمیں بہتیری نئی چیزوں سے روشناس کروایا، جن سے ہم اب تک ناواقف تھے، ابن صفی کا یہ ناول پڑھنے سے نہ صرف ہمارے اردو کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا بلکہ ہمیں انگریزی کے کچھ نئے الفاظ بھی سیکھنے کو ملے، غرض یہ کہ ہمیں یہ ناول بہت پسند آیا، چنانچہ اس ناول کو واپس کرتے ہوئے ہم نے عمران سیریز کا دوسرا ناول لیا، اور یوں یہ سلسلہ مستقل طور پر شروع ہوگیا۔

کچھ عرصے بعد اسی علاقے میں ایک اور لائبریری کھلی تو ہم نے وہاں کا رخ بھی کرنا شروع کیا، جب چند بار ہم نے اس سے ابن صفی کی عمران سیریز مانگی تو ایک دن اس نے کہا تم ہمیشہ یہی سیریز کیوں لیتے ہو کبھی حمیدی فریدی کو پڑھا ہے؟.....

ہم نے نفی میں جواب دیا تو اس نے جاسوسی دنیا کا ایک ناول دیا اور کہا یہ بھی ابن صفی ہی نے لکھا ہے پڑھ کر دیکھو۔

اب ہمارا تعارف کچھ نئے کرداروں سے ہوا جن میں فریدی تو تھا مگر حمیدی نہیں ملا اس کی جگہ کیپٹن حمید تھا۔

یہ ایک الگ انداز تھا، ایک نیا لطف تھا، عمران سیریز اپنی جگہ پر مگر جاسوسی دنیا میں ایک الگ ہی مزہ تھا، یہ اور بات ہے کہ ہمارا پسندیدہ کردار اب بھی عمران ہی تھا، کیونکہ فریدی کا رہن سہن جاگیردارانہ انداز کا تھا، حالانکہ عام زندگی میں وہ نمود و نمائش سے دور ایک پرخلوص شخصیت کا مالک تھا، جبکہ عمران ایک عام آدمی تھا فلیٹ میں رہتا تھا اور سب لوگ حتیٰ کہ اس کے ماتحت بھی اس کو چٹکیوں میں اڑاتے تھے، مگر جب وقت پڑتا تھا تو اس کی جون ہی بدل جاتی تھی، ضرورت پڑنے پر وہ بڑی سفاکی سے کسی کو بھی قتل کرتے ہوئے بھی نہیں جھجکتا تھا، وہ پل بھر میں بھیڑ سے بھیڑیا بن جاتا تھا، شاید ایسی ہی خوبیوں کی وجہ سے عمران کا کردار زیادہ پسند کیا جاتا تھا، خیر یہ اس وقت کی بات ہے، اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون زیادہ بہتر ہے۔

پھر جب ہم مسقط آئے تو یہاں ایک دوست نے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے نے ہمیں مطرح، طالب مارکیٹ میں واقع ایک دکان دکھائی، جو کچھ ہی عرصہ قبل کھلی تھی، اور اردو کتابوں کا واحد مرکز تھی، مری سے تعلق رکھنے والے محمد آصف مرزا جو خود بھی اب ماشاء اللہ صاحب کتاب شاعر بن چکے ہیں، نے یہ دکان شروع کی تھی، ہم وہاں آنے جانے لگے جلد ہی محمد آصف مرزا سے ہماری دوستی ہوگئی، وہ ہمارے لئے آصف بھائی بن گئے، یہ تعلق آج تک قائم ہے، ہم انہیں بڑے بھائی کی طرح ہی سمجھتے ہیں، وہ 1982 میں واپس پاکستان چلے گئے تھے، پھر دکان ان کے بھائی شاہد بھائی اور ایک دوست عارف بھائی نے سنبھالی، کافی عرصہ تک دکان چلاتے رہے، پھر ابھی کچھ سال قبل کاروبار ختم کر کے وہ بھی واپس اپنے وطن لوٹ گئے۔

ایک دن خبر ملی کہ ابن صفی صاحب ایک ڈائجسٹ نکال رہے ہیں، جس کا نام "ابن صفی میگزین" رکھا گیا ہے، ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ اب ہم ڈائجسٹ پڑھنے لگے تھے، مگر بعد ازاں پتہ چلا کہ ڈائجسٹ ان کے ایک دوست اور شاگرد مشتاق احمد قریشی نکال رہے ہیں، ہمارے لیئے اب بھی خوشی کا مقام تھا کہ "ابن صفی میگزین" کی نگرانی تو وہ خود کریں گے، مگر ڈائجسٹ کا نام چند ہی شماروں کے بعد بدل کر "نئے افق" رکھ دیا گیا، وجہ یہ بتائی گئی کہ پاکستان میں کسی مصنف کے نام سے ڈائجسٹ نہیں نکال سکتے، پھر اسی ادارے کے دوسرے ڈائجسٹ کا اجراء ہوا، جو نیا رخ کے نام سے مارکیٹ میں آیا، ہم تو نیا رخ میں چھپنے والی ان کی تازہ تصاویر دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ کیا یہ واقعی وہی ابن صفی ہیں جن کی تصاویر ہم کتاب کے آخر میں دیکھا کرتے تھے، ہم تو پہچان ہی نہیں پا رہے تھے، بیماری نے ان کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔

ابن صفی کے بعد بھی ہم نے رسم وفا نبھائی، اور اس وقت تک یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھتے رہے جب تک کہ آخری صفحات ابن صفی صاحب کی تحریروں سے مزین رہے، اس کے بعد ہم نے یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھنے چھوڑ دیئے۔

ابن صفی صاحب کے نئے ناول آتے تھے، ہم پڑھتے رہتے تھے، ایک دن کا ذکر ہے، ہم نئی کتاب لے کر خوش خوش واپس گھر آ رہے تھے، گرمی بہت تھی اس لئے ایک کیفے میں آئس کریم کھانے رک گئے، اچانک ہماری نظر سامنے میز پر بیٹھے ایک شخص پر پڑی وہ ہندوستان کے شہر راجستھان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا انداز ہم آج تک نہیں بھول پائے، وہ سیدھے ہو کر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میز پر تھا، جس میں یہی نیا ناول دبا ہوا جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے، ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، سر آہستہ آہستہ اوپر نیچے یعنی اثبات میں ہل رہا تھا، یہ منظر ہمیں آج تک جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔

1974 میں جب ہم پاکستان واپس پہنچے تو پتا چلا کہ ابن صفی صاحب کی فلم دھماکا ریلیز ہوگئی ہے، ہم نے جا کر سینما میں

یہ فلم دیکھی، یوں ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے یہ فلم دیکھ رکھی ہے، اس میں جاوید شیخ نے ظفر الملک کا، جبکہ مولا ہی نے جیمسن کا کردار ادا کیا ہے، ہمیں فلم بہت پسند آئی اور یہ دونوں کردار تو ایسے دماغ میں بیٹھے کہ آج بھی جب ہم ناول پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی دونوں کردار در آتے ہیں۔

ابن صفی کا فیض آج بھی جاری ہے، ہمیں جتنا مطالعہ کا شوق تھا وہ ہمارے بچوں میں نظر نہیں آتا، ہماری لاکھ کوشش پر بھی وہ کتابوں کی طرف نہیں آتے، ایک بار ہم کراچی گئے ہوئے تھے، صدر میں ریگل چوک سے گزرتے ہوئے فٹ پاتھ پر موجود بک کھوکھے پر نظر پڑی تو حسب عادت دیکھنے کے لیئے رک گئے، اچانک ہماری نظر ایک نئے انداز میں چھپی عمران سیریز پر پڑی، جس میں ایک جلد میں دو دو تین تین ناول تھے، ہم نے چند جلدیں لے لیں۔

گھر آ کر پڑھتے ہوئے ہمیں خیال آیا تو بڑے بیٹے مزمل کو عمران سیریز کا ناول بھیا نک آدمی دے کر کہا کہ یہ پڑھو، انہوں نے بے دلی سے لے کر رکھ لی، دوسرے دن ہم نے پوچھا تو بولے ابھی نہیں پڑھی، اب پڑھوں گا۔

تقریباً دو دن بعد ہماری نظر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ صاحبزادے کتاب پڑھ رہے ہیں، ہم خاموش رہے، دوسرے دن وہ ہمارے پاس آ کر بولے اس سلسلے کی کوئی اور کتاب ہے؟ ہم نے دوسری کتابیں دیں، اس دن کے بعد جو انہوں نے مطالعہ شروع کیا تو ابن صفی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ پڑھ ڈالا، ناول، معلوماتی کتابیں، اسلامیات غرض یہ کہ کوئی موضوع مخصوص کیئے بغیر مطالعے کو اپنی عادت میں شامل کر لیا۔

یہی کوشش ہم نے دوسرے بیٹے عمار کے ساتھ بھی کی، مگر انہوں نے پڑھ کر نہ دیا، بالآخر ہم مایوس ہو گئے، ابھی چند ماہ قبل ان کے واٹس اپ اسٹیٹس پر لکھا دیکھا "حمید مزاحیہ" "حمید غیر سنجیدہ" وغیرہ، ہم حیران ہوئے کہ یہ کس کا ذکر خیر ہے، ان سے پوچھا تو کہا سارجنٹ حمید کی بابت لکھا ہے، ہم مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے، پوچھا آپ اس کو کیا جانیں، تو بتایا پچھلے دنوں میں بیزار بیٹھا تھا تو سوچا کچھ پڑھ لوں، اس لیے آپ کی لائبریری دیکھی، وہاں ان کتابوں پر نظر پڑی تو جاسوسی دنیا کی پہلی جلد اٹھالی، بہت مزہ آیا، اس لیئے یہ اسٹیٹس رکھے ہیں، اس کے بعد سے ان کا مطالعہ جاری ہے، ہم نے کہا عمران سیریز بھی ٹرائی کریں، مگر ان کا کہنا ہے کہ پہلے یہ سب ختم کر لوں پھر عمران سیریز شروع کروں گا، ہم نے کہا کوئی بات نہیں زمین کے بادل تک پہنچو عمران سے تعارف ہو جائے گا۔

تو دیکھ لیں ابن صفی کا فیض کہ جو کتابوں سے دور بھاگتے تھے آج ابن صفی کی وجہ سے پڑھنا سیکھ گئے ہیں، ابن صفی کے ناولوں کی یہ خوبی کیا کم ہے کہ بے شمار لوگ جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی محض ان کی کتابیں پڑھنے کے لیے اردو سیکھنے پر مجبور ہوئے، کوئی ایسا مصنف دکھا دیجیے جس کو پڑھنے کے لیے لوگ کوئی زبان سیکھتے ہوں اردو کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو گی۔

تاریخ 26 جولائی 1980، رات کا ایک بج رہا تھا۔

دانش منزل کے ہال میں جہاں ایکسٹو سب ماتحتوں کو جمع کر کے کیس کی تفصیلات بتایا کرتا تھا سیکرٹ سروس کے سب ممبران موجود تھے، عمران، صفدر، جولیانا، خاور، نعمانی، چوہان، صدیقی اور سارجنٹ نیو۔

مگر اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ہر طرف خاموشی طاری تھی، سب از حد پریشان نظر آ رہے تھے، کچھ لوگوں کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں، خاص کر جولیا کی تو ناک بھی سرخ ہو رہی تھی، وہ ہونٹ سکوڑ سکوڑ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی،

عمران جیسا کھلنڈرا شخص بھی اس وقت سنجیدہ نظر آرہا تھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں، ایسا لگتا تھا جیسے بار بار آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے آنکھیں سرخ ہوگئی ہوں، وہ سب بالکل خاموش بیٹھے ایک ٹک فون کو گھورے جارہے تھے۔

دوسری طرف بلیک زیرو رانا پیلس کے ایک کمرے میں پریشان حال بیٹھا تھا، اس کی نظریں بھی فون پر جمی ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی ضروری کال کا منتظر ہو۔

اچانک دانش منزل میں فون کی بیل بجی، جولیا نے فون اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں ہیلو کہا۔

دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔۔۔۔۔"ہیلو عمران ہے؟"

جولیا نے فون کا ریسیور عمران کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو عمران بول رہا ہوں۔"

"ہاں عمران۔۔۔۔۔۔۔۔میں سنگ ہی بول رہا ہوں، کیا ہوا، کیا خبر ہے؟"

"نہیں چچا۔۔۔۔۔۔۔اب تک کچھ پتا نہیں چلا، ہم سب بھی پریشان بیٹھے دعائیں مانگ رہے ہیں۔"

"اوہ اللہ خیر کرے نہ جانے کیا ہوگا، تھریسیا بھی میرے ساتھ ہی ہے اور رو رہی ہے۔"

"اس سے کہو صبر کرے اور ہمت سے کام لے، اب ایسے میں کیا کیا جاسکتا ہے چچا، کال آجائے تو میں تمہیں خبر کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہاری کال کا منتظر رہوں گا۔"

"اللہ حافظ" عمران نے کہہ کر جیسے ہی فون رکھا باہر دروازے کی کال بیل بج اٹھی، صفدر اٹھ کر باہر آیا، دروازے پر تین افراد موجود تھے، ان کو دیکھ کر وہ چونک پڑا، وہ انہیں اچھی طرح جانتا تھا، اور ان سے تاریک وادی کے سفر میں مل چکا تھا۔

ان میں سے ایک شخص دراز قد، قوی ہیکل اور وجیہہ آدمی تھا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کوئی بہت کامل شخص ہے، ابھی سو جائے گا، مگر ان آنکھوں میں اس وقت نمی تھی، دوسرا بھی ایک خوش شکل جوان تھا، اس کے نقوش میں ہلکی سی نسوانیت کی جھلکیاں پائی جاتی تھیں، اس کی آنکھیں بار بار نم ہورہی تھیں، جنہیں وہ ایک رومال سے مسلسل خشک کیے جارہا تھا، ان میں سے تیسرا آدمی ایک بہت لمبا اور بہت موٹا شخص تھا، جسے مینار نما گنبد یا گنبد نما مینار کہا جاسکتا تھا، یہ آدمی اس وقت بری طرح سے رو رہا تھا۔

یہ تینوں افراد کرنل فریدی، کیپٹن حمید اور قاسم تھے، فریدی بار بار قاسم کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے چپ کرانے کی کوشش کررہا تھا، صفدر نے ایک مغموم سی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا، اور پھر انھیں لے کر اسی ہال میں آگیا جہاں باقی افراد بیٹھے تھے۔

سب ایک دوسرے سے ملے، عمران نے ان سب سے مصافحہ کیا، بیٹھنے کے لئے ان کو کرسیاں پیش کی گئیں، جب وہ بیٹھ گئے تو فریدی نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

عمران نے جواب دیا" کوئی امید نہیں ہے بس دعا کریں۔"

رات کے ڈیڑھ بجے رانا پیلس کا فون جاگ اٹھا، بلیک زیرو نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور لرزتی آواز میں کہا۔

"ہیلو"

دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز آئی، جیسے کوئی روتے روتے بات کر رہا ہو۔

"بلیک زیرو بول رہے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میں ایثار صفی بول رہا ہوں۔"

"جی ایثار صفی صاحب، اب ابو کی طبیعت کیسی ہے؟"

دوسری طرف سے ایک سسکی کے ساتھ روتے ہوئے کہا گیا۔

"بلیک زیرو ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے"

بلیک زیرو کے ہاتھ سے فون چھوٹ گیا، اس نے اپنا سر پکڑ لیا، اس کی آنکھوں سے برسوں کا رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا، جلد ہی اس نے اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پا لیا، ابھی اسے ایک ذمہ داری اور نبھانی تھی، اس نے فون اٹھا کر دانش منزل کے نمبر ڈائل کیئے، فون جولیا نے اٹھایا اور پہلی بار ایکسٹو کی غراہٹ بھری آواز کے بجائے بھیگی ہوئی سی آواز سنی۔

"جولیا فون عمران کو دیدو۔"

"یس سر۔"

عمران نے فون کا ریسیور جولیا کے ہاتھ سے لیا تو اس کا ہاتھ لرز رہا، تھا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا،

"ہیلو عمران بول رہا ہوں۔"

"جناب عالی، ابھی ابھی ایثار صفی صاحب کا فون آیا تھا، انہوں نے بتایا کہ ابن صفی صاحب اب نہیں رہے، ان کا انتقال ہو گیا اور ہم سب یتیم ہو گئے۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" عمران نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا، اس کی آنکھوں سے پھر سے آنسو بہہ نکلے تھے، کسی کو بھی اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع بخوبی سمجھ چکے تھے، ان سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، خصوصاً قاسم اور جولیا کی حالت تو بہت ہی قابل رحم تھی، قاسم بلک بلک کر رو رہا تھا، عمران نے فریدی کی طرف دیکھا اور فریدی نے اپنے سر کو جنبش دے کر بلند آواز میں کہا۔

"ختم..... سب ختم ہو گیا، ان کے ساتھ ہی ہم بھی ختم ہو گئے۔"

عمران سیریز کا خاتمہ ہو گیا، جاسوسی دنیا بھی اپنے انجام کو پہنچی، وہ جس کے ناولوں کا سب انتظار کیا کرتے تھے نہیں رہا، "دلیر مجرم" سے شروع ہونے والا سفر "آخری آدمی" پر ختم ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کل نفس ذائقۃ الموت۔

کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

.....☆☆.....

ابنِ صفی ایک بے نظیر ناول نگار

تحریر: فراز علی حیدری

جاسوسی ادب میں جس مصنف کو ایشیاء میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ جناب اسرار احمد المعروف ابنِ صفی ہیں۔ جب 26 جولائی 1928 کو اتر پردیش الٰہ آباد میں ابنِ صفی نے جنم لیا تو ان کے والدین کو اندازہ نہ تھا کہ عام سے علاقے میں پیدا ہونے والے اس شخص کی شہرت چہار سو پھیل جائے گی اور اس کے قلم سے تخلیق کردہ کردار اس کی موت کے بعد بھی اس کا نام زندہ رکھیں گے۔ ابنِ صفی کو اردو زبان میں جاسوسی ناول نگاری کا شہنشاہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جاسوسی کہانیاں اور ناول لکھنے والے تقریباً تمام مصنف ابنِ صفی مرحوم کو اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ بچوں اور بڑوں کے محبوب ادیب جناب اشتیاق احمد مرحوم نے اپنے ناولز میں اکثر اوقات ابنِ صفی کا ذکرِ خیر کیا اور برملا انہیں اپنا استاد تسلیم کیا۔

میری کتابوں سے ملاقات پہلی جماعت میں ہوئی۔ جب میرے امی ابو نے مجھے اخبار بینی میں دلچسپی لیتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر ابراہیم لائبریری لے آئے جہاں سے وہ خود ابنِ صفی، اشتیاق احمد، ایم اے راحت، علیم الحق حقی کے ناولز سمیت جاسوسی، سسپنس ڈائجسٹ وغیرہ لے کر پڑھتے تھے۔ ابتداء میں تو مجھے نونہال اور اشتیاق احمد کے ناول تھمائے گئے۔ پھر پانچویں جماعت سے ابنِ صفی کے ناول پڑھنے لگا۔ چونکہ کچا ذہن تھا اور عمران سیریز تھوڑی مزاحیہ لگتی تھی۔ اس لئے عمران سیریز پسندیدہ بن گئی۔ جاسوسی دنیا کے چند ناول پڑھ کر چھوڑ دیئے تھے کیونکہ وہ کافی سنجیدہ سے لگتے تھے۔ ابنِ صفی کے علاوہ مظہر کلیم، ایم اے راحت، صفدر شاہین کی عمران سیریز پڑھی مگر جو لطف ابنِ صفی کی تحاریر میں تھا وہ کسی اور میں کہاں۔

ابنِ صفی کی ناول نگاری کی مکمل اور جامع تعریف تو میرے بس کی بات نہیں بس اپنی محدود عقل کے مطابق جو کچھ ابھی تک محسوس کیا ہے اسے الفاظ میں ڈال کر پیش کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلی اور خاص چیز ان کی کردار نگاری ہے۔ خدا ہی جانے کیا سوچ کر انہوں نے اپنے ناول کے مرکزی کردار تخلیق کئے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود ان کے تخلیق کردہ کردار جاسوسی ادب سے شغف رکھنے والے افراد کے دل و دماغ پر راج کر رہے ہیں۔ انہوں اس خوبی سے کردار تخلیق کئے کہ ہر کردار کی عادات واطوار، حرکات و سکنات، شخصی خاکہ مکالمات ادا کرنے کا انداز دوسرے کردار سے بالکل جدا رکھا۔ کرنل فریدی کی سحر انگیز بارعب شخصیت، کیپٹن حمید کی شوخ و چنچل بے پرواہی سے بھری شخصیت، معصوم شیطان عمران کی حماقت آمیز ذہانت کی پراسرار شخصیت، انور، رشیدہ کا عجیب و غریب کردار، جوزف جیسا عجیب مالک پرست کردار سمیت ہر کردار اپنی جگہ لاجواب رہا ہے۔ مجرموں میں بات کی جائے تو لیونارڈ، سنگ ہی، تھریسیا، ہمبک دی گریٹ، ایڈلا واسمیت درجنوں ایسے کردار تخلیق کئے جو کہ مجرم اور منفی پرچھائیں رکھنے کے باوجود قارئین کے پسندیدہ کردار بن گئے۔

دوسری ان کی خصوصی خوبی کا ذکر کیا جائے تو وہ منظر نگاری ہے۔ کسی بھی کہانی کو سحر انگیز بنانے کے لئے اس کی منظر نگاری مضبوط ہونی چاہئے۔ ابنِ صفی مرحوم میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ ایسی زبردست منظر کشی کرتے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے گویا ان کے بیان کردہ لائنز کی ویڈیو چلنے لگتی اور وہ پوری طرح ان کے ناول کے سحر میں ڈوب جاتا۔ منظر نگاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت سے مقامات بھی تخلیق کئے۔ جن کی شہرت آج بھی ویسی ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولز میں معاشرتی مسائل کا بھی ذکر ہوتا۔ اکثر اوقات ان کے ناولز میں سیاسی طنز بھی ہوا کرتے تھے۔ بعض مذہبی باتیں اور پند و نصائح ایسے لطیف پیرائے میں بیان کرتے کہ دوست دشمن سب کے دل کو ان کی بیان کردہ بات

چھو جاتی۔ مزاح نگاری میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا۔ سنجیدہ حالات والے ناول میں بعض اوقات ایسے مزاحیہ حالات اور مکالمات تخلیق کر دیتے کہ قاری کا ہنستے ہنستے پیٹ درد ہو جائے۔

ان کے ناول حقیقت سے کافی قریب ہوتے تھے۔ آج کل کے کچھ جعلی مصنفین کی طرح وہ اپنے کرداروں کو مافوق الفطرت بنا کر پیش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کو عام انسانوں کی طرح حالات کا مقابلہ کرتے دکھاتے تھے۔ ان کے کردار کبھی فتح یاب ہوتے تو کبھی شکست کا منہ بھی دیکھتے تھے۔ ابنِ صفی کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس لئے اکثر وہ اپنے ناول میں ملکی و غیر ملکی کلچر، سیاسی و سماجی حالات، مختلف اقوام کے عروج و زوال کے اسباب تحریر کیا کرتے تھے۔ یہ معلومات ان کے قارئین کے لئے ایک بہترین تحفہ ثابت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ناول زمیں جاسوسی و جرائم کے مختلف اسراروں سے پردہ اٹھایا۔ زہر، جانوروں اور مختلف اقوام کی کلچر اور رھن سہن کا ذکر کیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا۔ ان کا قاری گھر بیٹھے پوری دنیا کی سیر کر لیتا تھا۔

ان کی تعریف تو لامحدود ہوتی جائے گی۔ میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیونکہ ابنِ صفی ایک بے نظیر ناول نگار، ایک عظیم انسان تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی جاسوسی ادب کا نام آئے گا وہاں ابنِ صفی کا نام لازمی لیا جائے گا۔ اللہ ابنِ صفی مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے۔ آمین

.....☆☆.....

ابن صفی ..... دی لیجنڈ

تحریر: عمار خالد (کیپٹن کولڈ)

کسی بھی سلسلے کے متعلق یہ میری پہلی تحریر ہے، لہٰذا اس معاملے میں مجھے قطعی طور پر ناتجربہ کار ہی سمجھئے، اور پھر موضوع بھی ایسا ہے کہ نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا پڑ رہا ہے، بات ہے ہم سب کے محبوب مصنف کو خراج تحسین پیش کرنے کی ہے، میں نہیں جانتا کہ یہ فریضہ اور ذمہ داری نبھا سکوں گا یا نہیں! بہر حال اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں۔

آج سے تین سال پہلے میں عمران کے کردار سے واقف ہوا، لیکن یہ کردار ابن صفی کا نہیں بلکہ کسی دوسرے مصنف کا تھا، اس وقت تک تو ابن صفی کے نام سے کان بھی آشنا نہ تھے، بہر حال لیبارٹریاں تباہ کرواتا گیا، اس ملک کے فارمولے اُس ملک اور اس ملک کے راز اِس ملک کرتا رہا۔

ایک دن اتفاق سے اسی طرح کا ایک ناول پڑھتے ہوئے والد صاحب نے دیکھ لیا اور کہا کہ صرف ابن صفی کو پڑھا کرو، پوچھا وہ کون ہیں، پھر انھوں نے مختصراً بتایا کہ یہ کردار انھیں کے تخلیق کردہ ہیں، میں نے کہا کہ آپ کیا جانیں، مسکراتے ہوئے بولے کہ اپنی جوانی میں ان کا مداح رہ چکا ہوں۔

اس گفتگو کے کچھ عرصہ بعد وہ میرے لئے کہیں سے "زیرو لینڈ کی تلاش پارٹ "1" لے آئے، پڑھی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا، ظاہر ہے میں اس عمران کا فین تھا جو مافوق الفطرت تھا، زبان و بیان میں زمین آسمان کا فرق تھا، بہت بور ہوا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، جعلی عمران سیریز پڑھتے پڑھتے مجھے موضوع کی یکسانیت سے چڑ سی ہو گئی، اتفاقاً یہاں سے جلد "درندوں کی بستی" ڈاؤنلوڈ ہو گئی، الفانسے اور تھریسیا نے عمران کے ساتھ مل کر ایسی فضا پیدا کی میں پوری جلد پڑھنے کے بعد بھی اسی کے سحر میں کھویا رہا، بے اختیار "خوفناک عمارت" ڈاؤنلوڈ کر کے پڑھی، ذہن کو دھچکا لگا، ایسا محسوس ہوا جیسے گہری

نیند سے بیدار ہوا ہوں، پھر تو جیسے نشہ سا ہو گیا، فی ناول روز کے حساب سے پڑھنے لگا۔

گزشتہ دنوں اسی گروپ کے توسط سے "جاسوسی دنیا" سے متعارف ہوا، "دلیر مجرم" جو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا، انسپکٹر فریدی صاحب بھی عمران سے کم نہ محسوس ہوئے، میری تو جیسے ہر دن عید ہو گئی، ایک دن عمران کا اور ایک دن فریدی کا کارنامہ پڑھنا شروع کر دیا، والدہ محترمہ میری خاصی "عزت افزائی" کرتیں کہ یہ لڑکا اندھا ہو جائے گا، کیونکہ میں نے تمام ناول موبائل پر پڑھے، لیکن والد صاحب جب بھی دیکھتے تو ہلکا سا مسکرا دیتے۔

حال ہی میں، میں نے ابن صفی کے تمام ناول مکمل کیے ہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ آج یہ تحریر لکھتے ہوئے جو محبت اور عقیدت ابن صفی صاحب کے لیے محسوس کر رہا ہوں، شاید ہی کبھی اچھے الفاظ میں بیان کر سکوں۔

اس زمانے میں جب انگلش ناولوں کے تراجم اور دوسرے فحش ناول ہوا کرتے تھے، جنسی ادب سیلاب کی طرح بہا کرتا تھا، ایک فرد واحد نے ان سب کو للکار کر شکست دی، نہ صرف شکست دی بلکہ اپنی صلاحیت کا ایسا لوہا منوایا جس کی مثال رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

سلیوٹ ہے اس شخص کو کہ جس نے تن تنہا یہ کارنامہ سرانجام دیا، لوگوں کو فریدی اور حمید سے ملوایا، یہ سارے کردار ہی ایسے تھے کہ ہر طرف انھی کا بول بالا ہو گیا، فریدی اور حمید کے کچھ عرصہ بعد جب عمران منظر عام پر آیا تو ہر طرف جیسے دھوم مچ گئی، ان کی شہرت کو گویا چار چاند لگ گئے، نہ صرف یہ کہ ابن صفی بلکہ ان کے کردار بھی ہمیشہ کے لئے امر ہو گئے۔

فریدی کی پرکشش و پراسرار شخصیت، حمید کی شرارتیں اور عمران کی حماقتیں کچھ ایسا سماں باندھتیں کہ قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر بیگانہ کہانی میں غرق ہو جاتا۔

کیا یہ ان کے فن کی عظمت اور ان کی تحریروں کا پرکیف جادو نہ تھا؟ جو ہمیں ایک ہی نشست میں ناول مکمل کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔؟

انگریزی ادب میں کرائم مسٹری لکھنے والی اگاتھا کرسٹی نے جس کی تعریف کی ہو، جس کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کہیں کہ "ابن صفی کا اردو ادب پر احسان ہے"..... وہ انسان جس نے آئی ایس آئی کو لیکچر تک دیے ہوں کیا اس کو خراج تحسین پیش کرنا آسان کام ہو گا.....؟

جاسوسی جیسے پیچیدہ موضوع پر ڈھائی سو سے زائد ناول، ڈھیروں مضامین، ہر ایک بے مثال، کوئی بھی دو کہانیاں ایسی نہیں کہ جن میں مماثلت ہو، ہر ایک کا انداز الگ، شاید یہی وجہ ہے کہ ہر ناول ذہن سے چپک کر رہ گیا، شاید ہی کوئی ایسا ناول ہو جس کی اسٹوری لائن ذہن میں نہ ہو، کیا یہ اس عظیم مصنف کا کمال نہیں.....؟

وہ شخص کیسے عام ہو سکتا ہے جو صرف سات سال کی عمر میں طلسم ہوشربا کی تمام جلدیں پڑھ لے اور وہ بھی کئی بار، آفرین ہے ان پر۔

دنیا کو فریدی اور عمران کی شخصیت سے عشق ہے، ان کی عقلمندی پر رشک ہے، لیکن اگر آپ حقیقت کا جائزہ لیں تو یہ دونوں ہی ابن صفی کی شخصیت کے کئی پہلوؤں میں سے دو پہلو ہیں، اگر یہ دونوں کردار اتنے کمال کے ہیں تو ان کے خالق کا کیا مقام ہو گا، ان کے لئے مزید محبت نہ پیدا ہو گی...؟

ان کے متفی کرداروں کی بھی اپنی الگ ہی شان ہے، اگر دنیا فریدی فریدی، حمید اور قاسم کو یاد رکھے گی تو لازمی طور پر جیرالڈ شاستری، لیونارڈ، مسٹر کیو، ڈاکٹر ڈریڈ، فتح اور کنور شمشاد کو بھی بھلانا آسان نہ ہو گا۔

اگر عمران اور اس کی سیکریٹ سروس کے ممبر یاد رہے تو سنگ ہی، تھریسیا، بوغا، ہمبگ دی گریٹ اور ایڈلاوا بھی قطعی نہ بھلائے جاسکیں گے۔

بلاشبہ ابن صفی عظیم مصنف تھے، ان کے ناولوں کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہم نے کبھی فریدی اور عمران کی شخصیات کو ایک دوسرے میں ضم ہوتے نہیں محسوس کیا، دونوں ہمیشہ جدا جدا رہے، اور کیوں نہ رہتے، قلم جس کے ہاتھ میں تھا اسے اللہ نے دانشوری ہی ایسی عطاء کی تھی کہ کبھی کسی کردار سے ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں کی۔

لکھنے کے لیے کاغذ کم دستیاب تھا، پھر بھی چند صفحات پر کہانی کا ایسا جال بنتے کہ قاری صرف ایک بار ہی پڑھنے پر اکتفا نہ کرتا، دلیر مجرم سے لے کر آخری آدمی تک ہر ناول کا عاشق ہوں، انہیں لاکھوں بار خراج تحسین پیش کرتا ہوں، ان کے کردار عام انسان تھے جنہیں وہ شکست بھی دلواتے، آپ کو یاد ہوگا کہ صفدر کی ایڈلاوا کے سامنے کیا حالت ہوئی تھی، حمید کا سر ناول موروثی ہوس کے ابتدائی صفحات میں زخمی ہوگیا تھا۔

ان کے کرداروں کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ 1950 کے بعد چند حقیقی انسان ہماری دنیا میں آئے، کئی کارنامے سرانجام دئے، اور پھر اچانک 1980 میں کائنات کی وسعتوں میں گم ہوگئے۔

کاش کہ ان کے ہزاروں کارنامے ہوتے، جنھیں میں بار بار پڑھتا رہتا، ان کے انتقال پر ملال کا منظر کہیں پڑھا، دھاڑیں مار کر رونے کو دل چاہا، "بازو مت چھیدو" والی بات دل میں اتر گئی، بہت درد بھرا منظر بیان کیا گیا تھا۔

مجھے اس بات پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ میں ان کے ناولوں کا قاری ہوں، بےمثال اور لازوال تفریح مہیا کرنے والے اس شخص کو اللہ جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کی روح کو ابدی سکون پہنچائے، میری طرف سے انھیں کروڑہا عقیدتیں، محبتیں اور خراج تحسین۔

......☆☆......

ابن صفی کے کردار / منظر نگاری

فخر الدین کیفی

ناول اور افسانوں میں جہاں کہانی، الفاظ کا چناؤ تکنیک کے ساتھ کلائمکس، اینٹی کلائمکس اور تجسس کی اہمیت ہے وہاں کردار نگاری اور منظر کشی بھی کچھ کم اہم نہیں گرچہ کبھی کبھی کہانی کی ڈیمانڈ کی وجہ سے منظر نگاری کی اہمیت کم ہوسکتی ہے بلکہ یہ کہانی میں بوجھل پن بھی پیدا کردیتی ہے لیکن ایک اچھا مصنف مختصر ترین الفاظ میں منظر کشی کر کے نہ صرف بوجھل پن دور کردیتا ہے بلکہ کہانی کا حسن بھی بڑھا دیتا۔

اس ہی طرح کردار نگاری کی بھی اپنی اہمیت ہے اور اس کے لیے مصنف کو کہانی اور کرداروں کی مناسبت سے طوالت سے کام لینا پڑتا ہے جس کے لیے 500 سے لے کر 1200 صفحات تک اردو کے ناول نگار بروئے کار لاتے ہیں جن کی مثال ناول انور شمیم سے لے کر علی پور کا ایلی تک میں ملتی ہے، لیکن 110 سے 125 صفحات تک محدود رہنے والے مصنف کے لیے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کیوں کہ ابن صفی نے اپنے کئی ناولوں میں یہ کر کے دکھایا ہے اور وہ بھی اتنی کامیابی کے ساتھ کہ ہزاروں صفحات سے تخلیق پانے والے کرداروں کی بنسبت سوڈیڑھ سو صفحات والے کردار قارئین کے ذہنوں سے اس طرح چپک کر رہ گئے ہیں کہ زبان زد عام ہیں اور لطف یہ کہ یہ ان کرداروں کے علاوہ ہیں جنھیں عام فہم زبان میں

ہیرو یا مرکزی کردار کہا جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ ثانوی ہی نہیں بلکہ منفی بھی ہوتے ہیں۔

ابن صفی کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ چند خصوصی ناولوں کو چھوڑ کر عمران کے ناول 110 اور فریدی کے ناول 125 صفحات پر مشتمل رہے ہیں، ان کہانیوں کی تکنیک ایسی جو کردار یا منظر نگاری کی بجائے تجسس اور کلائمکس کی زیادہ متقاضی رہی ہیں، اس پر ستم یہ بندش کہ محدود صفحات سے زیادہ نہ ہو جائیں جس کا حل ابن صفی نے مجبوراً یہ نکالا کہ کہانی کو ایک سے زیادہ حصوں میں پیش کر دیا، ان بندشوں کے باوجود ابن صفی نے کبھی کبھی تو ایسی منظر نگاری کی اور وہ بھی اتنے مختصر الفاظ میں کہ صفحات پر صفحات کالے کرنے والے وہ تاثر نہ پیدا کر سکے جو ابن صفی نے چند الفاظ میں پیش کر دیا۔ اس کے لیے ہمارا تجربہ بھی مستند ہو سکتا ہے کیونکہ ضخیم ناولوں میں ضخامت بڑھانے کے لیے ایسی منظر کشی کی جاتی ہے کہ منظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے صفحات پلٹتے بنتی ہے جبکہ ابن صفی کا پیش کیا ہوا منظر پڑھنے والے کے رگ و پے میں سما جاتا ہے مثلاً.....

جھلسانے والی گرمی میں ریت کے طوفان میں گھرے کیپٹن حمید کی پریشانی بیان کرتے ہیں قارئین کے پسینے میں نہیں چھوٹتے بلکہ انہیں اپنی ناک میں ریت کے ذرے بی گھستے محسوس ہوتے ہیں۔

اٹلی کی برف پوش پہاڑوں کے موٹیل کی مالکہ جب کیبل کار کو دور سے آتا دیکھ کر کافی کا برتن چولہے پر رکھتی ہے تو بال میں موجود آگ تاپتے ہوئے شکاریوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کے ہاتھ ہی نہیں مجمد ہونے لگتے ہیں بلکہ کافی کی خواہش بھی ہونے لگتی ہے۔

تیز بارش میں برساتی نالوں کی وجہ سے سڑک بند ہو جائے تو ڈاک خانے میں پناہ لینے والوں کی پریشانی اور طوفانی بارش کی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے ہم خود بھیگے ہوئے ہیں لیکن وہاں عمران کی موجودگی سے یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی سبیل کر لے گا۔

غرض تیز ہواؤں کے جھکڑ ہوں یا برف باری، رات کے اندھیرے میں بارش کے شور کے ساتھ گھڑے کی ٹاپوں کی آواز ہو یا گاڑی کے پہیے کے نیچے روڑوں کے کڑکڑانے کی آوازیں، قارئین کو سانس روکنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ہی ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ منظر کشی کا کمال ہی یہ ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ماحول اور منظر کا حصہ سمجھنے لگے ورنہ افق پر چاند اور بہتے ہوئے جھرنوں کا ذکر تو عام ہے۔

ہم چونکہ تحقیقاتی کام دلجمعی سے نہیں کر پاتے اس لیے ابن صفی کے ایسے چاہنے والوں کو جو لکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ ابن صفی کی منظر کشی کے حوالے سے ایسے ناول جن کی ایک دو مثال ہم نے دی ہیں منتخب کر کے باقاعدہ ناول کے حوالوں کے ساتھ ضبط تحریر میں لائیں ہمیں یقین ہے کہ انہیں اتنا مواد مل جائے گا کہ وہ ایک تحقیقاتی مقالہ لکھ سکتے ہیں۔

اوپر دی ہوئی مثالیں ہم نے دو تین ناولوں سے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر پیش کر دی اس لیے ناول کا نام وغیرہ ہم ان تحقیقاتی تجزیہ نگاروں پر چھوڑتے ہیں جو ہمارے مشورے پر عمل کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ منظر کشی پر ابن صفی نے سنجیدگی سے کبھی کوشش نہیں کی لیکن لگتا یہ ہی ہے کہ یہ منظر کشی ان سے بس سرزد ہو تو گئی لیکن انہوں نے فوراً اس پر بریک لگا دیا کیونکہ ان کی ساری توجہ کہانی کو دلچسپ پر تجسس بنانے پر ہوتی تھی لیکن انہوں نے کردار نگاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور کسی بھی کردار کی تخلیق میں اپنا علم، انسانی نفسیات و جبلت کو ضرور پیش نظر رکھا کسی بھی کردار کے منفی یا

مثبت پہلو کو اجاگر کرنے میں اس کے ایسا ہونے کی وجہ کو بھی ڈسکس کیا کہ آیا وہ کسی حاصل ماحول کے زیر اثر ایسا بن گیا یا اس کی وجہ اس کے ساتھ اس کے اپنوں یا غیروں کا برتاؤ رہا ہے۔

آج ہم عمران، فریدی، حمید جیسے مرکزی کرداروں کی بجائے چاہتے ہیں کہ دوسرے سپورٹنگ کرداروں کے ساتھ ساتھ دو تین منفی کرداروں کی بات کی جائے جیسے عمران کی صلاحیتوں سے پوری طرح فیضیاب ہونے والا کیپٹن فیاض، خود غرضی اور نرم دلی کا مجموعہ، جو اپنی نااہلی اور اپنے عہدے کی لاج رکھنے کے چکر میں پستا رہتا ہے، اس کے سسر بھی نفسیات کے طالب علموں کے لیے کافی پرکشش ہیں زہریلا آدمی اور پرنسز تارا بھی نفرت اور محبت کی انتہا پسندی کی بہترین مثال ہیں، ایسے بیسیوں کریکٹر ہیں جو اپنی اپنی نفسیات کی وجہ سے نفرت کے ساتھ قارئین کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے جیسے ''لاش کا بلاوہ'' میں عشرت کا باپ یا ''سائے کی لاش'' کی بیگم تنویر، ایسے بیسیوں کردار ہیں لیکن ہم چونکہ اختصار کے عادی ہیں اور ''مختصر مختصر ان ہی دو صفحات میں مکمل'' کے عادی ہیں اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں ہاں اگر کبھی ہمیں کوئی سیکرٹری میسر آ گیا تو پھر ان شاء اللہ ان کتابوں کے تمام کرداروں اور مناظر پر سیر حاصل بحث ضرور کریں گے ورنہ تحقیقاتی کام کرنے والے قابل استطاعت مصنفین کو ہماری صلائے عام تو ہے ہی اس لیے اجازت لینے سے پہلے دو ایک خصوصی منفی کرداروں کا بھی ذکر کر لیتے ہیں۔

ابن صفی نے جہاں ذہنوں سے چپک جانے والے عمران، فریدی، حمید، قاسم، جولیانا، روشی، صفدر وغیرہ دیے وہیں ایسے منفی کردار بھی دیے جن سے اتنی نفرت پیدا ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے ان کا انجام بد سے بدتر ہو اس ہی لیے جب ''اونچا شکار'' کے قانون سے بچ جانے والے مجرم کو فریدی صدر کے باڈی گارڈز کے ذریعے کیفر کردار کو پہنچاتا ہے تو قارئین کا دل چاہتا ہے کہ تالیاں پیٹے، غیر ملکی ایجنٹ جو ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں تو ان کے انجام پر بھی خوشی محسوس کی جاتی ہے لیکن ابن صفی کے دو منفی کردار ایسے بھی ہیں جن کی گرفتاری تو ہر قاری چاہتا ہے لیکن موت نہیں یہ تھریسیا اور سنگ ہی ہیں جن کے لیے قارئین ہی نہیں خود عمران کے دل میں بھی نرم گوشہ ہے اور یہ بھی یک طرفہ نہیں کیونکہ یہ دونوں مجرم بھی عمران کو رعایت دیتے رہے ہیں جس کی بہترین مثال وہ سچویشن ہے جب سنگ ہی کے ساتھیوں کے ہاتھوں عمران کی موت کا سن کر وہ صدمے اور غم میں اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے جہاں عمران کے ہاتھوں بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود سنگ ہی اور تھریسیا طرح دے جاتے ہیں وہیں فرائض کی ادائیگی میں ان دونوں کو ہتھکڑی پہنانے اور قانون کے حوالے کرنے کے باوجود ان کے جیل سے فرار ہونے پر عمران کو دکھ نہیں ہوتا۔

اختصار سے کام لینے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ابن صفی کی ایک اور خصوصیت کا ذکر نہ کریں کیونکہ وہ بھی بہت اہم ہیں انہوں نے دونوں سیریز میں ایسی دو دنیاؤں کو تخلیق کیا ہے جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں، ان میں موجود کلب، ہوٹل اور ریستوران اس طرح نظر آتے ہیں کہ معلوم ہو جاتا ہے یہ عمران سیریز کے ہیں یا جاسوسی دنیا کے عمران اور فریدی دونوں اپنے اپنے ملکوں کے دارالحکومت میں رہتے ہیں اور ان کے قرب وجوار میں ٹیکم گڑھ، رام گڑھ، تارجام، شاداب نگر کے علاوہ جھیلیں، جنگل اور پہاڑی سلسلے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو ان سے مانوس سمجھتا ہے وہ نیاگرہ جیسے بڑے ہوٹل، ٹپ ٹاپ یا بائی سرکل نائٹ کلب، آرلکچو بلکہ رائیٹل کلب تک میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا بلکہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کا رات دن کا اٹھنا بیٹھنا ان ہی بڑے ہوٹلوں میں ہے جہاں کبھرے، والٹر، چاچا وغیرہ کے ساتھ ساتھ

وہسکی، بوربن، شمپین ہی نہیں ملتی بلکہ نیس کیفے اور پولسن کافی کی خوش بو بھی سونگھنے کو مل جاتی ہے اتنی آسائشوں کے باوجود قارئین کا دل شراب کی طرف راغب نہیں ہوتا کیونکہ ان کے محبوب عمران اور فریدی اسے منہ لگانا پسند نہیں کرتے اور یہ ہی ابن صفی کی کامیابی ہے کہ جرائم کی دنیا میں بھی وہ قارئین کو قانون کی حدود میں ہی رکھتے ہیں۔

نوٹ: اگر کبھی ہماری یونیورسٹی کو توفیق ہوئی اور ابن صفی پر ڈاکٹریٹ دینے کا خیال آیا تو طالب علموں کو یہ دو موضوعات فوراً دستیاب ہوں گے۔(۱) ابن صفی کے کردار (۲) ابن صفی کی منظر کشی۔

.....☆☆.....

ابن صفی ایک عظیم ناول نگار

تحریر: محمد احسن تقویم

تمہید تھوڑی طویل ہے امید ہے آپ بور نہیں ہوں گے، میں نے کتابیں پڑھنے کا آغاز سب سے پہلے ٹارزن، عمرو عیار وغیرہ کے ناولز سے کیا تھا پھر اس کے بعد بچوں کے رسالے تعلیم و تربیت، آنکھ مچولی، نونہال، ٹوٹ بٹوٹ، بچوں کی دنیا وغیرہ پھر اس کے بعد اشتیاق احمد کے ناولز اور پھر ڈائجسٹ اور آخر میں ابن صفی کے ناولز پڑھے جو ابھی تک پڑھتا ہوں۔

ابن صفی سے متعارف مجھے اشتیاق احمد مرحوم نے کرایا تھا انہوں نے صاف طور پر لکھا کہ انہوں نے جاسوسی ناولز ابن صفی سے متاثر ہو کر لکھے تھے ویسے میرے ذاتی خیال میں ابن صفی کے بعد سری ادب میں جو کمال اللہ نے اشتیاق احمد کو دیا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے جس طرح بچوں کے لیے اعلیٰ پائے کا ادب لکھا یہ سب نہایت خاصے کی چیز ہے۔

میرا ایک بچپن کا دوست تھا پشاور میں کریم پورہ بازار کے قریب اس کی خالہ کا گھر تھا کریم پورہ کے پاس پرانی کتابوں کی ایک مارکیٹ ہے جسے چکہ گلہ کہا جاتا ہے وہ جب بھی خالہ کے گھر جاتا تو اسے جمع کیے ہوئے پیسے دیتا کہ میرے لیے رسالے اور ناولز لے آؤ وہ بھی ناولز کا شوقین تھا یہ آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے جب ہمیں جیب خرچ پانچ یا دس روپے ملا کرتا تھا۔

بہت زیادہ ہوا کرتی تھی جبکہ جیب میں پیسے Capacity اس زمانے میں پڑھنے کی بہت کم ہوتے تھے صحیح معنوں میں پیٹ کاٹ کر پیسے جمع کر کے ناولز منگوایا کرتا تھا اور جب وہ بہت جلدی ختم ہو جاتے تھے تو بہت کوفت ہوا کرتی ہائے کیا دور تھا وہ بھی۔

خیر ایک دن اسی طرح ناولز کے ''فاقوں کے دور میں وہ اپنے خالون کے گھر سے کچھ ڈائجسٹ اور کچھ نئے ناولز لایا اور مجھے بتایا کہ یہ عمران سیریز کے ناولز ہیں اور ان کو پڑھ کر تم پاگل ہو جاؤ گے۔

مجھے بہت حیرت ہوئی میں نے پوچھا کیا یہ بھی اشتیاق احمد کے ناولز کی طرح ''جاسوسی'' ناولز ہیں؟ اس نے بتایا کہ نہیں یہ نا صرف جاسوسی ناولز ہیں بلکہ ''ایکشن'' ناولز بھی ہیں اور یہ مظہر کلیم کے لکھے ہوئے ہیں۔

مظہر کلیم سے میری شناسائی بچوں کے ناولز مثلاً ٹارزن، عمرو عیار وغیرہ کے حوالے سے تھی پھر جب میں نے یہ ناولز پڑھے تو علی عمران صاحب ہمارے پسندیدہ کردار بن گئے۔

جب میں کچھ بڑا ہو گیا اور خود بازار تک جانے کے قابل ہو گیا تو ایک دن میں نے بازار سے ابن صفی کا ناول خریدا جو سب سے پہلا ناول پڑھا اس کا نام تھا ''لاشوں کا بازار'' ابن صفی کے پہلے ہی ناول نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا اور مجھے اندزہ

ہوگیا کہ یہ بہت اعلیٰ پائے کا سری ادب ہے۔

اصل میں جب ہم بہت زیادہ ناولز پڑھنے لگتے ہیں اور ہمارا مطالعہ وسیع ہوجاتا ہے تو ہمارا ٹیسٹ اور معیار بھی اسی طرح بلند ہوتا چلا جاتا ہے اچھے خاصے ناولز ہمیں بچکانہ لگنے لگتے ہیں اسی قسم کے دور میں جب ہمیں تقریباً سارے ہی ناولز واہیات لگنے لگے تھے ابن صفی سے تعارف ہوا اور ابن صفی کے ناولز جمع کرنے شروع کردیے۔

جب ابن صفی کا ناول ''گیت اور خون'' پڑھا تب مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ ابن صفی کے ناولز جاسوسی ناولز سے بھی بڑھ کر بہت آگے کی چیز ہیں۔

اس زمانے میں کافی ناولز جمع کیے جتنے بھی میسر ہوسکے ایک بابا کوہاٹی دروازے کے پاس اتوار بازار میں پرانی کتابوں کا اسٹال لگاتا تھا اس سے لاہور سے کچھ پرانے ناولز بھی منگوائے۔

اس کے علاوہ ایک جگہ بہت سے ''نئے افق'' ڈائجسٹ مل گئے جس کے آخری صفحات پر ابن صفی کی عمران سیریز کے ناول ہوا کرتے تھے وہ پوری بوری بھر کر گھر لایا تھا جس پر بہت جھاڑ بھی پڑی تھی گھر میں۔

پھر انٹرنیٹ سے ابن صفی کے سارے جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے ناولز ڈاؤن لوڈ کرلیے اور آج کل وہی زیر مطالعہ ہیں۔

ابھی میں عمران سیریز کی ''کلنگ چانگ'' سیریز پڑھ رہا ہوں یہ میرے پاس کتابی شکل میں بھی موجود ہے اور تقریباً 4 سال بعد تیسری مرتبہ پڑھی جارہی ہے۔

اچھا یہ بات بھی آپ کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ میں آفس لوکل گاڑی میں جاتا ہوں تو جب گاڑی روانہ ہوتی ہے تو میں موبائل پر ناول کھول کر بیٹھ جاتا ہوں، اسی طرح واپسی پر بھی پڑھتا ہوں۔

پہلے میں نے سارے ناولز متفرق پڑھے تھے جن میں سے درمیان میں سے کئی ناولز نہیں پڑھے تھے اب ترتیب سے سارے پڑھ رہا ہوں۔

میں نے جاسوسی دنیا کے بہت تھوڑے ناولز پڑھے ہیں اور عمران سیریز کے سارے ناولز پڑھ کر ارادہ ہے کہ جاسوسی دنیا کو از سر نو پڑھنا شروع کروں گا۔

ان سارے ناولز میں جو ہمگ دی گریٹ سیریز تھی اس نے تو میرے ہوش ہی اڑا دیے تھے میں نے ہمگ کے کردار کے بارے میں ایک ادھورا مضمون لکھ رکھا ہے کبھی فرصت ملی تو پورا لکھ کر آپ خواتین وحضرات کے ساتھ بھی شیئر کروں گا۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ابن صفی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ انہیں سری ادب کا شعور ہے وہ ایک نیچرل جاسوسی ناول نگار تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں ان کے ناولز کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ہر ناول دوسرے ناول سے بہت مختلف ہوتا ہے۔

میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے بہت زیادہ مصنفین کے ناولز پڑھے ہیں لیکن کچھ تھوڑے بہت پڑھے ہیں ایک مرتبہ بہت شوق ہوا تھا تو پشاور کی ارکانیوز لائبریری سے سر آرتھر کونن ڈائل کی سر لاک ہومز کے بھی کچھ ناول پڑھے تھے لیکن ابن صفی کے ناولز میں جو بھی سچویشنز ہوتی ہیں اور پھر جو مکالمے ہوتے ہیں وہ بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے کسی جاسوسی ناولز میں ہونے چاہیے۔ خصوصاً جب تھوڑے بہت انگریزی ناولز اور ان کے تراجم پڑھے تو یہ اندازہ اچھی طرح ہوگیا کہ ابن صفی کے

ناولز "عالمی" پائے کے ہیں۔

ایک بات جو مجھے شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ابن صف کے ناولز میں ایک خاص قسم کی رومانیت پائی جاتی ہے مجھے ان کے کرداروں میں ایک خاص رومان ملتا ہے ان کے مکالموں میں بھی ایک خاص قسم کی رومانوی کیفیت محسوس ہوتی ہے جس میں پڑھنے والا انسان جکڑا جاتا ہے ایسا یوں بھی ابن صفی بہت آسانی سے کر لیتے ہیں کہ ان کو شاعری میں بھی کمال حاصل ہے اور وہ بہت چھوٹے جملوں میں بہت اعلیٰ پائے کی بات کہہ جاتے ہیں جو کہ انسان پر ایک خاص کیفیت ڈالتی ہے جیسے کسی نے نثر میں شعر کہہ ڈالا ہو۔

اس کی مثال تو بہت سے ناولز ہیں لیکن میں ایک مرتبہ پھر "گیت اور خون" کا نام لوں گا آپ ذرا نام پر غور کریں نام ہی کس قدر شاعرانہ ہے۔

آپ سب سے ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ ابن صفی کا یہ فیس بک گروپ "دی گریٹ ابن صفی فینز کلب" میرے لیے نہایت اہم ہے اصل میں ہم خیال لوگوں سے ملنا یوں بھی اچھا لگتا ہے اسے بدقسمتی کہیے یا ادب سے تغافل، ہمارے حلقہ احباب اور گرد و پیش میں ایسے لوگ بہت کم ملے ہیں جو ادب سے شغف رکھتے ہوں اور بالخصوص ابن صفی کو بھی پڑھتے ہوں ایسے میں جب فیس بک پر اتنے اچھے اور باذوق احباب مل جائیں تو میرے لیے تو کسی سے دوستی کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہو جاتا ہے کہ کوئی یہ کہہ کر دے کہ میں ابن صفی کا فین ہوں۔

اسی حوالے سے جو لوگ بھی میرے دوست بنے ان میں سب سے اچھے اور بہترین دوستوں کی فہرست میں وہی لوگ سر فہرست رہے ہیں جو ابن صفی کی ناول نگاری سے متاثر تھے۔

.....☆☆.....

ابن صفی صاحب سے میرا پہلا تعارف

تحریر: اداعلی

میرا ہائی اسکول کا آخری پرچہ.....آزادی کا احساس.....اور پاپا کا وعدہ پورا ہونے کا دن..... چونکہ مجھے بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا اس لئے پاپا کی کتابیں لے کر پڑھنا چاہتی تھی، لیکن پاپا نے مجھ سے کہا..... "بیٹی جس دن تمہارا ٹیتھ کا آخری پیپر ہوگا اس دن میں تمہیں خود بہت اچھی کتابیں پڑھنے کے لئے دونگا"

آخر کار وہ دن آ ہی گیا، پھر پاپا نے مجھے اس وقت تقریباً بیس کتابیں سونپتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ابن صفی صاحب کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا ہے اس کو پڑھو اور ایک نئے جہان کی سیر کرو، ابن صفی صاحب کے نام سے تھوڑا بہت تو میں پہلے ہی واقف تھی کیونکہ اکثر و بیشتر ہمارے گھر میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا، امی اور چھوٹی پھپھو میں اکثر عمران اور فریدی کے متعلق مباحثے ہوتے تھے، پاپا اور پھپھو عمران کے دیوانے تھے، جبکہ امی فریدی کی عاشق تھیں۔

مجھے شروعات سے اپنے پاپا کو فالو کرنے کی عادت تھی، اس لئے میں نے عمران کے ناول سے ہی آغاز کیا، پہلا ناول "چالیس ایک باون" پڑھا، وہ بھی ان حالات میں کہ ان دنوں پھپھو کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں، امی اور پھوپھو سلائی کڑھائی کے کام میں مشغول رہتیں اور میں باآواز بلند ان کو روز دوپہر میں ایک کتاب پڑھ کر سناتی، چونکہ امی فریدی کی فین تھیں اس لئے ایک دن عمران سیریز تو ایک دن امی کی پسند کی وجہ سے جاسوسی دنیا کا ناول پڑھ کر سناتی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا

ورنہ شاید میں اس وقت صرف عمران سیریز ہی پڑھتی۔

خیر وہ کتابیں بھی ابن صفی صاحب کی تھیں اس لئے پسند تو آنا ہی تھیں، لیکن جو بے قراری عمران کو پڑھنے کے لئے ہوتی تھی وہ آج تک جاسوسی دنیا کے لئے نہیں ہوئی۔

میں نے خطرناک لاشیں، سرخ دائرہ، رات کا بھکاری، بلی چیختی ہے، سوالیہ نشان، شاہی نقارہ باآواز بلند پڑھ کر سنائیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میرا اردو تلفظ اور بھی بہتر ہو گیا، اس کے بعد تو میری ساری چھٹیاں عمران سیریز کے ساتھ گزریں۔

عمران کے ساتھ الگ الگ مقامات کی سیر، خطرناک مہمات، دلچسپ واقعات میں، میں اس قدر مگن ہو جاتی کہ پتا ہی نہ چلتا کہ کب چلچلاتی دوپہر نے شام کا سرمئی آنچل اوڑھ لیا.....!

ہوش تو اس وقت آتا جب ناول ختم ہو جاتا، ورنہ امی کی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمو کے بھی ناول کے اختتام سے پہلے بے اثر ہی رہتے، انہیں خوب صورت شب و روز میں پتا ہی نہیں چلا کب علی عمران میرا آئیڈیل بن گیا۔

انسان جب ذہن میں ایک آئیڈیل تخلیق کرتا ہے تو وہ ایسی مافوق الفطرت ہستی ہوتی ہے جس میں دنیا کی ہر اچھائی نظر آتی ہے، وہ آئیڈیل شخص ہماری دانست میں کبھی کوئی غلطی نہیں کرتا، یہ انسان کے لاشعور میں بیٹھی ہوئی وہ خواہش ہوتی ہے جو انسان خود میں دیکھنا چاہتا ہے۔

"یعنی دنیا کی ہر برائی سے پاک وجود"

انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لے، وہ خود کو چاہ کر بھی مکمل طور پر برائیوں سے بچا نہیں پاتا، شاید اسی خواہش کی تکمیل کے لئے اس کا ذہن ایک ایسا آئیڈیل تلاش کرتا ہے جو ہر گناہ، ہر خامی سے پاک ہو، اسی لئے اس کے ذہن میں ایک ایسا تصوراتی خاکہ بن جاتا ہے، جسے وہ فالو کرنا چاہتا ہے، شاید میں بھی ایسا ہی سوچتی ہوں، مجھے اپنے آئیڈیل کے روپ میں عمران نظر آتا ہے، اسی لئے مجھے اپنے اس خاکے کی سب اچھائیاں عمران کے کردار میں دکھائی دیتی ہیں۔

علی عمران، ابن صفی صاحب کی شخصیت کا ایک ایسا رخ ہے جس میں جذبات، احساسات، فرض شناسی اور حب الوطنی کی قوس قزح سمائی ہوئی ہے، جس کی ہر ادا دل کو چھو لیتی ہے، جس کی شخصیت کے ہر پہلو نے برصغیر کے سیکڑوں نہیں لاکھوں لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے، مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں بھی انہیں لاکھوں دیوانوں میں سے ایک ہوں۔

کبھی کبھی میری عمران سے متعلق یہ دیوانگی اس حد تک بڑھتی کہ میں اکثر پاپا کے سامنے روہانسی ہو جاتی اور ان سے سوال کرتی کہ میں ابن صفی صاحب کی زندگی میں ان کے فن پارے کیوں نہ پڑھ سکی.....! انہیں ابھی اور جینا چاہئے تھا، وہ کیوں اتنی جلدی چلے گئے.....! اور تب سے ہی میں نے اپنا یہ اصول بنا لیا کہ جب بھی کلام پاک ختم کرتی ہوں ابن صفی صاحب کو اس کا ثواب ارسال کرنا نہیں بھولتی، تہجد ہو یا فرض نمازیں ابن صفی صاحب کے لئے دعا لازماً کرتی ہوں، کیونکہ یہی انکی عظمت کے شایان شان بہترین خراج ہو سکتا ہے، نیز یہی میرے بس میں بھی ہے۔

ابن صفی صاحب!

ایک ایسا نام کہ ہر عمر کے انسان کو یکساں طور پر ان کے عقیدت مندوں کی فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے، پھر چاہے وہ اسی سال کے یاسر حسنین ہوں یا پچاسی سال کے سید اسد عادل، نوے سال کے معاذ ہوں یا سو سال کے ثاقب شیخ، صبیحہ یاسمین،

تبسم حجازی ہوں، یا پھر صفیہ ناز اور اداعلی جیسی کمسن بیٹیاں۔

سچ کہوں تو اس میں ابن صفی صاحب کے انداز تحریر کا ہی کمال ہے، میری ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میری تمام ہم جماعت بھی عمران سیریز کی پرستار تھیں، ہم لوگوں نے بارہا اپنے اپنے ذخیرے کا تبادلہ کیا۔

ابن صفی کے ناولوں میں جہاں ڈائریکٹر جنرل رحمان صاحب کا کردار ایک بزرگ باپ کو اپنے دل کے قریب محسوس ہوتا ہے، وہیں نوجوان خواتین وحضرات کو عمران، تنویر، رشیدہ، صفدر، جولیا، روشی، انور اور حمید کا پرکشش سحران کی تحریروں سے جدا نہیں ہونے دیتا۔

ان کرداروں کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ ہم ان کرداروں کی نفسیات، عادات اور رجحانات کو غیر اختیاری طور پر اپناتے چلے جاتے ہیں، ہر کردار کا اپنا ایک جدا انداز ہے، جس کی بنا پر ہمیں ان کو فوراً پہچان لینے میں قطعی دشواری نہیں ہوتی۔

اگر عمران کی کسی بے تکی شرارت پر کوئی صرف مسکراتا ہے تو ہم پہچان جائیں گے کہ وہ صفدر ہے،

اگر کوئی جل کر کباب ہو رہا ہے تو وہ نعمانی ہے،

اگر کوئی مرنے مارنے پر اتر آئے تو بلاشبہ تنویر ہی ہو سکتا ہے۔

کسی جاسوسی مصنف کے لئے چار چیزیں بہت اہم ہیں۔

1۔ کہانی کا موضوع

2۔ منظر نگاری

3۔ کردار نگاری

4۔ ایکشن

ابن صفی کے اب تک میں نے جتنے بھی ناولز پڑھے، کسی میں کہیں بھی کہانی کا کوئی ذرا سا واقعہ بھی دہرایا ہوا نہیں ملتا، وہ ہمیں ہر بار ایک نئی داستان سے روشناس کرواتے ہیں، وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ ان ناولوں کو متعدد بار پڑھنے کے بعد بھی ہر بار ایک نیا پہلو نظر آجاتا ہے۔

ابن صفی صاحب نے دنیا کے ہر طبقے کے لئے سبق آموز کہانیاں چھوڑی ہیں، انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے، انکی تحریروں میں ایک خاص رجحان ہمیشہ محسوس ہوتا ہے، نظام قدرت سے بغاوت سے ہونے والے نقصانات کو انھوں نے بہت جگہ اجاگر کیا ہے، دنیا کے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے جنہیں ڈسکس کرتے ہوئے عام انسان جھجکتا ہے، جبکہ ابن صفی ایسی باتوں کو بڑے ہی تفریحی انداز میں ڈسکس کر جاتے ہیں۔

اب یہی دیکھئے قاسم کا کردار مضحکہ خیز ہو کر ہم سب کی دلچسپی کا سامان ہے، لیکن کیا یہ سماج کا ایک بہت اہم مسئلہ نہیں ہے.....! یعنی بے جوڑ شادیاں.....! جو اکثر ذات برادری، اور جائداد کو تقسیم سے بچانے کے لئے عمل میں آتی ہیں اور عموماً اس کے بڑے سنگین نتائج بھگتنا پڑتے ہیں، عام طور سے ایسی شادیاں ناکام ہی رہتی ہیں۔

کہیں انسان کا جذبہ انتقام کسی معصوم اور سادہ مزاج شخص کو جلاد بنا دیتا ہے (نیلے پرندے، ایڈلاوا، بے چارہ شہزور)۔

کہیں دولت کی ریل پیل کے باوجود بھی انسان کی دولت میں مزید زیادتی کی ہوس انسان کو چین سے نہیں رہنے دیتی

(الٹی تصویر، صحرائی دیوانہ، بابا سگ پرست)۔
کہیں ذراسی لغزش بھی وبال جان بن جاتی ہے(مونالیزا کی نواسی، خونی فنکار)۔
کہیں جلن اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ قاتل بنا دیتی ہے(کالی تصویر، دوہرا قتل)۔
کہیں جذبہ محبت ایسے لوگوں کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے جو اسکے قابل ہی نہیں ہوتے (ڈیڑھ متوالے، سیکڑوں ہمشکل)۔

ابن صفی نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ ہم سب کو یہی پیغام دیا ہے کہ جب بھی کوئی چیز اعتدال سے تجاوز کر جائے گی، حد سے زیادہ بڑھ جائے گی وہ نقصانات وجرائم کا باعث بنے گی، پھر چاہے وہ جذبات کی زیادتی ہو، دولت کی ہوس ہو، حد سے بڑھی ہوئی غربت اور مفلسی ہو۔

دنیا میں عموماً جرائم انہیں وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں، انہیں سنگین جرائم کی دنیا میں قدم رکھ کر کچھ لوگ اپنا مستقبل برباد کر کے اپنا اور دوسروں کا نقصان کر لیتے۔

ابن صفی صاحب کے حقیقی فین ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان کے تحریر کردہ اسباق سے استفادہ کریں، اپنے جذبات کو اعتدال میں رکھیں، نظام قدرت کی نفی کرنے سے باز رہیں، اس بات کو اپنی خوش نصیبی سمجھیں کہ ایک اعلیٰ مصنف کی تحریریں ہم تک پہنچیں، زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے کے لئے ایک مخصوص سلیقہ میسر آیا، اچھے برے میں تمیز کرنے کا ہنر ملا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ایک بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ابن صفی صاحب کو پڑھنے والا اپنے اردگرد ہونے والے واقعات پر بالکل الگ انداز میں غور وفکر کرتا ہے، ان کی تحاریر زندگی کے ہر پہلو پر غیر محسوس انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔

آخیر میں یہی دعا ہے کہ، اللہ تعالیٰ ابن صفی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے

......☆☆......

ابن صفی : میرا فخر میرا جنون!

تحریر: حافظ محمد بلال رمضان

ابن صفی میرے پسندیدہ مصنف ہیں اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ابن صفی کا قاری ہوں، ابن صفی کو پسند کرنے کی درحقیقت ان گنت وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر اب تو انہیں اس قدر اور اتنی محبت سے بے تحاشہ پڑھ چکا ہوں کہ مجھے کسی وجہ کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ مجھے خوشی ملتی ہے جب خود کو ابن صفی کا پرستار کہتا ہوں، یعنی ابن صفی سے محبت میرے لیے خوشی کا حصول ہے۔

عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے تعارف کے بعد سے لے کر ایک ایک ناول پانچ چھ بار پڑھنے تک ذہن کے کونے کونے میں ابن صفی کا نام ثبت ہو کر رہ گیا اور پھر باقاعدگی سے اس قدر پڑھنے کے بعد بھی ان کی تحریروں کو چھوڑ نہیں پایا، اب بھی جب کبھی موقع ملتا ہے تو ایک بار پھر اسی جانی پہچانی دنیا کی سیر کرنے نکل پڑتا ہوں، بالخصوص عصر کے بعد یونیورسٹی لان میں درختوں سے گھرے بینچ پر سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر بیک گراونڈ میں ہلکی موسیقی سنتے ہوئے ابن صفی کو پڑھنا ایک ناقابل بیان حد تک سحر انگیز اور لطف انگیز فینٹسی میں گم کر دیتا ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے شام کی تاریکی جب دھیرے دھیرے اپنی پراسراریت پھیلاتی ہے تو ایسے میں ابن صفی کی منظر نگاری اور عمران یا فریدی کے کارنامے اور ناول میں موجود لاجواب مزاح ایک عجیب وغریب تخیلاتی دنیا کو جنم دیتا ہے، جس میں کھو کر انسان اردگرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

پھر جب اندھیرا چھانے لگتا ہے اور ناول سے نگاہ اوپر اٹھتی ہے تو درختوں میں چھپی تاریکی اور اردگرد چھایا سکوت روح کو بالکل ہلکا اور بے خود کر دیتا ہے، بادلوں سے ڈھکا آسمان ہو یا رم جھم برستی بارش، جتنا لطف ان موسموں میں ابن صفی کو پڑھنے کا آتا ہے ویسا کہیں اور کسی اور کی تحریر پڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوا۔

اپنی تحریر کے ذریعے قاری پر اتنا گہرا اثر چھوڑنا ذاتی تجربے کے تحت تو صرف ابن صفی کا خاصہ ہے، میں نے بہت باقاعدگی سے ایک عرصہ عمران سیریز دجاسوسی دنیا کا مطالعہ کیا ہے، اب بھی اگر بہت دن گزر جائیں اور ابن صفی کو نہ پڑھیں تو کبھی بیٹھے بٹھائے اچانک ایک عجیب سی کسک اٹھتی ہے اور بے اختیار ناولوں کے منظر اور کردار بالخصوص مزاح یاد آنے لگتا ہے، تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے ماضی کی خوبصورت یادیں انسان کو یاد آتی رہتی ہیں بالکل ایسے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں حقیقت میں ایک عرصہ ان کرداروں کے ساتھ رہا ہوں اور میرا اندازہ شاید درست ہو کہ آپ لوگ بھی اس قسم کے کسی تجربے سے ضرور گزر چکے ہوں گے۔

ذرا سوچئے کہ ایک ادیب کی اس سے بڑی خوبی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے ایسا سحر طاری کر دے جو لازوال ہو اور پڑھنے والے کو اسی کا ایک حصہ بنا دے، ایسا طلسم ہو جو ایک زمانہ گزرنے کے باوجود پراثر رہے۔

مجھے نہیں لگتا کہ ادب میں کسی اور کردار کو چاہنے والے اس سے اس قدر محبت رکھتے ہوں گے جتنی ابن صفی کا قاری عمران اور فریدی سے رکھتا ہے، اتنے جنون سے تو ہرگز نہیں، اردو کے دوسرے بہت سے ناول نگار بلاشبہ اپنے ناولوں میں الگ دنیا رکھتے ہوں گے مگر ابن صفی کا انداز، کردار نگاری، نثر اور مزاح منفرد ہے، کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ترجیحات بدلتی ہیں اور پسند ناپسند از سر نو مرتب ہوتی رہتی ہیں، یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر پتہ نہیں کیوں میں اتنے یقین سے یہ سمجھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں کبھی بھی ابن صفی کے طلسم سے اور ان سے وابستہ محبت سے نہیں نکل پاؤں گا، ان کی پہلی تحریر سے ہی میں ان کا ڈائی ہارڈ فین ہوا اور اب تک ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ یہ وابستگی وعقیدت ہمیشہ قائم رہے گی۔

رب کے حضور دعا ہے کہ رب العظیم ابن صفی مرحوم کے درجات بہت بلند فرمائے۔ آمین

.....☆☆.....

عہد ساز مصنف، عہد ساز کردار

تحریر: فرخ ملک

اسد بھائی نے فرمائش کی کہ میں ابن صفی کی سالگرہ کی مناسبت سے ایک مضمون لکھ کر ان کو خراج عقیدت پیش کروں، ان کی فرمائش بالکل بجا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں کوئی مصنف، کالم نگار یا تجزیہ نگار نہیں ہوں، اس لئے درج ذیل مضمون پر تنقید یا میرے بارے میں کمنٹس کر کے میرا دل مت دکھایئے گا، یہ آپ سے عاجزانہ درخواست ہے۔

میں شاید اس گروپ میں واحد ایسا شخص ہوں جس نے دور قدیم کے عمران سے لے کر دور جدید تک کے عمران کو پڑھنے کا

سفر طے کیا ہے، اس درمیان عمران سیریز میں سیکڑوں عروج وزوال آئے، مختلف لوگوں نے اس پر مختلف انداز میں لکھ کر اپنی دانست میں عمران کو عروج پر پہنچایا، جب کہ اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ دراصل یہ لوگ جس کو عمران کا عروج کہتے ہیں وہ اس کا زوال ہے۔

اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف، جب اسد بھائی نے تحریر کا مطالبہ کیا تو میں ان سے انکار نہیں کرسکا، ابن صفی کا بھلا کون ایسا فین ہوگا جو ان پر لکھنے کی سعادت حاصل نہیں کرنا چاہے گا اور سعادت بھی ایسی کہ ابن صفی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہو۔

انھیں سب باتوں کو سوچ کر میں ابن صفی کو خراج عقیدت پیش کرنے والی تحریر لکھنے سے انکار نہیں کرسکا، انکار کرکے میں اپنا نام ادب کے ان ٹھیکداروں کی فہرست میں نہیں لانا چاہتا جو آج تک ادب کی گھنٹی لئے اس بات کا ادراک نہیں کرپائے کہ یہ گھنٹی کس کے گلے میں ڈالی جائے۔

آج کے پرفتن دور میں جب آئے دن دھماکے، ہلاکتیں، اموات اور سیاسی لطیفے بازی ہماری زندگی کا حصہ بن گئے ہیں تو ان سب حوادث کی سنگینی سے دل پر اور دماغ پر پڑنے والے بوجھ کو ہم مطالعے کی گہری گرد تلے دبا کر جینے کی لگن سے چمٹے ہوئے ہیں، زندگی یقینا ان حوادث کے زیر بار ہونے سے تلخ ہوگئی ہے، پھر بھی اس سب کے باوجود حکم خداوندی کے مطابق جینا تو ہے ہی.........تو بس جی رہے ہیں۔

آج کے تیز ترین دور میں معلومات شیئر کرنے کا جو کام فیس بک، گوگل اور موبائل وغیرہ کر رہے ہیں یہی کام آج سے پون صدی قبل ابن صفی نے کرنا شروع کیا جب ٹیکنالوجی نام کی بلا کا وجود بھی نہیں تھا، جس طرح ابن الہیثم نے اس وقت آنکھ کا معائنہ کرنے کے لیے خوردبین کی ایجاد کی تھی، جب ایسا سوچنا بھی محال تھا، بالکل اسی طرح پون صدی قبل ذہنوں کو بدل دینے کا آئیڈیا، (دیو پیکر درندہ، ٹسڈل کی بیداری)، دور جدید کے ڈرون، واسکڈ میزائل (آتشی پرندہ، لاشوں کا آبشار)، فولادی انسان (طوفان کا اغواء) اور تو اور جیرالڈ شاستری کا منصوبہ، اس نے ایک ایسی مشین ایجاد کی تھی جس کی مدد سے انسان اور گوریلے کی قوت کو ایک کردیتی تھی (جنگل کی آگ، موت کی چٹان)، اب تو اس موضوع پر بے شمار موویز بن کر ریکارڈ قائم کرچکی ہیں، اور اس جیسے لامحدود آئیڈیاز جن کو پندرہ سو الفاظ میں سمو دینا ایک ناممکن کام ہے۔

ابن صفی کا ایک کارنامہ اور ہمارے لئے ان کا تحفہ خاص یہ بھی ہے کہ ان کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز سے ہمیں دنیا جہان کی معلومات، ملک ملک کی سیر، ملک ملک کے دوست، ملک ملک کی روایات اور رہن سہن، کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ہم اُن کے ناولوں کو حرف بحرف، لفظ بلفظ پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ لفظ ہمارے ذہن پر اس منظر، اس ملک کی تصویریں بنا رہے ہوں، تصور کے پردہ پر ایک فلم سی چلنے لگتی ہے، جیسا ناول ہو ویسی فلم، پھر ہم کیوں نہ ان کو قدیم دور کے فیس بک، گوگل اور یوٹیوب کا بانی سمجھیں......! ان کا فیس بک، گوگل اور یوٹیوب آج پیش کی جانے والی اس جدید ترین ترسیلات سے لاکھوں گنا بہتر تھے، کیونکہ ہم اس فیس بک گوگل پر کسی قسم کی واہیات چیز کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، جبکہ زمانہ حال کے فیس بک، گوگل اور یوٹیوب پر یہ سب خرابات موجود ہیں۔

ابن صفی صاف وشفاف ذہن کے مالک تھے، انھوں نے لاکھوں ذہنوں کو اجلا کیا، جبکہ دور جدید میں کچھ لکھنے والے آج

بھی گندے ہیں اور دوسروں کے ذہنوں کو بھی گندا کر رہے ہیں..... مگر دفع کریں جی..... ہم بات کر رہے ہیں اپنے گریٹ ابن صفی کی..... ابن صفی جو اس وقت کے قلندر تھے نے اپنی ذہنی فراست سے آنے والے وقت کی تصویر دیکھ لی تھی، انھوں نے اپنے اجلے پن سے فریدی تراشا، اسے سنجیدگی اور بردباری کا پیکر بنایا، رعب دیا اور پتھر جیسا سخت بنایا، پھر جب بن گیا تو انہیں خیال آیا کہ یہ کیا.....! میں نے اسے اتنا سخت کیوں بنا دیا، مگر وہ تو بن چکا تھا، اب کیا ہو سکتا ہے.....! پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے، کچھ دیر بعد آہستہ سے مسکرائے اور جھٹ سے عمران کا کردار بھی تشکیل دیدیا

بھولا بھالا معصوم چہرے والا عمران، مگر یہ اتنا معصوم ہے تو اس سے ملکی خدمت کیسے لی جائے.....! انھوں نے دوبارہ سوچا اور اس میں تھوڑی سی مکاری بھی ڈال دی، لیکن یہ وہ مکاری نہیں تھی جو دوستوں اور اپنوں سے کی جاتی ہے، یہ مکاری صرف وطن کے دفاع کے لئے تھی بس اور اس کا کوئی مصرف نہیں تھا، ان کے عمران نے اپنی مکاری سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

پھر انھوں نے حمید تراشا، انور، رشیدہ، صفدر، جولیا، تنویر، نیلم، خاور، نیمو، چوہان، قاسم، صدیقی، جوزف، بلیک زیرو، اور کئی مزید ہیرے تراشے، ان کرداروں پر باتیں کرنا بھی یقیناً اس عظیم مصنف کو خراج تحسین پیش کرنے جیسا ہی ہوگا، جس نے اس دور میں فحاشی و بے حیائی سے اس وقت کے نوجوانوں کو محفوظ رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔

ایک وقت تھا جب وزارت خارجہ کی سیکرٹ سروس کے چیف علی عمران اور انسپکٹر ہو کر بھی کرنل کا رتبہ پالینے والے فریدی کا چرچا چاروں طرف عام تھا، ایسے میں شاید ہی کوئی بزرگ، کوئی ادھیڑ عمر اور کوئی نوجوان یا طالب علم ان سے اجنبیت کا اقرار کرپاتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ پانچ دوستوں کی محفل میں ہونے والی بحث اور ایک شخص کا چیلنج اس حد تک پُر اثر ہو جائے گا کہ صرف چند ہی ہفتوں میں اس کے کردار کا طوطی پورے برصغیر میں بولنے لگے گا۔

وقت اس کے کردار کا نام انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید تھا، ویسے تو انسپکٹر نام ذہن میں آتے ہی ایک موٹی توند والے شخص کا تصور ذہن کے پردوں پر ابھرتا ہے، لیکن جب انسپکٹر کے نام کے ساتھ لفظ فریدی جڑ جائے تو ایک انتہائی سنجیدہ بردبار، پروقار، ذہین، چست، چالاک اور پرکشش سا چہرہ ہمارے تصور میں ابھرتا ہے۔

مختلف لوگوں کے ذہن میں فریدی کا تصوراتی خاکہ مختلف ہوتا ہے اور سوچنے والا سوچتا ہے کہ فریدی اتنا حسین ہوگا، اتنا ذہین ہوگا، ایسا دِکھتا ہوگا، نہیں بلکہ ایسا دِکھتا ہوگا، یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے، اور ہر بار بننے والا خاکہ پچھلے خاکے سے کہیں زیادہ بہترین ہونے کے باوجود ذہن کو اس بات پر آمادہ نہیں ہونے دیتا کہ یہ خاکہ ٹھیک ہے، پتہ نہیں ابن صفی صاحب نے کسے دیکھ کر انسپکٹر فریدی کا کردار تخلیق کیا ہوگا.....!

رہ گئی بات سارجنٹ حمید کی تو پتہ نہیں ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہماری اور حمید کی شخصیت ایک ہو، یہ بات ڈھٹائی کے ساتھ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ سارجنٹ حمید کو ہم اپنا سراپا سمجھتے ہیں، ارے ہنسیئے مت، ہم ہوائی نہیں چھوڑ رہے ہیں، کیونکہ ہم واقعی ایسے ہی ہیں، تھوڑے شرارتی، تھوڑے دل پھینک، تھوڑے جوکر اور تھوڑے واہیات بھی، بس اس لئے حمید کی طرح دل لگی اور فلرٹ تو کر لیتے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود یقین جانیئے اس سے آگے بات بڑھنے سے پہلے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ شادی سے پہلے تو بالکل نہیں..... لاحول ولا قوۃ، دیکھئے بات کہاں سے کہاں نکل گئی، ہاں تو بات ہو رہی تھی کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کی، جی ہاں..... تو پھر ہوا یوں کہ سارجنٹ حمید انسپکٹر فریدی کے ساتھ خود نہیں آیا، بس یہ ایک اتفاق تھا، وہ تو اپنے باپ کو چڑانے جا رہا تھا اور پھر عمر چڑاتے ہی گزر گئی۔

اب آتے ہیں عمران کی طرف، ایک نوعمر خوبصورت سا نوجوان ٹائی باندھ رہا تھا، ہم نے تو بھئی جب پہلی بار اسے ٹائی باندھتے دیکھا تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ احمق سا نوجوان جسے ٹائی تک باندھنی نہیں آتی، ایک دن دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والی تنظیم زیرو لینڈ کے سامنے ایک چٹان بن جائے گا۔

اس سارے سفر میں دنیا کے کئی مشہور ترین مجرم اس کے مقابل آئے، جنھیں اس نے چٹکیوں میں اڑا کر رکھ دیا، کوئی بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا، الفانسے، تھریسیا بمبل آف بوہیما، سنگ ہی، ایڈلاوا، کنگ چانگ، الفروزے، ڈاکٹر دعا گو، لاوال، بوغا وغیرہ وغیرہ۔

انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید نے مل کے جاسوسی دنیا میں رنگ آمیزی کی تو دوسری جانب علی عمران نے تن تنہا ایکسٹو کا عہدہ تخلیق کر کے اس کی سیکریٹ سروس تشکیل دی۔

فریدی جیسا بردبار، ٹھوس، بہادر، ذہین ترین اور اصولوں پر کاربند نہ ہونے کے باوجود بھی علی عمران ایک لومڑ کی طرح چست دچالاک، موقع پرست انسان دوست اور وطن پرست ہے، حمید کی کافی خوبیاں اس میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، اگر سنجیدہ سراغ رسی کا معاملہ ہو تو ابن صفی صاحب نے فریدی سیریز کو ترجیح دی اور اگر سراغ رسی میں کچھ شوخیاں کچھ مستیاں اور ظرافت ڈالنا پڑی تو عمران سیریز کا انتخاب کیا۔

فریدی اور عمران دونوں ایسے کردار ہیں جن میں کئی باتیں مشترک ہیں، سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ دونوں خواتین سے ایک مخصوص دوری بنا کر رکھتے ہیں، جبکہ برصغیر پاک و ہند میں اردو ناول، اردو ڈرامے، اردو فلمز وغیرہ میں ہیرو کے ساتھ ہیروئین کا تصور لازم وملزوم ہے۔

شاید ہی کوئی مصنف ایسا ہوگا جس نے ایک بھی ایسی کہانی لکھی ہو جس میں ہیرو کے ساتھ ہیروئن نہ ہو، اس ضمن میں اگر ابن صفی کی بات کی جائے تو انھوں نے دو سو پینتالیس سے زیادہ ایسی لازوال تحریریں لکھیں جو ہیروئن کے بغیر تھیں۔

ان کی تحریروں کی کامیابی اور مقبولیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ آج تقریباً چالیس برس گزرنے کے باوجود ان کی کتابیں چھپتی ہیں، جس کے متعدد ایڈیشن بک چکے ہیں، شاید ہی کسی کو ان چھپنے والے ایڈیشنوں کی صحیح تعداد یاد ہو۔

ان کے کردار ان کے قارئین کے دل و دماغ میں آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے، بہرحال یہ ایک حقیقت ہے آپ مانیں یا نہ مانیں کہ ابن صفی صاحب ایک ایسے مصنف..... بلکہ ایک ایسے فنکار تھے کہ جس نے بھی انہیں پڑھا، ابن صفی اپنے الفاظ کے ذریعہ اس میں سماتے چلے گئے، لیکن کیا ہے ناں کہ کئی ایسے بھی ان میں شامل ہو گئے جنھوں نے ان الفاظ کی شکل میں اپنے اندر آجانے والے اس صوفیانہ رنگ کا غلط استعمال کیا اور معتوب ٹھہرے اپنی نظر میں بھی اور ہماری نظر میں بھی۔

ابن صفی ایک ایسا موضوع ہیں جس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، ان کے محاسن وخوبیاں بیان کی جائیں تو داستان کم لگنے لگے، مگر یہاں ہم کو پندرہ سو الفاظ کی ڈیڈ لائن ملی ہوئی ہے، اور میں نے اس مضمون کو تھوڑا طویل کر کے اس میں الفاظ کی تعداد

پندرہ سوانسٹھ کردی ہے اس لیے اسی پر گزارا کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا۔

......☆☆......

ابن صفی، نو عمر ذہنوں کی تربیت کرنے والے سری ادب کے خالق

تحریر: تبسم حجازی

ابن صفی کے بارے میں کچھ لکھنا ہم جیسے عام قاریوں کے بس کی بات تو نہیں ہے یہ تو بس ان سے محبت اور عقیدت کا معمولی سا اظہار ہے، ابن صفی سے میرا تعارف 11,12 سال کی عمر میں اس وقت ہوا جب گرمی کی تعطیلات میں ''مونا لیزا کی نواسی'' ہاتھ لگا اور والدین سے پڑھنے کی اجازت بھی مل گئی (جی پچھلی صدی میں بچے والدین کی اجازت سے کام کرتے تھے)

یہ ناول پڑھ چکنے کے بعد اگلے کئی سالوں تک ابن صفی کے ناول ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے کا جنون رہا شروعات میں تو ان ناولوں کو سری ادب کے طور پر ہی انجوائے کیا پھر طنز و مزاح سے لطف اٹھایا لیکن جس چیز کا ادراک بہت بعد میں ہوا وہ یہ تھی کہ ان کی کتابوں نے نو عمر ذہن کی تربیت میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

ابن صفی نے یہ سلسلہ اپنے وقت کے نوجوانوں کو فحش ادب سے دور رکھنے کے لیے شروع کیا تھا شاید انہیں اندازہ بھی نہ رہا ہو کہ یہ ناول آئندہ کئی نسلوں کے بچوں کی ذہنی تربیت میں بھی اہم ہو سکتے ہیں ابن صفی نے یہ کام لمبی تقریروں سے نہیں اپنے زندہ جاوید کرداروں کے عمل سے کیا اللہ پر مکمل ایمان، قانون کا احترام، انسانی جان کی قدر، مظلوموں کی مدد یہ ان کے کرداروں کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

والدین کا احترام (عمران جیسا اعلیٰ عہدیدار اپنے والد کی ڈانٹ اور والدہ کی جوتیاں ہنستے ہوئے کھاتا ہے) نرمی اور انسانیت (فریدی کا اپنے ملازموں سے مشفقانہ برتاؤ) ایمانداری (عمران کا بھوک کے عالم میں بھی بھیٹر چراتے ہوئے پیسے رکھ آنا) عورتوں کا احترام وغیرہ یہ سارے اسباق آپ لاشعوری طور پر ان کتابوں سے سیکھتے ہیں۔

ایک اور بات جو کہ ابن صفی کے ناولوں میں مجھے بہت پسند ہے کہ ان کے ناولوں میں عورت صرف تفریح طبع کے لیے نہیں ہوتی اس کا ایک اہم کردار اور شخصیت ہوتی ہے ان کے لکھے فی میل کردار مختلف رنگوں کے ہیں تھریسیا اور نانو جیسی مجرمانہ ذہنیت والی عورتوں کے ساتھ روشی، کنول اور زینت جیسی بہادر خواتین بھی ہیں، شمی جیسی معصوم صبیحہ جیسی شریر، ام بنی، میر بانا جیسی مخلص بھی اور اس کے ساتھ ہی عامرہ جیسی پراسرار لڑکیاں بھی۔

یہ کردار اس وقت لکھے گئے جب ہماری خواتین کی دنیا محض چار دیواری تک محدود تھی ایسے میں متذکرہ بالا نسوانی کرداروں کو اپنے ناولوں میں جگہ دینا انہیں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا انہی کا وصف تھا۔

ابن صفی کے ناولوں کا اثر یہ ہے کہ کسی ویب سائٹ پر ایک سوال تھا کہ آپ بچپن میں کیا بننا چاہتے تھے تو اتنے سالوں بعد بھی ان کے فینز کا جواب تھا سیکرٹ ایجنٹ۔

......☆☆......

اور جام آج بھی چھلک رہا ہے

تحریر: محمد زبیر

کہتے ہیں جاسوس دہری زندگی گزارتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے گھر والے بھی اصلیت سے ناواقف ہوتے ہیں اور یہی خاصیت کسی بھی اچھے جاسوس کی کامیابی کا راز ہوتی ہے۔

ابنِ صفی 1928 کو پیدا ہوئے اور کئی ناولوں سے پتہ چلتا ہے کہ علی عمران کی پیدائش کا بھی یہی سال ہے، عمران کے گھر والے اور آس پاس کے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ عمران کا پیشہ بلیک میلنگ ہے، کیا خبر ابن صفی صاحب بھی ایک منجھے ہوئے جاسوس رہے ہوں اور آس پاس کے لوگوں کو خبر تک نہ ہو، کیونکہ ان کے ناول پڑھ کر ہرگز یقین نہیں ہوتا کہ یہ سب ناول ایک کمرے میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں، جبکہ اُس زمانے میں انٹرنیٹ جیسی سہولیات بھی دستیاب نہیں تھیں۔

ایک شخص کتنا پڑھ سکتا ہے.....! آج لوگ اٹلی، جنوبی امریکہ، تنزانیہ وغیرہ کے وہ مقام دیکھ کر حیران ہوتے ہیں جن کا ذکر ابن صفی صاحب نے اپنے ناولوں میں کیا ہے، سوچ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کیسے کوئی شخص بنا دیکھے ہو بہو ان جگہوں کا لفظوں میں نقشہ کھینچ سکتا ہے.....!

کیا خبر ابن صفی صاحب صبح یہ کہہ کر گھر سے نکلتے ہوں کہ کاتب کی طرف جا رہا ہوں اور جنوبی امریکہ فلائی کر جاتے ہوں، پھر شام تک مشن مکمل کر کے واپس آ جاتے ہوں اور ساتھ ہی اگلے ناول میں جنوبی امریکہ کا نقشہ کھینچ دیتے ہوں، بہرحال یہ تو تھا ایک مفروضہ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے ابن صفی صاحب کے ناولوں کے ذریعے اُن [redacted] کی سیر کی ہے جو ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔

ہوٹلوں، نائٹ کلبوں کی زندگی جس طرح ان کے ناولوں میں بیان کی گئی ہے کہ کیسے کلبوں میں اُٹھا بیٹھا جاتا ہے، کونسا سوٹ پہن کر جانا چاہئے، کیسے بیٹھنا چاہئے، کیسے بات چیت کرنا چاہئے، ویٹروں سے کیسے سلوک کرنا چاہئے، یہ سب ایک مجموعہ تھا، خاندانی رکھ رکھاؤ کیا ہوتا ہے.....! عمران سیریز کے 120 ناول اُٹھا کر دیکھ لیں ایک بار بھی رحمان صاحب، اماں بی اور سر سلطان آپ کو عمران کے فلیٹ میں نظر نہیں آئیں گے۔ کیوں؟... یہی خاندانی رکھ رکھاؤ اور حفظ مراتب ہوتا ہے۔

رہی بات عمران جیسے کردار کی تو وہ تو ہے ہی کامیاب جاسوس اور جاسوس ہر ماحول میں رچ بس جاتا ہے، یہاں ایک ناول یاد آ رہا ہے جس میں عمران اور صفدر ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں بھانت بھانت کی بدبو تھی، ان دونوں کا حلیہ اُس علاقے کی مناسبت سے تھا، صفدر سے بدبو برداشت نہیں ہو رہی تھی، لہٰذا وہ رومال سے ناک بند کرنا چاہ ہی رہا تھا کہ عمران اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیتا ہے۔

ابن صفی صاحب کے ناول چوگنی قیمت پر بلیک میں بک رہے ہوتے تھے لیکن درویش صفت انسان نے کبھی اس کا فائدہ نہیں اُٹھایا۔

"ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

جب تک دنیا میں اُردو پڑھی اور سمجھی جائے گی ابن صفی صاحب بھی زندہ رہیں گے۔

" کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سبو آؤ"

اور جام آج بھی چھلک رہا ہے۔

......☆☆......

سید کاظم جعفری

26 جولائی کو برصغیر کے نامور افسانہ نگار، شاعر، اردو ادب میں جاسوسی ناول نگاری کے بانی ابن صفی کا یوم پیدائش اور یوم وفات ہے۔

اُردو ادب میں یوں تو بے شمار لکھاری نام وَر ہوئے، لیکن ابن صفی کے مقام کو کوئی نہیں پہنچ سکا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی دیو مالائی شخصیت بن گئے تھے۔ اُردو کے جاسوسی ادب میں اُن کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوسکا۔ 26 جولائی 1928ء کو اُترپردیش (بھارت) کے ضلع الہ آباد کے معروف قصبے نارا میں پیدا ہونے والے اسرار احمد نے پاکستان آکر "ابن صفی" کا روپ اختیار کیا، تو اُن کے جاسوسی ناول پڑھنے والوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ 1952ء میں ابن صفی ہجرت کر کے (پاکستان) آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اُن کے ناول ہر ماہ کراچی اور الہ آباد دونوں جگہوں سے شائع ہوتے تھے۔ اُن کے ناولوں کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ بک سٹال پر آتے ہی یہ ناول ختم ہوجاتے تھے بل کہ کچھ ناشروں نے اُن کے نام کی مقبولیت کا یہ فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اُن کے نام سے یا اُن کے ملتے جلتے ہوئے نام سے سیکڑوں جاسوسی ناول شائع کر دیئے، لیکن اُن ناولوں میں زبان و بیان کا وہ ذائقہ کہاں سے ہوسکتا تھا۔ ابن صفی نے بار بار تردید کی کہ یہ ناول اُن کے لکھے ہوئے نہیں، لیکن سرقہ کرنے والے پبلشروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُن مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اُن کے نئے ناول اور ایڈیشن کے انتظار میں لوگ بک سٹالوں پر بے چینی سے چکر لگایا کرتے تھے۔ ابن صفی کے ناولوں کے کردار کرنل فریدی، سارجنٹ حمید اور علی عمران کو پڑھنے والے آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔ اُن کے ناول آج بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھے جا رہے ہیں، جیسے اُن کی زندگی میں پڑھے جا رہے تھے اور شاید کل بھی پڑھے جاتے رہیں گے بل کہ اُس وقت تک پڑھے جاتے رہیں گے، جب تک اُردو زبان زندہ ہے۔ اُنھوں نے ناول کے ادب سے فحش نگاری کا خاتمہ کیا اور جاسوسی ناول میں مقبولیت کا وہ مقام حاصل کیا کہ 1970ء میں قومی انٹیلیجنس ادارے نے بھی اُن سے معاونت اور مشاورت حاصل کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو زبان میں ابن صفی سے زیادہ کسی ادیب کو نہیں پڑھا گیا۔ اُنھیں جتنے قاری میسر آئے، کسی دوسرے ادیب کو نہیں ملے۔ درحقیقت اُنھوں نے ادب کو خواص سے نکال کر عوام تک پہنچا دیا تھا، جو نہ صرف اُن کے ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا بل کہ آنے والے ناول کا بے چینی سے انتظار کرتا تھا اور اُنھوں نے مضامینِ نو کے انبار لگا دیئے۔ ابن صفی کا ذہن جاسوسی ناولوں کا ٹکسال تھا، اسی لیے اُنھوں نے محض 20 برس کے عرصے میں 250 سے زیادہ جاسوسی ناول لکھے، یعنی تقریباً ہر ماہ ایک ناول لکھا حالاں کہ ابن صفی نے اپنی زندگی کی شروعات شاعری سے کی تھی، بطور شاعر وہ اپنا نام اسرار ناروی لکھتے تھے۔

احمد صفی ابن صفی کے بیٹے اس جانکاہ سانحے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"24 جولائی کو ابو کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ معمول سے زیادہ اس لیے کہ اس بیماری کو تقریباً دس ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ابو پر درد کا پہلا اور شدید حملہ 17 ستمبر 1979 کی رات کو ہوا تھا اور اس کے بعد صحت مسلسل خراب ہی رہی۔ نومبر 1979 میں بیماری شدت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹروں نے طویل معائنوں اور تکلیف دہ ٹیسٹوں کے بعد ایک خطرناک بیماری کا اندیشہ ظاہر کر دیا۔ دسمبر 1979 میں ابو کو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مزید معائنوں

اور ٹیسٹوں نے لبلبہ میں کینسر کی تصدیق کردی۔ اس بات کو ابو سمیت تمام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ اسپتال میں بہترین علاج اور توجہ سے بظاہر ابو کی بیماری میں کمی ہوگئی۔ اسپتال سے گھر آنے کے بعد علاج جاری رہا لیکن بیماری کی وجہ سے ان کے جسم میں متواتر خون کی کمی واقع ہونے لگی۔ جمعرات 24 جولائی 1980 کو ابو کو بخار آگیا جو اس وقت غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن رات ہوتے ہوتے بخار بہت تیز ہوگیا۔ دوسرے دن طبیعت میں خرابی کی وجہ سے میں (احمد صفی) دیر سے سو کر اٹھا۔ امی نے بتایا کہ رات بھر ابو کی طبیعت بہت خراب رہی۔ ابو کو اس وقت بھی خاصا بخار تھا۔ جمعہ کا دن تھا، چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کا ملنا بھی مشکل تھا۔ امی کے مشورے سے میں اور بھیا (ابرار صفی) رحمٰن بھائی کو لینے چلے گئے۔ ڈاکٹر رحمٰن آئے تو ابو کا بخار تیز ہو چکا تھا۔ ان کی سانس اس قدر تیز تیز چل رہی تھی کہ بولنا دشوار تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن نے فوراً انجکشن منگوائے، جب انہوں نے انجکشن لگانے کے لیے ابو کی آستین سرکائی تو ابو نے منع کیا" میرے بازو اب مزید مت چھیدو"۔۔۔ رحمٰن بھائی نے پاؤں کی رگ میں انجکشن لگایا۔ انجکشن لگنے اور دوا ملنے کے بعد ابو کی طبیعت بہتر ہوگئی اور انہوں نے عادتاً طبیعت سنبھلتے ہی باتیں شروع کردیں۔ شام کے وقت افطار کے بعد عیادت کے لیے حسب معمول لوگوں نے آنا شروع کردیا۔ ابو کو کافی تیز بخار تھا، اس کے باوجود آنے جانے والوں سے تھوڑی بہت بات چیت کررہے تھے۔ رحمٰن بھائی نے جاتے وقت بھیا سے کہا کہ اس وقت تو حالت قدرے بہتر ہے، انشاءاللہ صبح سب سے پہلے خون چڑھانے کا انتظام کریں گے۔ یہ ایک ایسی صبح کا ذکر تھا جو کبھی نہ آئی۔ اس رات مجھے (احمد) بھی کافی تیز بخار تھا، میں ابو کے پاس سے اٹھتے ہی بڑے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہی سو گیا۔ رات کو ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ گھڑیاں دیر ہوئے 26 تاریخ کا اعلان کرچکی تھیں۔ ابو نے سارے دن کے بعد بیت الخلا جانے کو کہا۔ سارا دن اس قدر کمزوری رہی تھی کہ ہاتھ نہ اٹھتا تھا لیکن اس وقت خود اٹھے اور سہارا لے کر کمرے سے متصل باتھ روم گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو سانس نہایت تیزی سے چلا رہا تھا۔ بھیا کو بلایا کہ پیٹھ سہلا دیں۔ امی نے فوراً بھیا کو جگایا۔ جب بھیا پیٹھ سہلا رہے تھے تو ابو نے کہا" ناحق تم لوگوں کو آدھی رات تنگ کررہا ہوں، میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے"۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔ تھوڑی دیر میں اچانک تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ کراہنے کی آواز سن کر میں فوراً کمرے میں پہنچا، اس وقت تک ابو لیٹ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں چھت میں گڑی ہوئی تھیں اور سانس چلنے کی وجہ سے پورا پلنگ ہل رہا تھا۔ ہم سب پریشان ہوگئے، امی اور بہنیں گھبرا کر رونے اور دعائیں مانگنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں اور بھیا ابو کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگے، ابو کی حالت دیکھ کر سب کی حالت غیر ہورہی تھی، بھیا روتے جاتے تھے اور ابو کو جھنجھوڑتے جاتے تھے۔ افتخار (بھائی) فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر کی طرف دوڑ گیا۔ بھیا اور مجھ میں ابو کے پاس سے ہٹنے کی ہمت نہ تھی۔ امی اور بہنیں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ اچانک ابو نے زور سے سانس لی اور ان کے چہرے کا کرب یکسر دور ہوگیا۔۔۔ وہ بالکل پرسکون ہوگئے۔"

اردو کے اس عظیم ادیب نے خود ہی کہا تھا۔

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں
لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستاں

.....☆☆.....

بڑے غضب کا ہے یارو بڑے عذاب کا زخم

اگر شباب ہی ٹھہرا مرے شباب کا زخم
ذرا سی بات تھی کچھ آسمان نہ پھٹ پڑتا
مگر ہرا ہے ابھی تک ترے جواب کا زخم
زمین کی کوکھ ہی زخمی نہیں اندھیروں سے
ہے آسمان کے بھی سینے پہ آفتاب کا زخم
میں سنگسار جو ہوتا تو پھر بھی خوش رہتا
کھٹک رہا ہے مگر دل میں اک گلاب کا زخم
اسی کی چارہ گری میں گذر گئی اسرار
تمام عمر کو کافی تھا اک شباب کا زخم

.....☆☆.....

بانسری
کسی کی صدا

رات کے پرکیف سناٹے میں بنسی کی صدا
چاندنی کے سیمگوں شانے پہ لہراتی ہوئی
گونجتی بڑھتی لرزتی کوہساروں کے قریب
پھیلتی میدان میں پگڈنڈی پہ بل کھاتی ہوئی
آرہی ہے اس طرح جیسے کسی کی یاد آئے
نیند میں ڈوبی ہوئی پلکوں کو اکساتی ہوئی
آسمانوں میں زمیں کا گیت لہرانے لگا
چھا گیا ہے چاند کے چہرے پہ خفت کا غبار
بزمِ انجم کی ہر ایک تنویر دھندلی ہوگئی
رکھ دیا ناہید جھنجھلا کے ہاتھوں سے ستار
ذرہ ذرہ جھوم کر لینے لگا انگڑائیاں
کہکشاں تکنے لگی حیرت سے سوئے جوئبار
یوں فضاؤں میں رواں ہے یہ صدائے دلنشیں
ذہنِ شاعر میں ہو جیسے اک اچھوتا سا خیال
یا سحر کے سیمگوں رخسار پر پہلی کرن
سرخ ہونٹوں سے بچھائے جس طرح بوسوں کے جال
گاہ تھمتی، گاہ سناٹے کا سینہ چیرتی

یوں فضا میں اٹھ، ہو جاتی ہے مدھم ہائے ہائے
شام کی دھندلا ہوٹوں میں دور کوئی کارواں
کوہساروں سے اتر کر جیسے میدانوں میں آئے

.....☆☆.....

کبھی قاتل ، کبھی جینے کا چلن ہوتی ہے
ہائے کیا چیز یہ سینے کی جلن ہوتی ہے
چھیڑیے قصہ اغیار ہی ، ہم سُن لیں گے
کچھ تو کہیئے کہ خموشی سے گھٹن ہوتی ہے
یادِ ماضی ہے کہ نیزے کی اَنی، کیا کہیئے
ذہن میں ایسی چبھن ، ایسی چبھن ہوتی ہے
پھول کِھلتے ہی چمن آنکھ سے اوجھل ہو کر
ڈھونڈتا ہے اُسے، جو رشکِ چمن ہوتی ہے
کتنی ہی زہر میں ڈوبی ہوئی رکھتی ہو زباں
پھر بھی وہ نازشِ گل، غنچہ دہن ہوتی ہے

.....☆☆.....

یونہی وابستگی نہیں ہوتی
دور سے دوستی نہیں ہوتی
جب دلوں میں غبار ہوتا ہے
ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہوتی
چاند کا حسن بھی زمین سے ہے
چاند پر چاندنی نہیں ہوتی
جو نہ گزرے ، پڑی وشوں میں کبھی
کام کی زندگی نہیں ہوتی
دن کے بھولے کو رات ڈستی ہے
شام کو واپسی نہیں ہوتی

(ق)

آدمی کیوں ہے وحشتوں کا شکار

کیوں جنوں میں کمی نہیں ہوتی
اک مرض کے ہزار ہیں نباض
پھر بھی تشخیص ہی نہیں ہوتی

.....☆☆.....

دولتِ غم اپنے ہی اوپر ہم نے خوب لٹائی
سارے جہاں میں کوئی نہ ہوگا ہم سا حاتم طائی
ہم نے کہا تھا پچھتاؤ گے جانے کیسی ساعت تھی
چھوٹے منہ سے نکلی ہوئی بھی بات بڑی کہلائی
فہم و فراست خواب کی باتیں جاگتی دنیا پاگل ہے
عقل کا سورج ماند ہوا ہے ذروں کی بن آئی
دریا کی گہرائی ناپو موتی ہاتھ لگیں گے
کیا پاؤ گے ناپ کے یارو جذبے کی گہرائی
اپنی ذات میں ڈوبنے والے ٹھہریں اونچے لوگ
سب کا درد بانٹنے والے کہلائیں ہرجائی
سود و زیاں کے بازاروں میں ڈھونڈ رہا تھا اپنا مول
بن بہروپ کسی نے قیمت دو کوڑی نہ لگائی

.....☆☆.....

کچھ تو تعلق کچھ تو لگاؤ
میرے دشمن ہی کہلاؤ
دل سا کھلونا ہاتھ آیا ہے
کھیلو توڑو جی بہلاؤ
کل اغیار میں بیٹھے تھے تم
ہاں ہاں کوئی بات بناؤ
کون ہے ہم سا چاہنے والا
اتنا بھی اب دل نہ دکھاؤ
حسن تھا جب مستور حیا میں
عشق تھا خون دل کا رچاؤ
حسن بنا جب بہتی گنگا
عشق ہوا کاغذ کی ناؤ

شب بھر کتنی راتیں گزریں
حضرت دل اب ہوش میں آؤ

.....☆☆.....

یہی ہے خاک نشینوں کی زندگی کی دلیل
قضا سے دور ہے ذروں کا کہسار جمیل
وہی ہے ساز ابھارے جو ڈوبتی نبضیں !
وہی گیت نفس میں جو ہو سکے تحلیل
دکھائی دی تھی جہاں سے گناہ کی منزل !
وہیں ہوئی تھی دل نا صبور کی تشکیل
سمجھ میں آئے گی تفسیر زندگی کیا خاک
کہ حرف شوق ہے اجمال بے دلی تفصیل
یہ شاہراہ محبت ہے ،آگہی کیسی۔ !
بجھا سکو تو بجھا دو شعور کی قندیل
صدائے نالہ بھی آتی ہے ہمرکاب نسیم
نہ ہو سکی ہے نہ ہوگی بہار کی تکمیل
ہزار زیست ہو پائندہ تر مگر اسرار
اجل نہ ہو تو بنے کون بار غم کا کفیل

.....☆☆.....

عشق عرفاں کی ابتدا ہے
حسن منزل نہیں راستہ ہے
ذرے ذرے میں سورج ہے پنہاں
تو افق میں کسے ڈھونڈتا ہے
پھول کی زندگی ایک دن کی
نہ جانے کس بات پر پھولتا ہے
جب سے تم مہرباں ہو گئے ہو
دل کو دھڑکا سا اک لگ گیا ہے
علم و حکمت نے وہ گل کھلائے
اب تو وحشت ہی کا آسرا ہے
درد جو مل گیا ہے دوا سے

اس نئے درد کی دوا کیا ہے
کل یہی راستہ بن نہ جائے
آج جو صرف اک نقش پا ہے

......☆☆......

ابن صفی۔ ایک رجحان

تحریر: بہزاد احمد

چلیں آج لکھنے کا موڈ بن ہی گیا تو کچھ لکھ لیتے ہیں، لیکن آپ سے گزارش ہے کہ تحریر میں کمی بیشی کو ابھی سے معاف کردیں تو بہتر ہوگا، کیونکہ یہ تحریر لکھنے والیکو اردو ادب کے الف ب کا بھی پتا نہیں۔

ابن صفی صاحب کی محبت میں ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کی ٹھانی تو لکھنے کے لئے لفظوں کے انتخاب میں ایسی مشکل پیش آئی جیسے کہ عمران کو عام حالات میں سنجیدہ دیکھنا، لیکن پھر یاد آیا کہ عمران بھی تو کبھی کبھی سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

بہت سوچا کہ کیا لکھا جائے جو دوستوں کو پسند بھی آئے اور میرے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرے، خیر جو کچھ بھی سمجھ میں آیا اسے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آج چاہے اردو ادب کے نقادوں کی نگاہ میں جاسوسی ادب کا جو بھی مقام ہو لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اردو پڑھی جانے کی سب سے بڑی وجہ ابن صفی صاحب کی جاسوسی ناول نگاری ہے، ان سے پہلے بھی جاسوسی ناول نگار گزرے اور ان کے بعد بھی آئے، جن کی اکثریت نے انہیں کے بنائے ہوئے کرداروں پر طبع آزمائی کی لیکن ان جیسا مقام کسی کو نہیں ملا۔

ان کے کرداروں کی سب سے خاص بات اصول پسندی تھی، ساتھ ہی ان کرداروں میں عورت اور شراب کے لیے کوئی کشش نہیں ملتی، عمران، فریدی، حمید، قاسم، انور، رشیدہ، جولیا، کنول جیسے شاندار کردار ابن صفی کی اعلیٰ کردار نگاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ابن صفی صاحب کی لکھی ہوئی تحریریں بار بار پڑھنے پر بھی پہلے جیسا مزہ دیتی ہیں، ایسی انفرادیت اردو ادب میں صرف ابن صفی کو ہی حاصل ہے جن کی تحریریں بار بار پڑھی جاتی ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہتی ہیں، ابن صفی کے علاوہ یہ اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکا۔

آج کل عمران سیریز لکھنے والے ہر طرف مل جائیں گے، لیکن ابن صفی صاحب کو پڑھنے کے بعد مجھ جیسا ایک عام انسان (جس کا اردو ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں) بھی ان لوگوں کے ناولوں کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ اردو ادب کے ساتھ مذاق ہے۔

راقم نے جاسوسی دنیا کا آغاز اتفاقیہ طور پر کیا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے ابن صفی کے شروعاتی 17 ناول پڑھے اور پھر میں نے "ان جیسے" ناول پڑھنے کے چکر میں کئی ماہ ضائع کیے، شکر ہے بعد میں مجھے پھر سے ابن صفی کے مزید ناول پڑھنے کو مل گئے، یہ سچ ہے کہ اس کے بعد کبھی میرے دل نے کسی اور کو قبول نہیں کیا (سوائے نسیم حجازی اور التمش کے کہ میں نے انہیں سے پڑھنے کا آغاز کیا تھا)۔

آخری بات یہ ہے کہ ابن صفی صاحب کو اپنے دعاؤں میں یاد رکھا کریں (راقم کو بھی) اور اور ان کے نام کو اور کام کو عام کردیں۔

.....☆☆.....

ابن صفی، اردو ادب کی شان

تحریر: عبدالعزیز لاسی

السلام علیکم

پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے لکھنا لکھانا بالکل نہیں آتا، میں پہلی مرتبہ لکھ رہا ہوں اور وہ بھی ابن صفی صاحب کے بارے میں، جن کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اور میری چراغ دکھانے کی حیثیت بھی نہیں۔

ابن صفی صاحب کا اردو پر سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ جس وقت اردو زبان میں بڑے 'بدتمیز' اور 'بے ادب' قسم کے 'ادب' کی مانگ تھی ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جو لوگوں کو 'بے ادبی' سے 'ادب' کی طرف لایا۔

ان کی کردار سازی ایسی تھی کہ ان کے کردار ہمیں جیتے جاگتے انسانوں کی طرح اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں، یہ ابن صفی کی کردار نگاری کا کمال تھا۔

میں نے دس گیارہ سال کی عمر سے عمران سیریز پڑھنا شروع کی اور آج جب میں اُن کرداروں کے بارے سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میرے بچپن کے ساتھی ہوں، جب کبھی تنویر عمران کی بے عزتی کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دل کرتا ہے کہ یہ تنویر مجھے کہیں مل جائے تو میں اس کی چٹنی بنادوں۔

میری شخصیت پر ان کی تحریروں کا بڑا اثر ہے، اکثر نئے ملنے والے جب مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ کی اردو بہت صاف ہے تو میں مسکراتا ہوا دل ہی دل میں ابن صفی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان کی کوئی بھی کہانی لیکر اس پر اگر فلم بنائی جائے تو وہ ضرور سپرہٹ ہوگی، ان کی تحریروں نے نا صرف ہمیں قانون کا احترام سکھایا بلکہ ہمیں حقوق و فرائض نبھانے کا شعور بھی دیا۔

آج بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے گھروں کے چولھے ابن صفی کی بدولت جل رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو خود کو ان سے بھی بڑا ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ اتنے ہی بڑے قلم کار ہیں تو کسی کے کردار چوری کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔

ابن صفی نے ہمیں اردو زبان میں جس قسم کا دلچسپ اور تفریحی ادب فراہم کیا، اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی، ان کے ناولوں کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے، اور یہ دلچسپ ادب لاکھوں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچا۔ اللہ سے دعا ہے کہ محترم ابن صفی کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

.....☆☆.....

ابن صفی، ایک شخصیت، ایک عہد

تحریر: نعیم شیخ

"لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

ایک دور میں جاسوسی ناولوں کا شمار تیسرے درجے کی تفریحی تحریروں میں کیا جاتا تھا، طلباء کو خاص طور سے جاسوسی ناولوں کو پڑھنے سے روکا جاتا تھا، یہ روک ٹوک ضروری بھی تھی کیونکہ اس میں جاسوسی کم اور جنسی مناظر کی تصویر کشی زیادہ ہوتی تھی۔

پھر ایک وہ دور بھی آیا جب ابن صفی نے فحش جاسوسی ناول نگاری کے خلاف محاظ قائم کیا، اور ایسا لٹریچر پیش کیا جو ہر عمر و ہر طبقہ فکر کے لوگ بغیر کسی جھجک کے پڑھ سکتے تھے، فحش ناولوں کے برعکس ابن صفی کی تخلیق کردہ کہانیاں اور ناول آئینے کی طرح شفاف اور بہتے پانی کی طرح پاک وصاف تھے۔

وہ آزادی فکر کی معقول توجیہہ کرتے تھے، غیر معقولیت کی ان کے یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ جب اس زمانے کے زیادہ تر مصنف وادیب محبوبہ کے لئے چاند تارے توڑا کرتے تھے، (سوچ کر، پڑھ کر اور سن کر ہنسی آتی ہے) اس وقت ابن صفی کے عمران اور کرنل فریدی ایسی لغویات کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے، بلکہ کچھ مناظر میں تو ان کے کردار طوائف اور راہ سے بھٹکی ہوئی خواتین کو بڑے بھائی کی طرح سمجھا بجھا کر صاف ستھری اور شائستہ زندگی گزارنے کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ابن صفی حسن وعشق کو ایک سیدھا سادھا معاملہ تصور کرتے تھے، ان کے یہاں عاشق کی ٹھنڈی آہوں کو خلاف ادب سمجھا جاتا تھا، ان کے یہاں عصر حاضر کے علوم ہی نہیں بلکہ مستقبلیات (Futurology) کے علوم بھی پنہاں تھے، ان کے قارئین میں تقریباً تمام ہی طبقوں کے افراد شامل رہے ہیں۔

سائنس، نفسیات، اخلاقیات، قانونیت، حب الوطنی اور ایک اللہ کی وحدانیت کا ذکر ابن صفی تقریباً ہر ناول میں چھیڑا کرتے تھے۔

اگر کردار نگاری میں اس عظیم مصنف کا نام نہ لیا جائے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی، ایک ادنیٰ آدمی چاہے وہ نوکر ہو، ڈرائیور ہو یا پھر فقیر، ابن صفی اس کے کردار کو اتنی چابکدستی سے پیش کرتے کہ اس کردار کی شخصیت آئینہ کی طرح چمک اٹھتی۔

آخر میں یہی ایک بات سمجھتا ہوں کہ ابن صفی کے بارے میں جتنا لکھا جائے کم ہوگا بلکہ سورج کو چراغ دکھانے کی مصداق ہوگا۔

تھک ہار کر ماننا ہی پڑتا ہے کہ اتنا عظیم الشان مصنف آج ہمارے بیچ نہیں رہا، لیکن ان کی تحریریں آج بھی "اردو" اور "عاشقانِ اردو" کے ذہن کو اپنی خوشبو سے معطر کر رہی ہیں۔

ابن صفی کو اپنے کرداروں سے کتنی انسیت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک ایک کردار کی شخصیت سے ہوتا ہے، جتنی اچھی کردار نگاری وہ کرتے تھے شاید ہی کسی دوسرے نے کی ہو، مجھ جیسے ان پڑھ گنوار کو ان کے آخری ناول کا آخری اقتباس پڑھ کر تو بس رونا ہی آگیا۔

"اچھا۔۔۔ بھاگو یہاں سے.....!" عمران جماہی لے کر بولا۔ "بہت تھک گیا ہوں، اب سونا چاہتا ہوں..... گہری نیند.....!" (آخری آدمی)

"تنہائی سی تنہائی ہے کیسے کہیں کیسے سمجھائیں

چشم ولب ورخسار کی تہہ میں روحوں کے ویرانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ ابن صفی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام نصیب فرمائے.....آمین۔

.....☆☆.....

ابن صفی۔ معاصر عہد کے ترجمان

تحریر: جمیرا عالیہ (مہر ماہ)

ناول کی تعریف کرتے ہوئے معروف فکشن نگار DefoeDaniel کہتا ہے:

''قصہ بنا کر پیش کرنا بہت ہی بڑا جرم ہے، یہ اس طرح کی دروغ گوئی پر مبنی ہے جو دل میں ایک بڑا سوراخ کر دیتی ہے، جس کے ذریعے جھوٹ دھیرے دھیرے دل میں داخل ہو کر ایک عادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے''۔

مذکورہ تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ ناول زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا، کیونکہ ڈیفو کے نزدیک ناول حقیقی واقعہ پر مبنی ہونا چاہئے، دوسری صورت میں ناول نگار دروغ گوئی کا عادی ہو سکتا ہے، اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ڈیفو ناول نگاری کے ذریعے اخلاقی اقدار کو فروغ دینا چاہتا تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور ناول نگار کے بارے میں کہتے ہیں:

''ناولسٹ محض ایک قصہ گو ہی نہیں، ایک معلم حیات اور رفیق ذہنی بھی ہے، کیونکہ ہر ناول ایک ذہنی سفر، ایک حسیاتی تجربہ اور ایک جذباتی مرقع بھی ہے''۔

ناول میں حقیقت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے گوئٹے کہتا ہے:

''فنکار کا فن یہاں تک حقیقت پر مبنی ہونا چاہئے کہ اس کو ہر طرح حقیقی کہا جا سکے، مگر اس کے ساتھ اسے اس حد تک خیالی بھی ہونا چاہئے کہ اسے بالکل حقیقی نہ کہا جا سکے، الغرض حقیقت اور رومان کو ملا کر جو شاعرانہ حقیقت پیدا ہوتی ہے وہ ناول نگاری کی جان ہے''۔

درج بالا تعریفوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ناول میں حقیقت اور تخیل دونوں کی کارفرمائیاں ضروری ہیں، یعنی انسانی زندگی کے حالات وواقعات اور معاملات کو مکمل مشاہدے کے بعد ایک خاص انداز میں ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ناول ہے، اس کے علاوہ قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، فلسفہ حیات اور اسلوب بیانی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

برصغیر کے اردو ناول زیادہ تر "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ کسی ماورائی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ہماری دنیا کے صبح وشام، روزمرہ کے واقعات، خوشیاں، مصائب اور دوسرے جذبات سے مزین ہوتے ہیں، لیکن بدلتے ہوئے نظریات اور رجحانات کی وجہ سے دوسری اصناف کے ساتھ یہ صنف بھی بے حد متاثر ہوئی، ترقی پسند تحریک، جنگ آزادی، تقسیم، فسادات، ہجرت وغیرہ نے اردو ناول پر بے حد گہرے اثرات ڈالے۔

اس تناظر میں اگر ہم ابن صفی کے ناولوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری ان کے ناولوں کا خاص

وصف ہے، تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے حالات و واقعات اور سماجی و تہذیبی سطح پر عوام کے بدلتے ہوئے نظریات و خیالات کی بھرپور عکاسی ان کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔

عوام میں مستقبل سے بڑھتی ہوئی مایوسی، زندگی سے بیزاری اور عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے جرائم اور اس کے تئیں بے حسی کو انہوں نے جس شدت سے محسوس کیا اسی شدت سے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کر دیا، چنانچہ ان کے ناول نہ صرف اپنے عہد کے نمائندہ بن گئے بلکہ ان میں مستقبل کے حوالے سے خدشات اور پیش گوئیوں کا ایک ذخیرہ بھی موجود ہے۔

جیسا کہ کلارا ایوز کہتی ہیں کہ ناول اپنے زمانے کے معاشرے کی سچی تصویر ہوتا ہے، ابن صفی نے بھی اپنے ناولوں میں موجودہ معاشرے کے مسائل کو بخوبی اجاگر کیا ہے، انہیں تاریخ سے گہرا ربط تھا اور تقسیم کے بعد عوام کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت سے وہ بخوبی واقف تھے، لہذا انہوں نے اس وقت کے موجودہ معاشرے کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کے ساتھ اس کا حقیقی تجزیہ کیا، وہ ایک تخلیق کار تھے، لہذا انہوں نے کردار بھی ایسے تخلیق کئے جو اسی سماج کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے ناولوں میں جہاں نواب، جاگیردار، اعلیٰ حکام، وزراء اور ہائی کلاس کے ماڈرن مرد و زن نظر آتے ہیں وہیں معمولی چور، جیب کترے، مزدور اور کلرک بھی نظر آتے ہیں، ان سب کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ ان سبھی کرداروں کی نفسیاتی ساخت ان کے اپنے ماحول کے مطابق ڈھالی گئی ہے، اور وہ اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

ابن صفی نے جب ناول نگاری کی ابتداء کی تو اس وقت تقسیم کا واقعہ رونما ہو چکا تھا، برصغیر کے عوام کی ذہنی کیفیت منتشر تھی، اس وقت سماج کا ایک بڑا طبقہ بنا سوچے سمجھے اندھی تقلید اور نمود و نمائش کا شکار تھا، سماجی قدریں تیزی سے روبہ زوال تھیں اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل رہا تھا۔

ایسے پرفتن دور میں ابن صفی کی نظر ان تمام حالات و واقعات پر تھی، اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان حالات و واقعات سے متاثر نہ ہوتے، وہ دیکھ رہے تھے کہ آزادء اظہار اور ترقی کے نام پر کس طرح ذہنی اور اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہیں، ایک منصوبہ بند سازش کے تحت یہودی و صیہونی طاقتیں برصغیر میں منشیات و جنسیت کی وبا پھیلا رہی ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اگر ایک قوم کو تباہ برباد کرنا ہے تو سب سے پہلے اس کے اخلاقی اقدار پر چوٹ کرو، لہذا اس وقت جنسیت اور منشیات کے گرد انہوں نے ایسا خوبصورت جال بنا کہ نوجوان ہوش و خرد کھو کر خود کو دیوانہ وار اس طوفان کے حوالہ کرنے لگے، چنانچہ اس خطرناک سازش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن صفی نے کہا تھا:

''میں تمہیں تنگ نظر نہیں کہوں گا، کیونکہ میرا بھی اسی پر ایمان ہے کہ ساری دنیا کے خلاف یہ ایک صیہونی سازش ہے، یہودی خود کو بقیہ نسلوں سے برتر سمجھتے ہیں اور ساری دنیا پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں، منشیات سے پہلے انہوں نے جنسیت کی وبا پھیلائی تھی''۔

(ایڈلاوا)

اردو فکشن میں ابن صفی نے جس حقیقی دنیا سے ہمیں روشناس کرایا ہے وہ اس وقت کے سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہے، وہ نام مسائل اور معاشرتی تنزلی جو اس وقت رونما ہو رہی تھی اس کا انہوں نے گہری بصیرت کے ساتھ مشاہدہ کیا اور پھر اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی:

''شاید آپ کو پتہ نہیں کہ سماجی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں، آج سے پندرہ سال پہلے شرافت اور عالی نسبی کا جو معیار

تھا اسے آج فلاکت زدگی اور جہالت سے تعبیر کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر پردہ کو لے لیجئے، پہلے یہ شرافت اور عالی نسبی کی پہچان تھا آج پردہ نشین خواتین کو یا تو نچلے طبقے سے متعلق سمجھا جاتا ہے یا جاہل۔"

(پیش رس: ستاروں کی موت، ستاروں کی چیخیں)

ابن صفی نے کتنی تلخ حقیقت بیان کی ہے، یہ اس وقت کے معاشرے کی سچی تصویر ہے، وہ معاشرہ جو ترقی، آزادی اور نام نہاد ماڈرن ازم کے چکر میں اپنی تہذیب فراموش کرتا جارہا تھا، اعلیٰ سوسائٹی میں صنف نازک کا نائٹ کلبوں ہوٹلوں اور باروں میں جانا باعث فخر سمجھا جانے لگا تھا، کتے کو گود میں اٹھا کر محبوب کے رخساروں کی طرح رخسار سے رخسار ملا کر اظہار محبت کرنا کوئی قبیح فعل نہیں رہا تھا، بلکہ ایسا کرنا ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے کی پہچان قرار پایا تھا۔

مغرب کی اس اندھی تقلید کے نتیجے میں جب انہیں ٹھوکر لگتی تو سوائے ذلت اور پچھتاوے کے کچھ بھی ہاتھ نہ آتا، اس موضوع کو ابن صفی نے اپنے ناول "آوارہ شہزادہ" میں کھل کر بیان کیا ہے، مذکورہ ناول میں غلط اقدام کے نتیجے میں جب لیڈی داؤد کو خودکشی کرنی پڑتی ہے اور تفتیش کا ذمہ فریدی کو سونپا جاتا ہے تو آخر میں جب وہ برونوف کا پردہ فاش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بزنس تھا، اعلیٰ طبقے کی خواتین کو گمراہ کر کے انہیں بلیک میل کرنے کا بزنس، یہ وہ جرائم تھے جو اس وقت بھی عام تھے اور اب بھی عام ہیں، لہٰذا ابن صفی نے اپنے تمام قارئین کو آگاہ کیا تاکہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہوشیاری سے کام لیں۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تقسیم کے بعد سے ہی کرپشن نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دی تھیں، رفتہ رفتہ جڑیں مزید گہری ہوتی چلی گئیں، کرپشن کے پودے نے درخت کی صورت اختیار کر لی، رشوت، بے ایمانی، دغابازی اور فریب کے ذریعے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کام روز افزوں ترقی کرتے کرتے پورے ملک وقوم کو اپنے قبضہ میں لیتا چلا گیا۔

جمہوریت کے نام نہاد فلسفے سے ابن صفی شروع سے ہی متفق نہیں تھے، ان کے خیال میں جب تک اس نظام کی بنیادی خامیاں دور نہیں کی جاتیں تب تک اس کے نفاذ سے کسی بھی قسم کے فوائد کا حصول ناممکن ہے، اس حقیقت کا اظہار وہ صاف لفظوں میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "نام نہاد الیکشن کے بعد جو حاکم کرسی تک پہنچتے ہیں اس میں عوام کی قوت اور رائے عامہ سے زیادہ مالی قوت یا دوسرے لفظوں میں رشوت کا ہاتھ ہوتا ہے"..... اس نکتے کی طرف انہوں نے کئی ناولوں میں کھل کر اشارہ کیا ہے جن میں دوسرا شعلہ، تصویر کی موت، دہشت گرد اور جنگل کی شہریت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک جگہ ملکی حالات کی حقیقت کچھ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"یہ کیا کہ ایک معمولی کلرک کو کلرکی کا امتحان دینا پڑے، ایک پولیس اہلکار رنگروٹی کا دور گذارے بغیر کام سے نہ لگایا جائے، لیکن ترکاریوں کے آڑھتی، بے مرمت جاگیردار اور گاؤدی قسم کے تاجر براہ راست اسمبلیوں میں جا بیٹھیں اور قانون سازی فرمانے لگیں اور انہی میں سے کچھ کابینہ کے ارکان بن جائیں، سوچنے کی بات ہے کہ نچلی سطح پر امتحانات اور ٹریننگ کا چکر چلتا رہے اور اوپر جس کا دل چاہے پہنچ جائے، بس جیب بھاری ہونی چاہئے، نہ کوئی امتحان نہ کوئی ٹریننگ"۔

(جنگل کی شہریت)

غور کیجئے کیا یہ ہمارے ملک کی حقیقی تصویر نہیں ہے؟ یہی ابن صفی کا وصف تھا کہ وہ خیالی اور جھوٹی باتوں کو رومان کے پیرائے میں نہیں پیش کرتے تھے بلکہ کڑوی سچائیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ملک کے

ہر انسان کا شعور زندہ ہو اور وہ اپنی اہمیت سے واقف ہو، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہر فرد سچائی سے آگاہ رہے، وہ سچائی جو فریب کے خوشنما پردوں میں پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں اس معاشرے کی سچائیاں واضح کی ہیں جو مستقبل سے مایوس تھا، عوام میں بیزاری اور جھنجلاہٹ کی وجہ سے جرائم اور دھوکہ بازی کی گراف بڑھتا جارہا تھا، یہ بیزاری اور جھنجلاہٹ وقتی تقاضوں کی دین نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے برسوں کا لاوا ابل رہا تھا، ان کے خیال میں محدود وسائل تک عوام کی رسائی نہ ہوسکنے کی وجہ سے وہ ہر چمکتی چیز کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے تھے، اس کا حل وہ کرنل فریدی کی زبان میں یوں بتاتے ہیں:

''اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے اور ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہوجائے گی، ضرورت ہے کہ انہیں قناعت کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی خودی کو ابھارا جائے''۔

(زہریلا سیارہ)

جناب راشد اشرف صاحب جو ابن صفی کی تحریروں کے معروف و مشہور محقق ہیں اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، فرماتے ہیں:

''ابن صفی کی تحریروں کا ایک کمال یہ ہے کہ باتوں باتوں میں حالات حاضرہ پر اس انداز میں روشنی ڈالتے ہیں کہ کہی ہوئی بات فوری طور پر پڑھنے والے ذہن میں اتر جاتی ہے، فکری اعتبار سے ابن صفی کے ناولوں نے اپنے قاری کو معاشرتی برائیوں کے خلاف صف آراء ہونے کا سلیقہ سکھایا''

جیسا کہ ڈیفو کہتا ہے کہ ناول نگاری میں دروغ گوئی دل میں سوراخ کی مانند ہے، ابن صفی نے کبھی اپنی تحریروں میں جھوٹ اور مبالغے سے کام نہیں لیا، حقیقت اور مقصدیت ان کے ناولوں کی خاص پہچان ہے، ویسے بھی جاسوسی ناول نگاری میں مبالغہ کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ جن مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کرتے تھے اس کے سماجی، سیاسی و تہذیبی عوامل کا بھرپور مطالعہ کرلیتے تھے، ان کے ناولوں سے معاصر عہد کے تہذیبی ثقافتی اور بین الاقوامی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے، اس کی ایک مثال 1960 کے نصف سے شروع ہونے والے ہپی ازم کی تحریک ہے، جس کا ذکر انہوں نے اپنے کئی ناولوں میں کیا ہے۔

جناب عارف اقبال صاحب فرماتے ہیں:

''اردو فکشن میں ابن صفی نے جس دنیا کی تصویر کشی کی ہے وہ خیالی یا طلسمی نہیں بلکہ جیتی جاگتی سی وہ دنیا ہے جس سے ہمارا روزمرہ کا تعلق ہے، ان کے ناولوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں برصغیر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر جرائم کی ایک نئی دنیا کا انکشاف کیا گیا ہے''

ابن صفی نے جس عہد میں ناول نگاری کی اس وقت کم و بیش تمام ادب ہی جنسیت کے سیلاب کی زد میں آگئے تھے، بعض ناول تو اس قدر عریاں اور بیہودہ ہوتے تھے کہ شریف گھرانوں میں ان کا پڑھا جانا باعث شرم سمجھا جاتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اس وقت شرافت کا معیار بھی بدلتا جارہا تھا، لوگ ''لحاف'' اور ''ٹھنڈے گوشت'' سے لطف اندوز ہوکر فخریہ اپنی قابلیت کا اظہار کرتے تھے۔

بہر حال ان حالات میں ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے مقصدیت کو فروغ دیا، اپنے کردار کرنل فریدی کے ذریعے

انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

''میں جنسیت کو ایک سیدھا سادا مسئلہ سمجھتا ہوں جسے آدمی جیسے سمجھ دار جانور کے لئے اتنا پیچیدہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ شاعری کرنے لگے''۔

(جنگل کی آگ)

لہٰذا اخلاقی اقدار کی پاسداری اور صاف ستھرے ادب کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے اپنی تحریروں کو فحش نگاری سے پاک رکھا، ان کا مقصد نئی نسل کی آبیاری کرنا تھا جس کے لئے وہ اس گرے ہوئے راستے کا انتخاب ہرگز نہیں کرنا چاہتے تھے، ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی تحریریں بالکل ہی خشک ہیں، لیکن جہاں کہیں جنس کی بات آتی ہے وہ بات کو نہایت لطیف اشاروں میں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ ابن صفی کے ناول اپنے عہد کا آئینہ ہیں، معاصر عہد کے تمام سلگتے مسائل، تہذیبی و معاشی سطح پر بدلتے ہوئے حالات اور عوام کی ذہنی کیفیت ان کی تحریروں سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے، ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سازشوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

سائنس کی روز افزوں ترقی، ایٹمی تجربات اور بڑھتے ہوئے جرائم سے متعلق انہوں نے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ آج حرف بہ حرف درست ثابت ہورہی ہیں، یہ ان کی دور اندیشی اور مستقبل بینی کا مظہر ہے۔

مضمون کا اختتام ڈاکٹر شمس بدایونی کے تاثرات سے کرتے ہیں:

''زندگی کا بکھراؤ شباب پر ہے، ابن صفی کے قلم نے اس بکھراؤ کو گہرے تجربات و مشاہدات کی مدد سے مستقبل کے لئے محفوظ کردیا ہے، جس میں آنے والی نسلیں اپنے ماضی کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، ادب، سماجی رویے، عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں، قانون و جرائم کی رسہ کشی، مذہب کی بالادستی اور احترام دیکھ سکیں گی۔''

.....☆☆.....

اطہر کلیم انصاری (ناندیڑ)

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے، نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

خوبرو چہرہ، سرخ و سپید رنگت، صحت کی غمازی کرتا گٹھا ہوا جسم عمر تیس اور بتیس کے درمیان آنکھوں میں غنودگی کی سی کیفیت اور کشادہ پیشانی چیخ چیخ کر ہمت، ذہانت و خوب صورتی کی داستان بیان کررہی تھی عمدہ تراش کے بے داغ سوٹ اور کیڈیلاک جیسی گراں قیمت گاڑی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ نوجوان کسی جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ایسا کیوں نہ لگے جبکہ یہ نوجوان نواب عزیز الدین خان کا فرزند ارجمند احمد کمال فریدی ہے۔

''کرنل فریدی'' اور اس جیسے بے شمار زندہ و جاوید کرداروں کے خالق محترم جناب ''اسرار احمد (ابن صفی) صاحب'' کو اس دنیا سے گئے ہوئے تقریباً 37 برس بیت گئے مگر دنیا گواہ ہے کہ وہ آج بھی اپنے کرداروں میں اور اپنی تحاریر میں زندہ ہیں زندہ ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ایک ایک حرف ایک ایک جملے سے ہمیں ایک نئی سوچ و فکر دے رہے ہیں۔

سنہ 1952ء میں ایک بوڑھی ملازمہ کے قتل کی داستان سے یہ سفر شروع ہوا اور اس سفر نے ہمیں شکرال، کرغال، مقلاق، زیرولینڈ، مریخ، تاریخ وادی اور نہ جانے کن کن جہانوں کی سیر کرائی۔

سحر انگیز انداز بیان اور اپنے ہر ناول میں ان کا اچانک چونکا دینے والا اختتام قاری کو ایک عرصے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتا ہے۔

تھریسیا، سنگ ہی، لیونارڈ، جابر، نانوتہ، جیرالڈ شاستری، بوغا اور ان جیسے کئی طاقت ور و ذہین ترین منفی کردار اور پھر ان کے مقابلے کے لیے فریدی و حمید، عمران و صفدر، انور و رشیدہ جیسے مثبت کرداروں کا حسین امتزاج، مزاح کے لیے کبھی قاسم کے شگوفے تو کبھی عمران کی حماقتیں کبھی حمید کی شرارتیں تو کبھی سلیمان کی ہانڈی چولہے سے مغز ماری قاری کو مکمل طور پر باندھے رکھنے کے لیے کمال درجے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

صرف کردار نگاری کی بات کی جائے تو یہ محترم ابن صفی صاحب کے ساتھ ناانصافی ہوگی حالانکہ مجھ جیسے حقیر انسان کے الفاظ آپ کی صلاحیتوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے مگر کچھ اوصاف کا مختصراً احاطہ تو کر ہی سکتے ہیں۔

ذہانت و ندرت خیالی کے معاملے میں شاید ہی کوئی ادیب ابن صفی صاحب کا ہم پلہ ہو۔

بھلا کوئی شخص موسیقی کے تختے پر چھبیس تاروں کی مدد سے کوئی کوڈ ورڈ لینگویج وضع کر سکتا ہے جیسا کہ موصوف نے "شوگر بینک" نامی ناول میں کر کے دکھایا یہی نہیں بلکہ آپ کی کئی سائنس فکروں نے دنیا کو کئی ایجادات کی روشنی دی۔

یہ وہ سائنس فکشن تھے جو اس دور کے لوگوں کو جادوگری کی کہانیاں لگتے تھے مگر آج ہم اپنی آنکھوں سے وہ ایجادات دیکھ رہے ہیں جن کا ذکر ابن صفی صاحب نے 40 اور 50 برس پہلے اپنے ناولوں میں کیا تھا۔

آج کے کئی "آئرن مین" اور "سوپر مین" ابن صفی صاحب کے خیال سے بہت حد تک مطابقت رکھتے ہیں انہوں نے "طوفان کا اغوا" ناول میں جو "فولادی" پیش کیا تھا وہ اپنے آپ میں ایک انوکھا خیال تھا، جس زمانہ میں ان کا یہ ناول منظر عام پر آیا اس کے کچھ عرصہ بعد ہی روس میں اس طرح کا ایک روبوٹ بھی تیار ہو چکا تھا اسی طرح کی ایک چیز "موت کی آندھی" ناول میں بھی پیش کی گئی تھی۔

تاریک وادی کی سنہری کائی سے بنا ٹرانس میٹر، الیکٹرانکس، ڈاکٹر ٹسڈل کا دماغوں کی تبدیلی والا تجربہ اور ان جیسے بے شمار سائنسی تجربات سے موصوف نے ہمیں روشناس کرایا۔

اسی کے ساتھ موصوف کی نفسیات پر بھی اتنی گہری نظر تھی کہ آپ کے ایک ایک نفسیاتی کردار پر پوری پوری کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر "عامرہ" جیسا "معصوم" کردار "اذیت پسندی" کے رجحان میں مبتلا "زہریلا آدمی" اور "جنسی جنونیت" میں مبتلا "لیڈی سیتا رام" آپ کے نفسیاتی کرداروں کی بہترین مثالیں ہیں۔

آپ کے لیے جتنا بھی لکھا جائے کم ہے اس دنیا میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے الفاظ کے ذریعے آپ کے اوصاف و محاسن کا اپنے قلم سے احاطہ کر کے مکمل حق ادا کر پائیں گے۔

میں اپنے الفاظ میں تو بس اتنا کہوں گا کہ آپ کردار نگاری، منظر نگاری، ادب، نفسیات اور سائنس فکشن کے ایک مکمل اور باکمال پیکج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اخیر میں دعا گو ہوں کہ اللہ موصوف کے درجات کو بلند فرمائے اور تا قیامت آپ کے نام کو بلند و بالا اور قائم و دائم رکھے، آمین۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

نظر بد کی حقیقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''نظر بد کا وجود حق ہے۔'' (بخاری و مسلم)

نظر بد ایک خطرناک بیماری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نظر بد اور اس کی زود تاثیری سے متعلق بتایا اور فرمایا'' نظر بد آدمی کو قبر میں پہنچا دیتی ہے اور اونٹ کو ہانڈی میں (ابن عدی و ابو نعیم نے روایت کیا ہے اور یہ روایت حسن ہے)

مطلب یہ ہے کہ نظر بد انسان کو لگ جاتی ہے تو اسے ہلاک کر کے قبر میں پہنچا دیتی ہے اسی طرح اونٹ کو لگ جاتی ہے تو بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے پھر اسے ذبح کیا جاتا ہے اور ہانڈی میں پکایا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' فطری اموات کے بعد سب سے زیادہ موتیں میری امت میں نظر بد سے ہوں گی (اس روایت کو ابو داؤد، طیالسی، بزار اور بخاری نے تاریخ میں شامل کیا ہے اس کی سند حسن ہے)

نیز فرمایا'' نظر بد لگ جانے کے بعد آدمی کو اللہ کے حکم سے پہاڑ پر چڑھنے کا شوق ہوتا ہے اور وہاں سے گر پڑتا ہے (اس حدیث کو امام احمد نے روایت ہے، یہ حسن ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جب تم میں سے کوئی اپنے نفس، اپنے مال یا اپنے بھائی کی کوئی ایسی چیز دیکھے جو اسے پسند ہو تو اس کے لیے برکت کی دعا کرے کیونکہ نظر بد حق ہے۔ (اس کو حاکم اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور وہ صحیح ہے)

بحوالہ: (صحیفہ اہلحدیث)

ایس حبیب خان.....کراچی

عجیب و غریب معلومات

✿ ایک سال کی جنتری بیسویں برس پھر صحیح طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

✿ ہر سال کا پہلا اور آخری دن ایک ہوتا ہے لیپ کے سال پابندی ٹوٹ جاتی ہے۔

✿ اکتوبر کی پہلی تاریخ کو ہمیشہ وہی دن آئے گا جو جنوری کی پہلی تاریخ کو ہوگا۔

✿ فروری، مارچ اور نومبر ہمیشہ ہر سال ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

✿ مئی، جون اور اگست ہمیشہ متفرق دنوں سے شروع ہوتے آئے ہیں۔

✿ اپریل اور جولائی ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

✿ ستمبر اور دسمبر ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

✿ کوئی عیسوی صدی اتوار، بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوتی۔

محمد رفاقت.....واہ کینٹ، نواب آباد

عورت

عورت ذات کا جو تصور ہمارے معاشرے میں پیش کیا جاتا ہے اس میں سے ہماری پہلی سوچ عورت کے لیے یہ ہے کہ عورت ذات صنف نازک ہے اور فہم و فراست سے فارغ ہے نا تو عورت میں فیصلہ کن صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی عورت مرد کی نسبت زیادہ بوجھ اٹھا سکتی ہے عورت کی ذات تو نامکمل ہے زندگی کے سارے بوجھ تو صرف اور صرف مرد کی ذات کے لیے بنے ہیں جس روز مرد اپنے کردار سے غافل ہوگا اس روز دنیا الٹی ہو جائے گی بے لگام عورت کو مرد ہی قابو کر سکتا ہے لیکن اس سب کے باوجود لڑکا کند ذہن تھا لہٰذا تعلیم کے زیور سے محروم رہا سارا دن گلی کوچوں کی پائیوں سے مٹی اڑاتے اڑاتے طبیعت میں آوارگی آ گئی اور آوارگی میں انسان کو نشے کی لت نہ لگے ایسا ممکن نہیں خواہ وہ ایک سادہ سگریٹ ہی کیوں نہ ہو، عقل سے فارغ تعلیم سے محروم اخلاقیات سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں بکھرے بال اجلی رنگت میلے کپڑے پسینے سے شرابور مٹی میں گم پاؤں گریباں کے دو بٹن کھولے ہوئے کانوں میں ہینڈ فری ہاتھ میں سگریٹ گلے میں کڑا نوجوان ہر آنے جانے والے کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کہیں اور سے آئی ہوئی مخلوق ہوں اتنے میں دور سے ابا کی نظر پڑی تو وہ

یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر میری تربیت میں کس چیز کی کمی رہ گئی خیر ابا نے گھر جاتے ہی نیک بخت خاتون خانہ سے کہا میں سوچ رہا ہوں اب تمہارا لڑکا میری تو اک نہیں سنتا کیوں نہ اس کی شادی کر دی جائے آنے والی خود ہی اس کو سیدھا کر لے گی اس پر نیک بخت نے اتفاق کرتے ہوئے ہاں میں اپنا سر ہلایا لڑکے کی ذات کا مثبت پہلو پیش کرتے ہوئے مناسب رشتہ تلاش کیا اور شادی کر دی شادی کے بعد ابتدائی ماہ تو اچھے گزرے لیکن جیسے ہی پتا چلا کہ اب گزارا مشکل ہے ذمہ داری اب بڑھنے والی ہے تو لڑکا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس پر آنے والی نیک دل عورت نے کہا میرا زیور لے لو اور بیچ کر کوئی کام کر لو لیکن جس نے ساری زندگی آوارہ گردی میں گزار دی ہو وہ کاروبار کیسے کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ہنر تھا پاس تو لے دے جو بچی تھی وہ صرف مزدوری تھی لیکن طبیعت کی نازکی اس کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی لہٰذا میاں جی اپنی دنیا میں آنے والے بچے کے حال کو چھوڑ کر اس کے بہتر مستقبل کے لیے بیرون ملک چلے گئے اور جاتے جاتے نیک دل کو اس کے حال پر چھوڑ گئے میاں جی نے نیک دل کو کمر کر دی وقت اپنی رفتار کے ساتھ گزرتا گیا میاں جی کی آمدنی گھر آتی رہی نیک دل نے گھر بڑی کفایت شعاری کے ساتھ چلایا نیک دل کی ذات نے اپنی ذات کو ہمیشہ میدان زندگی میں تنہا پایا زمانے کی تلخیوں سے وہ تنہا لڑی اور کبھی جو بھولے سے اپنی ذات کا خیال آتا تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتی کہ اب تو میری ذات بٹ چکی ہے میرے بچے کی صورت میں پتا ہی نہ چلا کب اولاد جوان ہوگی نیک دل نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی زندگی کا ایک طویل عرصہ باہر گزار کر جب میاں جی واپس آئے تو نیک دل نے کہا اگر میری زندگی میں میاں جی جیسا کامیاب انسان نہ ہوتا تو میں نامکمل ہوتی میری اور میرے بچے کی کامیابی کے پیچھے میاں جی کا ہاتھ ہے میاں جی نے اپنی ساری زندگی پردیس میں گزار دی صرف ہماری ذات کے لیے میرے پاس تو سہارا تھا میری اولاد کا ایک میاں جی کے پاس صرف اور صرف ہماری یادیں تھیں اور اس طرح نیک دل نے اپنی ساری کاوشوں کا سہرا میاں جی کو سونپ دیا در حقیقت میاں جی تو وہ شخص تھا جو اپنا بوجھ سے پیٹھ پھیر کر بیرون ملک چلا گیا تھا ایک ادھوری ذات کو تنہا چھوڑ کر جس کو والدین قابو نہ کر سکے اس کو صنف نازک کے حوالے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کو قابو کرو ہمارے معاشرے میں مرد اپنا آدھا سے زیادہ بوجھ عورت پر ڈال دیتا ہے ایک کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہی نہیں بلکہ پوری ذات ہوتی ہے۔

حسین جاوید......منچن آباد

عبرت

حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے حضرت حسنؓ کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا۔

پرانے کھنڈرات میں جایا کرو بوسیدہ عمارتوں کو دیکھا کرو شکستہ گنبدوں کو دیکھا کرو ٹوٹے ہوئے میناروں کو دیکھا کرو اور پھر ان سے پوچھا کرو کہاں چلے گئے یہاں کے رہنے والے کبھی تو یہاں پر رونق محفلیں تھیں خوشیوں کی لہریں تھیں یار و احباب کی طویل مجلسیں تھیں آج وہ سب کہاں چلے گئے بیٹا تھے اس کے اندر سے خاموش آواز آئے گی کہ وہ دھوکے کے گھر سے نکل کر ہمیشہ کے گھر کی طرف چلے گئے تنہائیوں کے گھر وحشت و دہشت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پہنچ گئے پس ان سے عبرت حاصل کرو۔

عبدالجبار رومی انصاری......چوہنگ سٹی لاہور

جنت

اللہ کی رضا اور خوشی کا ٹھکانہ جسے اللہ تعالیٰ انتہائی خوب صورت بنایا ہے اور جس میں نیک لوگوں کے لیے بیش بہا انعامات ہیں اور اللہ اپنے جن بندوں سے راضی ہوگا انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت عطا فرمائے گا اور یہ اس کے نیک لوگوں کے لیے بہت بڑے اجر کا مقام ہے جنت میں داخل ہونے کے لیے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے نیک لوگ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے درجہ بدرجہ داخل ہوں گے۔

جنت کے دروازوں کے جنت۔

جنت الماویٰ، دارالمقام، دارالسلام، دارالخلد، جنت العدن، جنت النعیم، جنت الکیف، جنت الفردوس۔

عبدالجبار روی......چوہنگ لاہور

سیلفی

ماں بیٹے سے بیٹا وہ دیکھو اس لڑکی کو فالج ہو گیا ہے اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے ہونٹ بھی پچک گئے ہیں اور گردن بھی ٹیڑھی ہو گئی ہے چلو اس کی مدد کرتے ہیں۔

بیٹا: اف ماں وہ لڑکی سیلفی لے رہی ہے اپنی۔

......☆......

مرد

بچہ باپ سے: ابو مرد کسے کہتے ہیں؟

باپ: اس پاورفل انسان کو جو گھر پر حکومت کرتا ہے۔

بچہ: بڑا ہو کر میں بھی امی کی طرح مرد بنوں گا۔

......☆......

دھک دھک کرنے لگا

لڑکی آئس کریم کھاتے ہوئے اپنے بوائے فرینڈ سے بولی۔

مجھے کچھ ایسا کہو کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جائے۔

لڑکا: میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

گل مہر......کراچی

اے دل

دل ایک ایسی ضروری چیز ہے کہ اگر یہ دھڑکنا بند کردے تو انسان اس جہان سے اس جہان میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا، اسے کانچ کا ٹکڑا بھی کہتے ہیں یعنی نازک ہے یہ کسی پر آ بھی جاتا ہے یہ چوری بھی ہو جاتا ہے اس کو روکنا مشکل ہوتا ہے یہ اگر کسی کے پاس چلا بھی جائے تو انسان کا کام چلتا رہتا ہے وہ زندہ رہتا ہے یہ ٹوٹ کر بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے اس میں کسی کو رکھا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے ارمان بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے ارمان آنسوؤں میں بھی بہہ جاتے ہیں بظاہر تو اس کا کام پورے انسانی جسم میں خون پہنچانا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ کبھی کبھی اس کا پریشر کم یا زیادہ ہو جاتا ہے اور انسان اسپتال پہنچ جاتا ہے لیکن انسان پرہیز نہیں کرتا ملاوٹ بھی انسان میں کھانے پینے کی چیزوں میں کرتا ہے اور ان کے دل پتھر کے ہو جائے ہیں پھر ان سے شکایتیں کیسی گلہ کیسا بہرحال اگر دل نہ ہوتا تو محبت کیسے ہوتی کہاں پر کسی کو رکھا جاتا ویسے ایک بات ہے یہ اگر چوری ہو جائے تو اس کی رپورٹ کسی تھانے میں درج نہیں ہو سکتی کیونکہ جب تھانے والے آپ کا طبی معائنہ کروائیں گے تو یہ آپ کا بھانڈہ پھوڑ دے گا کیونکہ یہ سینے میں موجود ہوگا اور آپ پر مقدمہ بھی نہیں بن سکتا، اس لیے اس کے چوری ہونے پر دو آنسو بہا کر آرام سے بیٹھ جائیں اور دیواروں سے باتیں کرلیں ویسے فی زمانہ اس میں سے کسی کو نکال کر دوسرے کو بھی بسایا جاسکتا ہے اور اب یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ یہ دل می رہنے والے دل سے نہیں نکلتے، یہ اگر اداس ہو جائے تو اسے جھوٹی تسلیوں سے بہلایا جاسکتا ہے یہ کبھی کبھی بچہ بھی بن جاتا ہے اس لیے اس کی ہر بات نہیں ماننی چاہیے، بقول شاعر

دل کا بھی کبھی ہوتا ہے بچوں کا سا عالم
ہو زہر بھی خوش رنگ تو پینے کو مچل جاتا ہے

ریاض بٹ......حسن ابدال

غم

اگر یہ بات مان لی جائے کہ غم شخصیت ساز ہے اور غم اسی کی عطا ہے جس نے خوشی دی تھی تو انسان کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ لوگ حالات اور ترقی سے خوشی حاصل کرتے ہیں حالانکہ خوشی کا تعلق حالات سے نہیں خوشی تو ایک حالت کا نام ہے اپنی حالت' اپنا احساس' اپنا انداز فکر دراصل اپنے احساس کی اصلاح ہو جائے تو غم اور خوشی کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔

واصف علی واصف

فوزیہ سلطانہ......تونسہ شریف

سیاستدان بیوی

☆ ''سنئے! میں کب سے آپ کو برملفنگ دے رہی ہوں آپ توجہ ہی نہیں دے رہے۔''

☆ ''میرا خیال ہے چھٹیاں گزارنے سنگاپور چلتے ہیں جب کہ آپ کا خیال نادرن ایریاز کا ہے' یوں کرتے ہیں بچوں سے ووٹ مانگتے ہیں جسے زیادہ ووٹ ملے اس کی پسندیدہ جگہ چلے جائیں گے......سمپل۔''

☆ میرے ہاتھ کے کھانوں میں کیا برائی ہوتی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں کہ آئندہ کھانا میں نہ بناؤں اس گھر میں تو جمہوریت نام کو نہیں۔''

☆ ''دیکھیں آپ مثبت اپوزیشن کا کردار ادا نہیں کررہے ہر وقت تنقید' ہر وقت تنقید..... آپ اپنا امیج خراب کررہے ہیں۔

☆ سنیں! میں امی کے گھر کا پانچ روزہ دورہ کرنے جارہی ہوں' خدا حافظ۔''

ثانیہ عبدالغفور.....للیانی' سرگودھا

کیا آپ جانتے ہیں؟

❖ پارسی اپنے مردوں کو نہ دفناتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ ایک خاص عمارت میں گدھوں کے کھانے کے لیے چھوڑ آتے ہیں اس خاص عمارت کو ''دخمہ'' کہتے ہیں۔

❖ مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی سور کا گوشت نہیں کھاتے۔

❖ جھینگا مچھلی کے خون کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔

❖ بلی کو بدہضمی ہو تو وہ گھاس بھی کھاتی ہے۔

❖ فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کے دانت پیدائش کے وقت موجود تھے۔

عظمیٰ فرید خان.....ڈی آئی خان

ہاں یہ بھی پاکستان ہے

✿ جہاں راہ چلتے اجنبی لوگ، ناشناسا فیس بک فرینڈ دعائیں دیتے ہیں۔ مدد مانگنے پر بلا جان و پہچان اپنی جیبیں کھول دیتے ہیں۔ جہاں دوست ہوٹلوں، ریسٹورنٹس میں بل ادا کرنے پر آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ ہاں یہ بھی پاکستان ہے۔

✿ جہاں ایدھی، عمران خان کے جھولی پھیلانے پر عورتوں اپنی پسندیدہ متاع زیورات اور بچے اپنی من پسند شے گلے توڑ دیتے ہیں۔ جہاں بھوکے پیاسے بیمار اور کمزور، جوان اور تندرست سب کسی ضرورت مند کو خون دینے کے لئے قطاریں سجا دیتے ہیں۔ جہاں جنازے میں لاوارث ہو یا انجان سب کی میتوں کو کندھا دینے لوگ وافر دستیاب ہوتے ہیں۔

✿ جہاں بسوں ویگنوں میں بوڑھے کو دیکھ کر جوان بھی بھی اپنی نشستیں چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں کھانا ایک ڈرائیور کا ہوتا ہے اور کھاتے چار ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہیں پھر بھی شکوہ شکن نہیں ہوتے۔ جہاں آج بھی درجنوں مفت ہسپتال اور خیراتی ادارے کروڑوں کے بجٹ رکھنے کے باوجود، نامعلوم افراد کے پیسوں سے چلتے ہیں۔

✿ جہاں آج بھی لوگ پورا دن بھوکا رہ کر روکھی سوکھی کھا کر شکر الحمدللہ کہتے ہیں۔ جہاں آج بھی ہزاروں جانیں گنوانے کے بعد اپنی قوم کے لئے مرنے کو پولس اور فوج کے جوان بیتاب رہتے ہیں۔

✿ اس دیس کی بات کررہا ہوں جو جہاں مائیں اپنے گبھرو جوانوں کی لاشیں دیکھ کر آنسو ٹپکنے نہیں دیتیں کہ شہید خون کی حرمت پر حرف نہ آئے۔ جہاں اگر فرض شناسی پر لوگ اتریں تو دس ہزار ماہانہ پر چوکیدار اپنی گلی محلے کے لئے، ڈرائیور اپنے مالک کے لئے جان بھی دے دیتے ہیں۔

✿ جہاں سیلز مین صرف اس لئے اپنا کمیشن چھوڑ دیتا ہے کہ آپ نے اسے بیٹا کہہ کر بلایا ہے۔ جہاں اجنبی خاتون کو باجی کہہ کر پھر اسکا ایسا حق ادا کرتے ہیں کہ سگا بھائی بھی جو نہ کرسکے۔ جہاں محبت ایسی لوگ نچھاور کرتے ہیں کہ اپنی جانیں، تجوریاں، اپنا مال و اسباب اپنے محبوب ہیروز پر لٹا دیتے ہیں۔ جہاں دور پہاڑوں میں، کہیں ویرانے میں، کہیں صحرا تو کہیں میدانوں میں مہمان کا لفظ بولا جائے تو مقامی باسی، رضا کارانہ میزبان بن جاتے ہیں۔

✿ جہاں محبت اور سچائی کے دو بول اتنے دل کے پار اترتے ہیں کہ اس کہنے والے کو اپنی عزت اور فخر میں اجرک، چادر، پگ، پہنا کر شریک کر لیتے ہیں۔ جہاں ہر بوڑھا دادا اور ہر بوڑھی دادی ہوتی ہے۔ ہاں ایسا بھی پاکستان ہے۔ ابھی بھی ہے۔ کم ہے مگر ہے ضرور۔ ہم مجموعی طور پر برے ہیں مگر بدترین نہیں۔

✿ اس اور اس جیسے پاکستان کو بھی کبھی دریافت کرلیا کریں کیونکہ اسی پاکستان کو ہم نے بڑھانا اور پروان چڑھانا ہے۔

انتخاب: آبرو نبیلہ اقبال.....راولپنڈی

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

اِس جسم کی ہر سانس جو الجھن میں پڑی ہے
یہ کون سی مٹی ہے جو دامن میں پڑی ہے
میں خود میں کسی دن کی طرح ڈوب رہا ہوں
تصویر کہیں دور کے برتن میں پڑی ہے
پھولوں کی طرح سب در و دیوار کھلے ہیں
تتلی کی جھلک کیا مرے آنگن میں پڑی ہے
میں اُس کو سلیقے سے بسر کر تو رہا ہوں
اِک خواہشِ دنیا جو مرے من میں پڑی ہے
ہم لوگ تو گھبرائے ہیں اندر کی گھٹن سے
دیوار کی سب دھوپ تو آنگن میں پڑی ہے

افضل گوھر راو......سرگودھا

غزل

چل چلاو جرس کی قید میں ہے
قافلہ پیش و پس کی قید میں ہے
باغ سے باغباں کو کیا حاصل
پھول کا رس مگس کی قید میں ہے
خیر ہو انقلاب کی یا رب
ملک اک بوالہوس کی قید میں ہے
موت صدیوں پہ ہے محیط مگر
زندگی کچھ برس کی قید میں ہے
ساری دنیا تو قید ہے دل میں
دل مگر اک نفس کی قید میں ہے
سو گلوں سے کھنچے کہ اک گل سے
نشہ ء مئے تو رس کی قید میں ہے
بجلیوں کو پتہ ہے اے سلمان
آشیاں خار و خس کی قید میں ہے

شاعر: سلمان عابدی
انتخاب: اقبال حسین شاہ......لاہور

غزل

زندگی تجھ کو اگر وجد میں لاؤں واپس
چاک پہ کوزہ رکھوں، خاک بناؤں واپس
دل میں اک غیر مناسب سی تمنا جاگی
تجھ کو ناراض کروں روز مناؤں واپس
وہ مرا نام نہ لے صرف پکارے تو سہی
کچھ بہانہ تو ملے دوڑ کے آؤں واپس
وقت کا ہاتھ پکڑنے کی شرارت کر کے
اپنے ماضی کی طرف بھاگتا جاؤں واپس
یہ زمیں گھومتی رہتی ہے فقط ایک ہی سمت
تو جو کہہ دے تو اسے آج گھماؤں واپس
تھا ترا حکم سو جنت سے زمیں پر آیا
ہو گیا ختم تماشا تو میں جاؤں واپس

شاعر: نذر حسین ناز
انتخاب: نبیل بٹ......دوبئی

دیدنی

میں جب چاند کو دیکھوں تو
چاند اپنی خاص ادا سے
بدلی میں چھپ جاتا ہے
کبھی بدلی کی اوٹ سے جھانکتا ہے
اور کبھی دیر تک بدلی میں چھپا رہتا ہے
چھپ دکھلانے
اور چھپنے کا یہ کھیل ظریف احسن
ہے ازل سے جاری
پیار نگری کی ریت پرانی
آ سجنی ہم بھی کھیلیں گے آنکھ مچولی

ظریف احسن......

غزل

سوکھے پتے بھی ہوا دیتے ہیں
کبھی بچھڑے بھی دعا دیتے ہیں
مل بیٹھے تھے کبھی ہم دونوں
گزرے لمحے وہ صدا دیتے ہیں
عمر گزری حسرتوں میں اپنی
پھر پودا الفت لگا دیتے ہیں

کتنے اچھے ہیں میرے ہم سفر
بجھے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
جن سے تعلق تھا نہ بچھڑنے کا
اپنا ہوتے ہوئے بھلا دیتے ہیں
جن اپنوں پہ ناز تھا ہمیں
وہی جین کی سزا دیتے ہیں
مر مر کے جینا ہے مقدر حسن
ہمیں کب لوگ وفا دیتے ہیں

ایم حسن نظامی.....قبولہ شریف

غزل

جب سے تم گئے تیری اک اک چیز سنبھال رکھی
تیری یادیں دل کے خانوں میں ہی سنبھال رکھی
بچھڑ کر جب روئے تھے وہ آنسو رومال میں سنبھال رکھے
لکھتے ہو جو تم مجھے خطوط وہ سب سنبھال رکھے
جس باغ میں ملا کرتے وہ پھول سنبھال رکھے
جن کپوں میں تم چائے پیا کرتے وہ کپ سنبھال رکھے
پکڑی تھی جب شال میری وہ شال میں نے سنبھال رکھی
دیکھا تھا جب مڑ کر وہ آنکھوں کی حدت سنبھال رکھی
تیری تصویر سات خانوں میں سنبھال رکھی
بیٹھا کرتے تھے جس کرسی پر وہ کرسی سنبھال رکھی
تیری یادوں کے دیے آنکھوں میں سنبھال رکھے
جن دروازوں سے ٹیک لگا کر کھڑے تھے وہ دروازے سنبھال رکھے

صغریٰ کوثر.....اوکاڑہ

غزل

پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اترا
نیند کی جھیل پہ اک خواب پرانا اترا
آزمائش میں کہاں عشق بھی پورا اترا
حسن کے آگے تو تقدیر کا لکھا اترا
دھوپ ڈھلنے لگی دیوار سے سایہ اترا
سطح ہموار ہوئی پیار کا دریا اترا
یاد سے نام مٹا ذہن سے چہرہ اترا
چند لمحوں میں نظر سے تری کیا کیا اترا
آج کی شب میں پریشاں ہوں تو یوں لگتا ہے
آج ماہتاب کا چہرہ بھی ہے اترا اترا
میری وحشت رم آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب میری ذات میں تنہائی کا صحرا اترا
اک شب غم کے اندھیرے نہیں ہے موقوف
تو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اترا

عبدالجبار رومی انصاری.....چوہنگ سٹی لاہور

غزل

انجان بن رہا تھا مگر جانتا بھی تھا
دل کو محبتیں بھی تھی اس سے گلہ بھی تھا
اب یاد کچھ نہیں بچھڑے تھے کس جگہ
کچھ دور ساتھ ساتھ وہ میرے چلا بھی تھا
پچھلے برس ملا تھا بڑے اہتمام سے
آنکھوں میں رت جگے بھی تھے رنگ حیا بھی تھا
برہم سا ہو بھی جاتا تھا وہ میرے ذکر پر
لیکن اکیلے پن میں مجھے سوچتا بھی تھا
یہ اور بات ہے کہ نہ راس آئیں رونقیں
اک شہر دل میں آرزوؤں کا بسایا بھی تھا
اب اختلاف کرتا ہے میرے خیال سے
پچھلے برس تو ساتھ میرے آئینہ بھی تھا

محمد احمد رضا انصاری.....کوٹ ادو

غزل

کوئی سکھ نہیں ملا بچھڑ جانے سے
کیسے کیسے غم ملے ہیں پھر زمانے سے
بدل نہیں سکتے ہم زندگی کا معیار بھی
کوئی خوشی نہیں ملی ہمیں اسے پانے سے
دامن میں اپنے آنسوؤں کی برسات ہو جیسے
فائدہ کیا کسی کو پھر حال دل سنانے میں
نام اپنا کب آئے گا پھر سے بہاروں میں
کیا حاصل دامن میں یوں پھول سجانے سے
ناکام ہے زندگی مفلسی کے موڑ پر جاوید
اندھیرے ہی راس آئے ہیں چراغ جلانے سے

محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد

غزل

لگا کے رکھ نہ اپنے ساتھ مجھ کو
کہیں بہکا نہ دیں جذبات مجھ کو
وہاں پریوں کی ملکہ مظرب ہے
اٹھا لے جائیں نہ جنات مجھ کو
مجھے اس دھوپ سے جنگ جیتنی ہے
لگانے ہیں بہت سے باغات مجھ کو
مرے اندر کوئی ہلچل مچی ہے
سکوں ملتا نہیں دن رات مجھ کو
وہ بزدل ہے مگر چالاک بھی ہے
کہ مارے گا لگا کے گھات مجھ کو
مرے دل سے اجالا پھوٹتا ہے
فلک سے آتی ہے سوغات مجھ کو
کوئی مجھ کو بتائے بھی تو ارشد
کہاں لے جائیں گے حالات مجھ کو

شاعر: ارشد محمد ارشد

انتخاب: پرنس افضل شاہین.....بہاولنگر

غزل

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے تکتے تھے سرخ پھول
مجھ کو کسی کا عکس لگتے تھے سرخ پھول
شاید کہیں ہمیں بھی کوئی دیدہ ور ملے
شاخ تمنا چھوڑ کر کہتے تھے سرخ پھول
اثر دعاؤں کا اپنی یوں بارہا
دست طلب میں روز ہی گرتے تھے سرخ پھول
گویا محبتوں میں بھی شامل تھیں رنجشیں
وہ زرد روشنائی سے لکھتے تھے سرخ پھول
جس راہ بھی چلا ہوں وہی خار خار تھی
یہ اور بات آپ کو ملتے تھے سرخ پھول
حیران رہ گیا تھا میں یہ دیکھ کر احسان
خود آشنا بھی ہاتھ میں رکھتے تھے سرخ پھول

احسان سحر.....میانوالی

غزل

دھوپ کی چادر تنی تھی دور تک سایہ نہ تھا
پھر بھی سورج اپنی امیدوں کا گہنا یا نہ تھا
دل لگی کرتا رہا لیکن پرایا ہوگیا
میں تہی دامن تھا میرے پاس سرمایہ نہ تھا
ڈس لیا فصل خزاں نے ہر شجر ہر شاخ کو
کوئی پتا بھی نہ تھا ایسا جو زرد ایا نہ تھا
اس کو دیکھا دل دیا جاری ہوئی مشق سخن
شاعری کا اس سے پہلے شوق فرمایا نہ تھا
زندگی اپنی گزرتی تھی بڑے آرام سے
جب تلک وہ دشمن جاں بام پر آیا نہ تھا
عمر بھر نکلے نہیں اپنی انا کے خول سے
ہم نے اپنی جرأتوں کا لوہا منوایا نہ تھا
یاد کرتا ہوں قمر ان گزرے وقتوں کو کہ جب
دل کا شیشہ پتھروں کے ساتھ ٹکرایا نہ تھا

ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

غزل

نہیں ملتا کوئی مدھم سا بھی اشارہ، کیا کروں جاناں؟
نہ جانے کب ہو پھر ملنا دوبارہ، کیا کروں جاناں؟
تمہاری جھیل آنکھوں میں، میں ہوں ڈوبا ہوا کب سے
نہیں ہے دور تک کوئی کنارہ، کیا کروں جاناں؟
کٹھن ایام ہیں مجھ پر، میں کب سے گردشوں میں ہوں
نہ جانے چمکے کب قسمت کا تارہ، کیا کروں جاناں؟
نجانے کیوں میری آواز، اب تم تک نہیں جاتی
ہر ہر لمحہ تجھے میں نے پکارہ، کیا کروں جاناں؟
مجھے مجرم نہ سمجھو تم، خطا کوئی نہیں میری
میرے حالات نے مجھ کو بگاڑا، کیا کروں جاناں؟
تمہارا ہوں تمہارے واسطے ہی ہوں کسی کاری
ہوں سب کی نظر میں، میں ناکارہ، کیا کروں جاناں؟
جدائی کر دی مقدر میرا، مگر اتنا تو سوچو تم
ہے تم بن کون اس دل کا سہارا، کیا کروں جاناں؟
زمانے نے جو کی باتیں، لگی ہے آگ تن من میں
میری روح بن گئی ہے اک شرارہ، کیا کروں جاناں؟
نہیں کٹتے یہ دن "شامی"، نہ کٹتی ہیں تنہا راتیں
ہے اب تم بن بہت مشکل گزارہ، کیا کروں جاناں

احتشام شامی.....اٹک

غزل

فصلِ شاہِ جہاں مجھ پر بھی تو ہو سکتا ہے
نورِ یزداں مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے
کیوں نہ کر دیکھوں خدا سیمیں سرِ طور سوال
وہ تجلی سے کچھ اوپر بھی تو ہو سکتا ہے
ہم نشیں جو مجھے ملتے ہیں گرم جوشی سے
ان کی آستینوں میں خنجر بھی تو ہو سکتا ہے
آج ہے گردشِ دوراں کے نشانے پر جو
کل کو قسمت کا سکندر بھی تو ہو سکتا ہے
ناتواں جسم و جاں اور تشنہ دکھائی دے جو
ذات میں اپنی سمندر بھی تو ہو سکتا ہے

عامر شہزاد تشنہ......یو ایس اے امریکہ

پیا

سوجی اکھیاں بھر بھر آوت
جیا مورا جلاوت ہے
مورے پیا تم کو دیکھت صدیاں
بیتی ہجر نگوڑا کھاوت ہے
راہ میں توری بچھ بچھ
جاوت انکھیاں موری
پیا تو ہے دیکھا نہیں بس راحت ہے
عشق اوکھڑا بھانجر بالے
مورے پیا جگ میں یہی کہاوت ہے
دل بکھرے جاں پگھلے موری
مورے پیا مرگ کی اب بس آہٹ آوت ہے
چپ میں مورا جیا سلگے پیا
ہر لمحہ موہے ستاوت ہے

شاعرہ: انابیہ رحمٰن......ڈیرہ غازی خان

غزل

کیا کروں بیقراری پے اختیار نہیں رہا میرا
جس کا محتاج تھا آج وہ یار نہیں رہا میرا
آنکھیں چار نہیں جانِ تجھ پے قربان کرتا ہوں
ناز اٹھا رہا ہوں پر زندگی پے اعتبار نہیں رہا میرا
میں فرشتہ نہیں کہ حادثات مجھ پہ اثر نہ کریں
جانا تو ہے اک دن پر تقدیر سے گلہ نہیں رہا میرا
دید کیا شے ہے اس کا احساس نہیں مجھے
لٹنے کے بعد تجھ سے حجاب نہیں رہا میرا
زلف تیری پریشان دیکھ کر پی رہا ہوں میں
مراسم رکھنا عزیز ہیں پر خاندان نہیں رہا میرا
آخری بار کہہ رہا ہوں نکل جا مرے خواب سے
تیرے جانے کے بعد کوئی مراسم نہیں رہا میرا
نیلی چادر اوڑھنے کا شوق ہے تجھے کامران
تیرے انکار کے بعد کوئی یار نہیں رہا میرا

کامران مغل......کراچی

کوئی یاد بہت آئے

جب ہجر کے لمحوں میں
کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں
حدوں سے گزر جائے
پھر دل کے دریچے سے
ایک چاند کو تم تکنا
بے تاب دھڑکنوں کو
قابو میں مگر رکھنا
گزرے ہوئے لمحوں کو
چپکے سے بلا لینا
مظہر میرے کیا ہو
تم تو میرے جہاں ہو
اب ایک پل بھی تم بن
مجھ سے رہا نہ جائے
جب ہجر کے لمحوں میں کوئی یاد بہت آئے
اور درد بھی ایسے میں حدوں سے گزر جائے

صائمہ ناز......تاروجبہ

مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر 3

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر.....وہ کسی کا مرید ہو گیا.....!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی

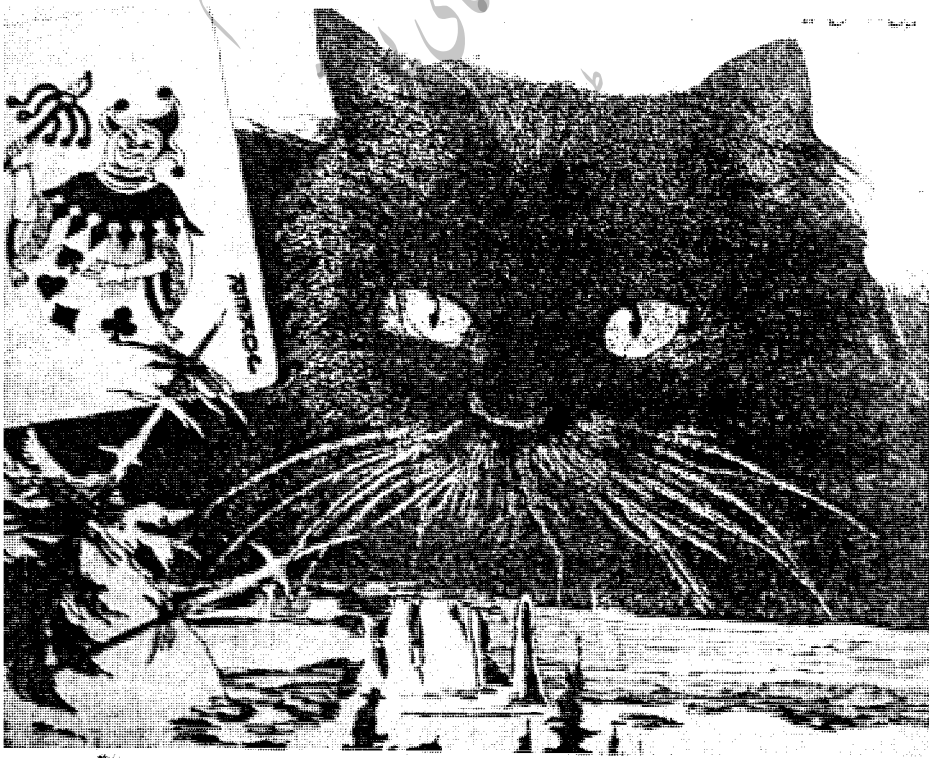

حجاب بی بی وقت کی بے اعتباری اور حالات وواقعات کی سفاکی پر مسلسل ذہن ودل کو سن کردینے والی ایک صدماتی کیفیت کا شکار تھی۔ اپنی ذلت ورسوائی کے احساس سے ایک ذرا توجہ ہٹاتی تو اپنوں کی فکرمندی اس کے سینے میں بھنور پیدا کرنے لگتی..... ہاں جی' بابا سائیں اور تینوں بھائیوں کے چہرے اس کی آنکھوں میں آبیٹھتے' پتا نہیں وہ سب کس حال میں تھے..... خود ان سب پر کیا گزری تھی یا کیا گزر رہی تھی ..... اس سب کی طرف سے دھیان جھٹکتی تو خود کو درپیش خطرناک اور سنگین حالات اس کا خون پانی کرنے پر تل جاتے آئندہ لمحات میں متوقع مزید ذلت انگیز سلوک اور اپنے انجام کے متعلق روح فرسا اندیشے اس کی جان کھانے لگتے۔

نندی پور سے دور ہوئے اسے تین چار روز گزر چکے تھے۔ جس رات اسے ٹریکٹر ٹرالی کے اندر بوریوں کی قبر میں ڈال کر حویلی اور گاؤں سے نکالا گیا' اس رات لاہور کے قریب ایک سنسان جگہ پر اسے ٹرالی میں سے ایک دوسری گاڑی میں منتقل کر کے ایک بہت بڑی کوٹھی میں لاکر قید کردیا گیا تھا۔ اس قید میں اس نے ایک رات اور ایک دن گزارا تھا' اس دوران وقتاً فوقتاً اسے تین شکلیں دکھائی دیتی رہی تھیں۔ دو تو خوفناک شکلوں والے رائفل بردار آدمی تھے اور ایک شادو نامی کرخت صورت دیہاتی عورت تھی جو دو بار اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ حجاب کوشش کے باوجود دو تین لقموں سے زیادہ نہ لے سکی۔ لقمہ گلے سے اترتا ہی نہیں تھا..... البتہ پانی اس نے خاصا پیا تھا' پھر اچانک اسے ایک بند باڈی کی گاڑی کے ذریعے اس کوٹھی سے کسی دوسری نامعلوم جگہ پر لاکر بند کردیا گیا۔ یہاں بند ہوئے آج اسے تیسرا دن تھا۔ شادو اور وہی دونوں رائفل بردار اس جگہ بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ دو تین اور اجنبی صورتیں بھی حجاب کو دکھائی دی تھیں مگر ابھی تک کسی نے بھی اس سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی حجاب نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اسے مسلسل دھڑکا لگا رہا تھا کہ چوہدری فرزند کسی بھی لمحے آدھمکے گا اور پھر نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے..... مگر چار روز گزر چکے تھے اور چوہدری فرزند ابھی تک تو نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ نندی پور میں ہی الجھا ہوا تھا اور ضرور وہاں کے حالات غیر معمولی اور سنگین رخ اختیار کیے ہوئے تھے۔

یہاں جس کمرے میں حجاب کو بند کیا گیا تھا یہ ایک خاصا کشادہ کمرہ تھا' فرش پر بوسیدہ سا کارپٹ بچھا ہوا تھا اور بس..... فرنیچر یا استعمال وضرورت کی اور کوئی چیز کمرے میں نہیں تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ کھڑکی ایک بھی نہیں تھی۔ البتہ روشن دان دائیں بائیں کی دونوں دیواروں میں موجود تھے' جن میں سے کبھی کبھار کہیں دور سے گزرتی کسی گاڑی کے ہارن کی دھیمی آواز اندر آجاتی یا پھر اس عمارت میں موجود افراد ہی میں سے کسی کی آواز کان پڑ جاتی تھی۔

حجاب کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ لاہور شہر میں ہے مگر یہ عمارت لاہور کے کس حصے میں واقع ہے' اس کا اسے قطعی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اسی لباس میں' اجڑی بکھری حالت میں کمرے کے ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی کہ دروازے پر ہونے والی آہٹ کی آواز سن کر دروازے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

شام کا وقت تھا' شادو اس وقت کھانا لے کر آتی تھی اور تقریباً پچھنے والے انداز میں برتن اس کے سامنے رکھ کر واپس چلی جاتی تھی۔ کم از کم ایک رائفل بردار اس کے ساتھ ضرور ہوتا تھا پھر دروازہ کھلا تو شادو کی بجائے چوہدری فرزند کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر حجاب فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔

چوہدری نے اندر داخل ہوتے ہی جیسے سب سے پہلے اس کی موجودگی کا یقین کیا پھر ایک طائرانہ سی نظر کمرے میں دوڑاتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہی دونوں رائفل بردار اس کے عقب میں موجود تھے۔ حجاب کی نظریں چوہدری کے کرخت چہرے سے پھسل کر اس کے جوتوں پر آ ٹکیں۔ دوپٹہ تو تھا نہیں' وہ اپنے آپ ہی میں سمٹ کر رہ گئی۔ خون میں دوڑتی سراسیمگی یک بارگی اس کے دل میں آدھڑکی تھی۔ اس کے سامنے ہاتھ بھر کے فاصلے پر جیسے چوہدری فرزند نہیں ایک وحشی اور خوں خوار بھیڑیا آ کھڑا ہوا تھا۔

چند لمحے تک تو حجاب کی سماعت میں اس کی اپنی دھڑکنیں ہی گونجتی رہیں پھر چوہدری فرزند کی مکروہ آواز سنائی دی۔ وہ غالباً رائفل برداروں سے مخاطب ہوا تھا۔

''اوئے اسے روٹی ٹکر نہیں ڈال رہے کیا؟''

''ڈالتے رہے ہیں جی' شاد وخود صبح شام ڈالتی ہے۔''

''تو پھر یہ ایسی مرجھائی مریل سی کیوں ہو رہی ہے..... کیوں ری..... کیا ہے تجھے؟'' چوہدری نے اس کے کولہے پر ہلکی سی ٹھوکر ماری۔

''کھڑی ہو جا۔''

حجاب فوراً کونے میں سٹی سمٹی سی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''روٹی ٹکر تو ڈالتے ہیں جی' لیکن وچاری کی طبیعت شبیعت کچھ اوپر نیچے ہے اس لیے دھیان سے کھاوے نہیں ہے۔''

''اچھا..... کیوں بھئی! کیا رولا ہے تیری طبیعت شبیعت کے ساتھ؟'' چوہدری نے اچانک اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں اس کے جبڑے دبوچتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ حجاب بی بی کی ایک نظر چوہدری کے سفاک چہرے پر پڑی اور آنکھیں از خود جھک گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے وجود میں ایک خفیف سی لرزش بھی بیدار ہو آئی ہے۔

''طبیعتیں اور دماغ درست کرنا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے' تیرے اگلے پچھلے ساروں کی طبیعتیں اور دماغ میں نے ہی درست کرنے ہیں۔ سب کا انجام چوہدری فرزند علی ہی طے کرے گا۔ تیرا بھی..... اپنی طبیعت آپ ہی ٹھیک کر لے۔ یہ کام مجھے کرنا پڑا تو بڑا پچھتائے گی' چوکھا چوکھا..... کھائے گی تو جسم پہ ماس بوٹی رہے گی اور تیرے جسم پہ ماس بوٹی کا ہونا کتنا ضروری ہے یہ تجھے ذہن میں رکھنا چاہیے..... مجھے یاد ہے..... میں نے تجھے بتایا تھا کہ میں تیرے اس حرامی ویراسرارے کے سامنے تجھ سے مجرا کراؤں گا اور تیری بوٹیاں نوچوں گا۔ ابھی تو وہ کتے کا پلا دم دبا کر کہیں..... چھپ بیٹھا ہے مگر کب تک..... میں قبر میں سے اس کا مردہ بھی نکال لاؤں گا..... اپنا کہا ہوا پورا ضرور کروں گا میں سمجھی تو؟''

چوہدری نے اسے جبڑوں سے دبوچے دبوچے اس کا سر عقب میں دیواروں سے ٹکرایا تو بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔

''طبیعت ٹھیک کرا اپنی اور ماس بوٹی بنائے رکھ..... تیرے پنڈے پر بوٹیوں کا رہنا بڑا ضروری ہے۔'' چوہدری نے ایک بار پھر اس کا سر ٹکرایا۔

''فرزند بھائی..... مجھ سے کیا غلطی' کیا گناہ.....''

چوہدری نے اس کے جبڑے چھوڑے ہی تھے کہ وہ سسک اٹھی۔ آج چار روز بعد وہ بولی تھی مگر جملہ مکمل نہ کر سکی۔ چوہدری نے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ حجاب کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

''کتے کی بچی! بھائی کسے کہہ رہی ہے؟'' چوہدری نے جھپٹ کر اسے بالوں سے دبوچا اور اس کی گردن پر اس زور سے دھپ رسید کی کہ وہ نازک جان منہ کے بل فرش پر آ رہی۔ اگر اضطراری طور پر اس کے ہاتھ حرکت میں نہ آئے ہوتے تو فرش سے ٹکرانے کے بعد اس کے چہرے کی نجانے کیا حالت بنتی۔ منہ اور گردن پر پڑنے والی بھاری ہتھوڑوں جیسی دو ہی ضربیں اس کے حواس مختل کر گئی تھیں۔ تیسری ضرب اس کی پسلیوں میں پڑی تھی اور ایسی شدید تھی کہ ہزار ضبط کے باوجود حجاب بی بی کے حلق سے ذبح ہوتی بکری جیسی کرب ناک آوازیں خارج ہونے لگیں اور وہ اپنی پسلیاں تھامتے ہوئے وہیں گٹھڑی سی بن کر رہ گئی۔

''چوہدری فرزند علی نام ہے میرا' تیری جرات کیسے ہوئی مجھے بھائی کہنے کی! کنجری کی بچی! اب اپنی گندی زبان سے مجھے بھائی کہا تو تیری زبان کھینچ کر.....'' چوہدری نے اتنی گھٹیا اور واہیات بات کہی کہ حجاب کی روح تک جیسے ننگی ہو کر رہ گئی۔

''خدا کے لیے چوہدری صاحب! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے مم..... میرے بھائی سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو چھوٹا سمجھ کر اسے معاف کر دیں..... بخش دیں اسے۔''

حجاب بی بی جیسے بولی نہیں کراہی تھی..... گھگھیائی تھی۔ ''اپنے''..... یا اپنوں کے لیے کچھ کر پانا اس کے لیے ممکن ہی کہاں تھا اور جو ممکن تھا وہ یہی تھا جو وہ ان لمحوں چوہدری فرزند کے قدموں میں پڑی کر رہی تھی۔

''معاف کر دیں.....'' چوہدری نے تحقیر سے کہا پھر اپنے عقب میں کھڑے رائفل برداروں سے مخاطب ہوا۔

''سن بھئی سانگھے..... حکم داد! سنو ذرا اپنے نندی پور

کے خوردار اور وڈے شاہ کی دھی رانی کیا فرما رہی ہے! اسے اور اس کے پچھلوں کو معاف کر دیں...... بخش دیں انہیں۔"

چوہدری نے حجاب کی ران کو اپنی نوروزی کا نشانہ بنایا تو حجاب ایک بار پھر بلبلا اٹھی۔ اس کا وجود چوہدری فرزند کی ٹھوکروں میں بکھرا پڑا تھا تو روح چوہدری کے جملوں کے کوڑوں کی زد پر تھی۔

"ٹیڑھی گردنوں والے تین تین سورما بھائیوں کی اکلوتی لاڈو بہن کتیا کی طرح کسی کے تلوے چاٹتی ہوئی یوں معافیاں مانگتی اچھی نہیں لگتی میری جان' رہی بات معافی کی ......" چوہدری نے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر حجاب کو بالوں سے دبوچ لیا۔

"تو معافی بھی موت سے کم کسی چیز پر تو ممکن ہی نہیں۔"

چوہدری کے منہ سے تمباکو اور گڑ کی سی بو سے بھرا ہوا بھبکا نکل کر حجاب کے چہرے سے ٹکرایا۔ چوہدری نے بالوں کو کھینچ کر اس کا چہرہ اپنے بالکل سامنے کر رکھا تھا۔

"تیرے پچھلوں میں سے دو کو یہ معافی دے چکا ہوں۔"

حجاب نے پلکیں اٹھا کر چوہدری کی طرف دیکھا تھا۔

"باقیوں کی مصیبت بھی جلد ہی نجات میں بدل دوں گا...... اسرارے کو پہلے لائیو مجرا اور بلیو پرنٹ دکھاؤں گا پھر تیرے سامنے ہی اس کی مشکل آسان کروں گا اور اس کے بعد......" چوہدری کی آنکھوں اور چہرے پر درندگی تھی' خباثت تھی اور ہونٹوں پر ایک زہر خندسی سفاک مسکراہٹ۔

"اس سب کے بعد پھر میں سکون و آرام سے بیٹھ کر یہ سوچوں گا کہ تیرا کیا کیا جائے...... ہوسکتا ہے تیرے لیے کچھ آپشنز رکھ لوں۔"

اس نے گرفت بڑھاتے ہوئے ہاتھ کو حرکت دی تو حجاب کے زخمی لبوں سے سسکاری نکل گئی' اس کا چہرہ خود بخود چوہدری کے اور نزدیک کھنچ آیا تھا۔ حجاب نے اضطراری انداز میں اپنے بالوں پر جمے چوہدری کے ہاتھ کو تھام لیا۔

"تیرا مسلا کچلا گوشت اپنے ڈشکروں کے حوالے کر دوں یا...... کسی کوٹھے پر تیری دکان لگوا دوں' یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تجھے چوہدری فرزند علی اکبر کی رکھیل رہنے کا اعزاز عطا کر دیا جائے ...... یہ سب سوچوں گا...... تسلی سے۔"

چوہدری نے نفرت سے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حجاب عقب میں موجود دیوار سے ٹکرا کر وہیں پڑی سسکتی رہی اور چوہدری واپس پلٹ گیا۔

"حکم داد! شادو کو بلا لاؤ ذرا میرے پاس......" وہ حکم داد سے بات کرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ دونوں رائفل برداروں نے اس کی تقلید کی اور کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بند ہوگیا۔

کیسی شرمناک اور گھٹیا باتیں کر گیا تھا وہ...... رکھیل' کوٹھے پر دکان' مسلا کچلا گوشت...... اور وہ...... وہ جملہ تیرے پچھلوں میں سے دو کو یہ معافی دے چکا ہوں" کیا مطلب ہوا بھلا؟ چوہدری کیا کہہ گیا تھا؟ نہیں...... کہیں...... حجاب ہول کر رہ گئی؟ اپنوں میں سے کسی کی موت کا وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی' نہیں سوچ رہی تھی مگر پھر بھی...... اس کے احساسات پر گہرے تاریک سائے حاوی تھے' گہرے سیاہ سائے......

تقریباً ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ شادو آ دھمکی۔ حسب سابق وہ دیوہیکل رائفل بردار ایک قدم اندر آ کر دروازے کے سامنے ہی تن کر کھڑا ہوگیا تھا۔ حجاب کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ کھانے کے معاملے میں آج خاص اہتمام کیا گیا ہے...... وجہ بھی وہ جانتی ہی تھی...... قربانی کا جانور بھی اسے خود سے اعلیٰ و برتر محسوس ہو رہا تھا۔

حجاب کو کھانے کی طلب نہیں تھی۔ اس بات کا اس نے اظہار بھی کیا مگر...... اسے حلق تک ٹھونس کر کھانا پڑا...... اس کے بعد وہ دونوں واپس گئے اور فروٹ باسکٹ کے علاوہ دودھ کا جگ بھی اس کے سامنے رکھ گئے۔ انہیں گئے محض چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر ایک بار پھر آہٹ ہوئی۔

"کھولو تالا......" اس کے کانوں تک ایک مدھم تحکمانہ آواز پہنچی...... آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ پھر دروازہ کھلا اور توقع کے عین مطابق چوہدری اکبر علی خان اپنے پورے کروفر کے ساتھ اندر داخل ہو آیا۔

متکبر سا کھسہ' سفید کھڑ کھڑاتا ہوا کرتا' اکڑا ہوا شملہ اور

درشت صورت..... دو تین رائفل برداروں کے ساتھ ساتھ ایک دو افراد اور بھی اس کے ہمراہ تھے' البتہ چوہدری فرزند ان میں نہیں تھا۔ چوہدری کی آنکھوں کے تعاقب میں ایک ساتھ کتنی ساری آنکھیں حجاب کے وجود سے آ چمٹیں۔ چوہدری اس کی طرف بڑھا تو وہ اپنی کراہٹ کو ہونٹوں میں بھینچتی ہوئی بے اختیار اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابھی تک کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹی ہے نا تیری؟''

چوہدری چار قدم کے فاصلے پر رکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ آواز میں کرختگی کا عنصر غالب تھا۔

حجاب کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے..... وہ کچھ بھی نہیں بول پائی تھی۔

''دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہی دکھ رہی ہے.....'' انداز خود کلامی کا تھا۔

حجاب نے چوہدری کی آنکھوں کا لمس اپنے وجود کو ٹٹولتا ہوا محسوس کیا۔

کمرے میں چند لمحے تک ایک خون آشام سی خاموشی ہونکتی رہی پھر چوہدری اکبر علی کی تحکمانہ آواز بلند ہوئی۔

''دیکھ کڑیے..... توجہ سے سن..... اور چنگی طرح سمجھ لے..... میں تجھے یہاں لے جانے آیا ہوں' اور تجھے سمجھ جانا چاہیے کہ تیرا چپ چاپ یہاں سے چل پڑنا ہی فی الحال تیرے لیے اچھا ہوگا۔ ورنہ فرزند..... کسی بھی گھڑی تجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا وہ! اس لیے جدھر لے جایا جائے سر جھکا کر چپ چاپ چلتی رہنا..... اگر کسی قدم پر رکی یا بولی تو وہیں تیرے سارے کپڑے اتار کر تجھے بیچ راستے کے کھڑا کر دوں گا۔''

حجاب کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

''دو اوئے چادر اسے..... اور لے جا کر گڈی میں بٹھاؤ۔''

یقیناً وہ اپنے کارندوں سے مخاطب ہوا تھا۔

''جج' چوہدری صاحب! مم میرا کیا قصور ہے۔ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟''

الفاظ اچانک جیسے خود بخود حجاب کے ہونٹوں سے پھسل پڑے..... چوہدری اکبر علی پلٹتے پلٹتے رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں یک بہ یک ایک لاوا سا دہک اٹھا تھا۔

''یہ دشمنی بڑی گندی چیز ہوتی ہے کڑیے..... اور عزت غیرت کی دشمنی تو اور بھی گندی ہوتی ہے' تیرے بھراہ نے ہماری عزت غیرت پر ہاتھ ڈالا ہے..... ہماری عزت غیرت پر..... بندے کے بدلے بندہ..... شان کے بدلے شان' عزت غیرت کے بدلے عزت غیرت اور ساتھ میں سر بھی..... موت..... یہ ہے ہمارا قانون اور ہمارا قانون ہی ہماری شریعت ہے۔'' چوہدری ایک جھٹکے سے پلٹا اور کمرے کے فرش کو جیسے پیروں تلے روندتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک رائفل بردار نے قریب آ کر حجاب کو ایک بھاری بھرکم سی سیاہ چادر تھما دی۔

''چل یہ اچھی طرح اوڑھ لے اور ٹر۔''

حجاب نے کسی معمول کی طرح عمل کیا..... ایک بار پھر اسے کسی نئے اور نامعلوم ٹھکانے کی طرف لے جایا جانے والا تھا۔

کمرے سے اسے نکال کر اس وسیع کوٹھی کے پورچ میں کھڑی ایک پجارو میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ پورچ کی طرف آتے ہوئے اس نے چوہدری اکبر اور فرزند علی کی آوازیں بھی سنی تھیں وہ کسی اندرونی کمرے میں ایک دوسرے سے بحث کرنے میں مصروف تھے۔ یقیناً ان کا موضوع اسی کی ذات تھی۔ وہ درمیانی سیٹوں پر سر جھکائے بیٹھی رہی..... کچھ دیر بعد جب چوہدری اکبر علی واپس آیا تو ڈرائیور نے فوراً اپنی سیٹ سنبھال لی..... چوہدری خود ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا دو اجنبی صورتیں حجاب کے آگے کی سیٹوں پر آ بیٹھیں اور دو رائفل بردار اس کے عقب والی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

شام کا وقت تھا۔ صورتیں نئی تھیں مگر تھیں بے رحم اور بدترین دشمنوں کی ہی۔

گاڑی کوٹھی سے نکلی اور کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہو گئی حجاب چادر اچھی طرح اوڑھے سر جھکائے چپ چاپ دل ہی دل میں خدا کو پکارتی رہی۔ اسے اندازہ تھا کہ صرف خدا ہی ہے جو اس کی سنے گا' گاڑی مختلف راستوں اور سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ باہر ہلچل سی تھی' مختلف آوازیں تھیں مگر گاڑی کے اندر ایک مہیب خاموشی.....

پھر جب گاڑی رکنے پر اسے اترنے کو کہا گیا تو اسے تھوڑا عجیب سا محسوس ہوا' کیونکہ یہ کوئی ویرانہ نہیں تھا' نہ ہی

کسی کوٹھی کی سنگی چار دیواری تھی۔ چند مختلف آوازیں تھیں' مغرب کی اذان بھی سنائی دے رہی تھی ...... اس نے سر اٹھایا...... گاڑی غالباً کسی گنجان آبادی کی ایک کشادہ گلی میں کھڑی تھی۔ حجاب چادر کو مزید اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی...... یہ چادر بھی اس کے نزدیک خدائی تحفے جیسی تھی جس نے اسے وجود کو چھیدتی ہوئی ننگی نگاہوں سے تحفظ فراہم کر دیا تھا۔ اس نے چادر یوں لپیٹ لی تھی کہ اس کے اندر جیسے چھپ کر رہ گئی ہو۔ بس ایک آنکھ کے قریب معمولی سی جھری رکھی تھی تاکہ قدم رکھنے کی جگہ دیکھ سکے۔

ایک دو افراد فوراً گاڑی کی طرف لپکے تھے۔ حجاب کو کچھ خوشامدی سی آوازیں بھی سنائی دیں تھی چوہدری اکبر علی کی کرخت آواز نے ٹھٹکا دیا۔

"اپنی ماں کو جا کر بتاؤ' میرا' مہمان خانے میں بھجواسے۔"

چوہدری نے گاڑی سے اترتے ہی حجاب کو بازو سے دبوچا اور سامنے ہی موجود چند زینے طے کرتا ہوا ایک دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ رائفل بردار ان کے عقب میں تھے البتہ باقی دونوں افراد وہیں کھڑے رہے تھے۔

ایک مختصر سی ڈیوڑھی نما جگہ سے گزر کر وہ غالباً برآمدہ نما جگہ پر آئے...... ایک طرف دالان تھا یہاں موجود بندہ بھی چوہدری پر نظر پڑتے ہی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ چوہدری اس پر توجہ دیے بغیر ایک طرف کونے میں موجود پختہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ حجاب کا بازو بدستور اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ اوپر ایک کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ ایک پختہ عمر نسوانی آواز حجاب کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میرے نصیب' میری قسمت ہی تو چمک اٹھی ہے...... جاگیردار صاحب' اتنی مدت کے بعد آپ خود یہاں...... یوں اچانک! مجھے تو خدا قسم اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا...... آپ...... آپ حکم بھجوا دیتے تو یہ خادمہ خود حویلی......"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نزہت بیگم" چوہدری اکبر نے نزہت بیگم کی بات کاٹتے ہوئے رعونت سے کہا۔

"ہم ایک ضروری کام سے آئے ہیں اور ہمیں ابھی واپس لوٹنا ہے۔"

"آپ مالک و مختار ہیں حضور مگر تشریف تو رکھیے...... اس کنیز کو اپنی عزت افزائی اور خوش بختی کا یقین تو کر لینے دیجیے۔"

نزہت بیگم نے دیوار کے ساتھ لگے صوفوں کی طرف اشارہ کیا...... چوہدری اکبر علی صوفوں کی طرف بڑھا تو نزہت بیگم نے ایک ایکسرے جیسی نظر چادر میں لپٹی کھڑی حجاب بی بی پر ڈالی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے چوہدری اکبر علی کے سامنے ایک موڑھا کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔

"نزہت بیگم! ہم تمہیں ایک ذمہ داری سونپنے آئے ہیں۔"

"آپ کی کرم نوازی ہے جاگیردار صاحب جو آپ نے مجھ غریب کو کسی خدمت کے قابل سمجھا ہے۔" نزہت بیگم کے لہجے سے جیسے شہد ٹپکا پڑ رہا تھا مگر نجانے کیوں حجاب کو اس کا لہجہ اور انداز بہت عجیب اور ناگوار سا لگ رہا تھا۔

چوہدری نے حجاب کے عقب میں کھڑے اپنے ایک کارندے کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر حجاب کی چادر پکڑ لی اور ایک جھٹکے سے کھینچ لی۔ حجاب نے چادر کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا لہٰذا وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ چوہدری اکبر کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔

"یہ لڑکی ہمارے ایک دشمن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے مگر اس سے ہماری کوئی دشمنی نہیں لیکن یہ بات ہم اپنے بندوں اور بیٹوں کو نہیں سمجھا سکتے...... نہ ہی ان کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے...... وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھانے کے لیے بے قرار ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے اسے ان کے چنگل سے نکال کر لائے ہیں اور اسے تمہاری پناہ میں دیتے ہیں' اس کا ہر طرح سے خیال رکھنا اب تمہاری ذمہ داری ہوئی۔"

نزہت بیگم نے ایک بار پھر بھرپور نظروں سے فرش پر سر جھکائے بیٹھی حجاب کو دیکھا تو اس کے پردہ تصور پر حسن آرا کے شباب کی تصویر ابھر آئی۔

کیسی حسین اور دل کش صورت پائی تھی اس نے اور قدرت نے جسمانی حسن کے معاملے میں بھی اسے ایسے

بھرپور انداز سے نوازا تھا کہ نظر اٹھے اور پتھرا جائے۔ محض چند ثانیوں میں نزہت بیگم کی جہاں دیدہ نگاہوں نے ناپ تول کرلیا کہ اس ابتر حلیے میں بھی یہ لڑکی کیچڑ میں کنول اور گدڑی میں لعل کی طرح دکھائی پڑ رہی ہے تو ایک ذرا بناؤ سنگھار کے بعد تو یہ پورے بازار کو جلا کر راکھ کردے گی۔

نزہت بیگم کچھ بولنے والی تھی کہ ٹھیک اسی لمحے عشرت جہاں ہاتھوں میں ایک طشت اٹھائے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں نزہت بیگم صرف کام کی بات..... بس۔''

چوہدری اکبر کے کھردرے اور روکھے انداز پر نزہت بیگم نے فوراً اٹھ کر طشت عشرت جہاں کے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''جاگیردار صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہماری کیا مجال کہ سرتابی کریں۔ چاہے جیسی بھی آفت آپڑے آپ کا فرمان نظرانداز کرنے کی جسارت نہیں کریں گے۔'' نزہت بیگم نے طشت چوہدری اکبر علی کے سامنے میز پر رکھ دیا' جس میں شربت اور شراب دونوں لوازمات سجے ہوئے تھے۔

''اسے اندر پہنچاؤ کہیں۔''

چوہدری کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔ نزہت بیگم نے فوراً عشرت جہاں کو مخاطب کیا۔

''عشرت! بٹیارانی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ یہ ہماری مہمان ہے۔''

عشرت جہاں نزہت بیگم کا اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً حجاب کی طرف بڑھ گئی۔

''آؤ بیٹی! میرے ساتھ آؤ۔'' عشرت جہاں نے محبت بھرے انداز میں کہتے ہوئے نرمی سے حجاب کا بازو تھاما تو وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ابھی ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ چوہدری اکبر کی پھنکار اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''لڑکیے! اتنی بات اپنے مغز میں بٹھائے رکھنا کہ جب تک تو اس چار دیواری میں ہے فرزند علی سے محفوظ ہے۔ یہاں سے باہر نکلی تو.....''

چوہدری نے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے عشرت جہاں کو جانے کا اشارہ کیا اور عشرت جہاں حجاب کو ساتھ لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اتنی دیر میں نزہت بیگم شراب کا گلاس تیار کرچکی تھی۔ عشرت جب حجاب کو لے کر جاچکی تو نزہت بیگم شراب کا گلاس چوہدری کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''جاگیردار صاحب! ہیرا تو بالکل بے داغ اور سچل ہے لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''وہ..... میرا مطلب ہے کہ..... اس کے پیچھے آنے والا تو کوئی نہیں ہے نا؟''

چوہدری چند لمحے نزہت بیگم کو گھورتا رہا پھر ایک نظر اس نے اپنے کارندوں کی طرف دیکھا تو وہ دونوں فوراً بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ چوہدری نے گلاس نزہت بیگم کے ہاتھوں سے لے لیا۔

''تمہارے سامنے چوہدری اکبر علی خان بیٹھا ہے نزہت بیگم' یوں سمجھ لو کہ اس چھوکری کے سارے والی وارث مرکھپ چکے اور جو کوئی ایک آدھ باقی ہو وہ بھی آج کل ہی کا مہمان ہے۔ اس کے پیچھے اگر کوئی آئے گا تو صرف جاگیردار اکبر علی خان آئے گا اور تم ایک بات اچھی طرح یاد رکھنا کہ یہ لڑکی ہماری امانت ہے۔ اسے امانت ہی رہنا چاہیے۔'' چوہدری نے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

نزہت بیگم کچھ ہی دیر میں حجاب کے حوالے سے لمبے چوڑے خواب دیکھ چکی تھی مگر چوہدری کے آخری جملے پر اس کے خواب بجھ سے گئے۔

''امانت!''

نزہت بیگم کے انداز میں سوال نہیں قدرے الجھن تھی۔

''ہاں امانت..... اس ہیرے کی تراش خراش کرو..... کچھ تربیت دو اسے' مرد کو خوش کرنے کے طور طریقے اور ادب آداب سکھاؤ..... ناچ گانا سکھاؤ' بالکل سدھائے ہوئے جانور کی طرح تیار کردو اسے۔''

''اور اس سب کے بعد؟''

''بعد کی بعد میں سہی' تم چاہو تو اسے محفل میں لے جاؤ' نچاؤ اسے' کماؤ مگر کسی آدمی کا سایہ اس پر نہ پڑے.....

بس۔''

چوہدری نے ایک گھونٹ اور لیا اور مزید بولا۔

''تمہیں تمہاری محنت کا معاوضہ بھی ملے گا اور اگر تم نے ہماری خواہش کے مطابق اس چھوکری کی تربیت وتیاری کروادی تو معاوضہ تمہاری توقع سے بھی زیادہ ہوگا۔ ہم تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر دے دیں گے۔''

نزہت بیگم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''میں جانتی ہوں جاگیردار صاحب! آپ کی دریا دلی اور سخاوت سے میں کوئی ناواقف تو نہیں ہوں۔''

''ماڈل ٹاؤن میں ہماری تین کنال کی ایک کوٹھی ہے وہ ہم تمہیں انعام میں دیں گے مگر شرط یہ ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں سب ویسے ہی ہو۔''

''ماڈل ٹاؤن میں کوٹھی!'' نزہت بیگم کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ تو گزشتہ کئی سالوں سے ماڈل ٹاؤن میں شفٹ ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی کئی ایک جاننے والیاں تو پہلے ہی بازار سے شہر کے پوش علاقوں میں منتقل ہوچکی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے دھندے کے انداز بھی بدل لیے تھے جو کہ تبدیل ہوتے وقت کا تقاضہ بھی تھا۔ بازار' کوٹھے اور بالاخانوں کی اب وہ بات' وہ روایات نہیں رہی تھیں۔

''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں جاگیردار صاحب! میں یہ ذمہ داری یہ خوشی قبول کرتی ہوں اور وعدہ رہا کہ آپ کی خواہش اور توقع سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے اس لڑکی کو سدھادوں گی' آنکھ کے اشارے اور موڈ مزاج کے مطابق نہ چلے تو میرا نام بھی نزہت بیگم نہیں۔ اس ہیرے کی ایسی تراش خراش کروں گی کہ انمول نگینہ بنادوں گی اسے۔ آپ اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

نزہت بیگم نے طشت میں رکھے چھوٹے سے پاندان میں سے فوراً ایک گلوری نکال کر منہ میں ڈال لی۔ چوہدری اکبر علی نے گلاس خالی کرتے ہوئے میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''جاگیردار صاحب! اب آئے ہی ہیں تو کچھ دیر قیام تو کیجیے' کچھ خاطر مدارت کا موقع تو دیجیے ہمیں۔''

''موقع تو ہم تمہارے حوالے کرکے جارہے ہیں نزہت بیگم تمہاری خاطر مدارت بھی دیکھ لیں گے۔ تم بھی وقت ضائع مت کرنا ہم بھی جلد آئیں گے۔''

چوہدری پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر پھر دروازے پر پہنچ کر رک گیا..... اس کے پیچھے چلتی ہوئی نزہت بیگم بھی ٹھٹک گئی۔

چوہدری کے ذہن میں اچانک کوئی خیال آیا تھا۔ وہ آہستہ سے نزہت بیگم کی طرف پلٹا..... اس کی مکار آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں اٹھیں۔

''کہیے حضور! کیا یاد آ گیا؟''

نزہت بیگم نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا تو چوہدری پرخیال انداز میں گویا ہوا۔

''یہاں ایک شاہونا می نوجوان ہوا کرتا تھا؟''

نزہت بیگم کی مسکراہٹ فوراً ہی ماند پڑ گئی۔

''یعنی آپ اسے بھولے نہیں۔''

''ہمیں..... ویسے بھی پچھلے کچ عرصے سے اس کے کافی قصے ہمارے کانوں تک پہنچے ہیں۔ سنا ہے خاصی توپ چیز بن چکا ہے۔ یہاں کے تقریباً سبھی بدمعاش اچکے اسے اپنا مرشد ماننے لگے ہیں۔''

''جی! درست سنا ہے آپ نے' ایسا ہی ہے۔''

''تو..... پھر ایسا کرو نزہت بیگم کہ اس سے ہماری ملاقات کراؤ۔''

''مرشد سے!'' نزہت بیگم کے چہرے سے مسکراہٹ بالکل غائب ہوگئی۔

''ہاں! مرشد سے، ابھی۔''

چند ثانیے کے لیے نزہت بیگم متفکر اور متذبذب سی دکھائی دی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل گئی۔

''ٹھیک ہے آپ تشریف رکھیے میں ابھی پتا کراتی ہوں اس کا۔''

چوہدری اکبر علی دوبارہ صوفے کی طرف بڑھ گیا اور نزہت بیگم کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

☆

''مرشد.....!''

طبلے پر شام کی پہلی تھاپ پڑی تھی۔

''ارے او مرشد!''

نزہت جہاں بیگم نے ہال کی طرف بڑھتے ہوئے

ایک بار پھر پکارا اور شگفتہ بانو پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئی۔ شگفتہ کھڑکی میں کھڑی ہونٹوں پر آتشیں سرخی کی تہہ جمانے میں مگن تھی۔

''اے شگفتہ! مرشد کی کوئی خبر ہے کیا؟''

نزہت بیگم نے ایک ناقدانہ نظر اس کے چیختے چنگاڑتے بدن پر ڈالتے ہوئے بے چین سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''پتا نہیں ادھر آیا بھی ہے کہ نہیں۔'' اس نے آئینے میں ایک ذرا اپنے لہو رنگ ہونٹوں کا جائزہ لیا۔ ''آیا ہے تو ادھر..... اپنی ماتا جی کے گھٹنے سے لگا بیٹھا ہوگا۔''

''وہاں تو میں دیکھ کر آرہی ہوں' ادھر نہیں ہے..... ایک تو ان نواب صاحب کا کچھ پتا نہیں چلتا۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی ہال میں چلی آئی۔

حسب معمول چاندنی بچھائی جاچکی تھی۔ گدیلے اور تکیے بھی لگادیئے گئے تھے۔ اچھے تکیوں کے ساتھ ساتھ چمچماتے ہوئے اگالدان سجا رہا تھا۔ ایک طرف سازندے اپنے مخصوص آلات ترتیب دینے میں مصروف تھے لیکن نزہت بیگم کو اس وقت جس سے غرض تھی وہ یہاں بھی موجود نہیں تھا۔

''اے اچھو! مرشد کو دیکھا ہے تو نے؟'' نزہت بیگم نے اچھو کو مخاطب کیا۔

''ہاں جی..... روز ہی دیکھتا ہوں۔''

وہ جیسے بائی جی کے سوال پر متعجب ہوا تھا۔

''گھوڑے کی شکل والے ابھی کہیں دیکھا ہے کیا؟''

''ابھی.....'' اچھو نے گردن گھما کر پورے ہال میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ ''نہیں .....ادھر تو نہیں آیا وہ۔''

''تو جا کے دیکھ مرا سے کدھر ہے وہ' اور جلدی سے بلا کر لا۔'' نزہت بیگم نے ہونٹوں کے کناروں سے بہہ آنے والی پان کی پیک انگلی سے صاف کرتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔

''ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے اسے اوپری زینوں کی طرف جاتے دیکھا تھا' مغرب کا وقت ہے نا..... میرا خیال ہے اوپر چھت پر نماز پڑھ رہا ہوگا۔''

استاد مبارک علی خان کی بات سن کر اچھو بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ باقی سازندے بھی نزہت بیگم کی طرف دیکھنے لگے جو خاصی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحے متذبذب سی کھڑی رہنے کے بعد وہ استاد مبارک علی خان سے مخاطب ہوئی۔

''استاد جی! آپ خود ہی ذرا جا کر دیکھیں اور جیسے ہی وہ نماز سے فارغ ہو اسے فوراً مہمان خانے میں بھیج دیں۔'' وہ ایک ذرا توقف سے پھر بولی۔

''اسے کہیے گا کہ اس کے مہمان آئے بیٹھے ہیں اور اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔''

استاد جی ہارمونیم ایک طرف کھسکاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے تو نزہت بیگم واپس مہمان خانے کی طرف پلٹ گئی۔ جہاں صرف اہم اور خاص شخصیات ہی کو بٹھایا' ٹھہرایا جاتا تھا۔ ان کی خدمت خاطر کی جاتی تھی۔

دلدار چن نے پھر سے طبلہ تھپکا تھا۔

''سر تھوڑا اور اٹھاؤ چن۔''

استاد جی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو دلدار چن طبلے کی کلوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

استاد جی ہال سے نکل کر برآمدے میں آئے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ شام کا ملگجا سا اندھیرا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ استاد جی زینے طے کرتے ہوئے چوتھی منزل کی چھت پر پہنچ گئے..... توقع کے عین مطابق مرشد چھت پر موجود تھا۔ وہیں..... اپنی پرانی جگہ پر۔ محلے بھر میں یہی چھت تھی جو باقی سب چھتوں سے بلند تھی اور اسی بلندی کی وجہ سے یہ جگہ مرشد کو بہت پسند تھی۔ یہاں سے نگاہ دور تک سفر کرتی تھی۔ چاروں طرف دور..... دور تک روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بادشاہی مسجد' شاہی قلعہ' مینار پاکستان' نیچے..... محلے اور شاہی مسجد کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک پر سے آتی جاتی گاڑیوں کے ہارنز کی مدھم آوازیں اور یہاں چھت پر اپنے اردگرد مکمل تنہائی' خاموشی اور سکون..... بچپن اور نوجوانی میں تو اس کا معمول تھا کہ وہ مغرب کی نماز یہیں آکر پڑھتا تھا اور پھر کافی کافی دیر تک یہیں بیٹھا رہتا تھا..... اب چند سال ہوئے تھے کہ یہ اس کا معمول نہیں رہا تھا البتہ اب بھی وہ کبھی کبھی نماز

مغرب کے بعد گھنٹوں یہاں بیٹھتا تھا۔

استاد جی نے دیکھا کہ وہ نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ عادت کے مطابق بادشاہی مسجد کی طرف منہ کیے یونہی مصلے پر بیٹھا ہے۔ اس کے جسم پر سفید لٹھے کی شلوار قمیص تھی اور سر پر سیاہ رومال..... استاد جی کی طرف اس کی پشت تھی اور آنکھیں بادشاہی مسجد کے ایک مینار کی روشنیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کا ارتکاز استاد جی کی آواز پر بکھرا۔

''مرشد بیٹا!''

اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ استاد جی کب اس کے عقب میں پہنچے ہیں۔

''نزہت بیگم تمہیں پوچھ رہی تھیں۔ بتا رہی تھی کہ تمہارے کوئی مہمان نیچے مہمان خانے میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''میرے مہمان..... یہاں!''

مرشد نے گردن قدرے پھیری مگر استاد جی کی طرف دیکھا نہیں۔

''کیا نام ہے مہمانوں کا؟''

''نام کا ذکر تو اس نے نہیں کیا۔''

''کدھر سے ٹپکے ہیں؟''

''یہ بھی نہیں بتایا..... بس کہا کہ بیٹھے انتظار کر رہے ہیں اور میں تمہیں بتا دوں۔''

''ٹھیک ہے' ملتا ہوں میں۔''

مرشد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا تو استاد جی' بہتر ہے' کہہ کر واپس پلٹ گئے۔

☆

اونچا لمبا قد' چوڑے شانے' اٹھی ہوئی چھاتی اور مضبوط ہڈ پیر دیکھ کر فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ بندہ باقاعدگی سے کسرت کرتا ہوگا' چہرے کی سرخی میں جوان اور صحت مند خون کی حدت دکھائی پڑتی تھی۔ سر پر گھنے سیاہ بال تو چہرے پر گھنی سیاہ بھاری اور بدمعاش مونچھیں۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی چوہدری اکبر نے سر تا پا بغور اس کا جائزہ لیا..... مگر مرشد نے اس پر صرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور نزہت بیگم سے مخاطب ہوا۔

''ہاں مائی! کون ہے' کدھر ہے؟''

''آؤ مرشد..... ان سے ملو' یہ ہیں نندی پور کے جاگیردار اکبر علی خان صاحب۔ ہمارے پرانے کرم فرما ہیں' کافی عرصے کے بعد تشریف لائے ہیں۔''

نزہت بیگم فوراً موڑھے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جاگیردار اکبر علی خان!'' مرشد نے دوبارہ چوہدری کی طرف دیکھا' جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر چوڑا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور نظریں مرشد کے چہرے پر۔

''تو یہ تو تمہارے مہمان ہوئے نا مائی! مجھے بلوا کیوں بھیجا؟''

مرشد چوہدری کے سامنے پڑی میز کے اس طرف موجود صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے ہی میز پر منقش طشت رکھا تھا جس میں پینے پلانے کا سامان موجود تھا۔ مرشد نے ہاتھ بڑھا کر طشت اپنے سامنے کھسکا لیا۔

''جاگیردار صاحب ہمارے یہاں آئے ہیں تو یہ ہمارے مہمان ہیں۔'' نزہت بیگم نے ''ہمارے'' پر زور دے کر کہا مرشد شراب کی بوتل اور گلاس کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔

''پہلے جب یہ تشریف لایا کرتے تھے تب تم کافی چھوٹے تھے۔ اب اتنے برس بعد آئے ہیں تو تمہارا بھی خیال آ گیا انہیں' یاد کر رہے تھے تمہیں۔''

''اچھا.....'' مرشد نے ایک نظر دوبارہ موڑھے پر بیٹھتی نزہت بیگم پر ڈالی اور شراب کا بھرا گلاس اٹھاتے ہوئے صوفے سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔

''کہیے جاگیردار صاحب! کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

اس نے چوہدری اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے گلاس منہ سے لگا لیا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے نزہت بیگم بتا رہی تھی کہ تم چھت پر نماز شماز پڑھ رہے ہو۔''

''شماز نہیں صرف نماز پڑھ رہا تھا۔''

''ہاں وہی۔''

''تو.....؟''

''تو یہ کہ ابھی نماز پڑھ کر آئے ہو اور..... آتے ہی شراب شروع۔''

مرشد کی گھنی اور بھاری مونچھوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ چوہدری اکبر کی طرف دیکھ کر گویا ہوا۔

یقین اپنی جگہ ہے..... سراب اپنی جگہ
نماز اپنی جگہ ہے..... شراب اپنی جگہ

''زندگی ہے جاگیردار صاحب! سارے رنگ اور سارے ذائقے ضروری ہیں' زندگی کا حصہ ہیں..... انسان کو تھوڑا سا انسان بھی رہنا چاہیے' بالکل فرشتہ بن جانا بھی وارے نہیں آتا نا' کیا کریں۔''

''بات تو چٹکی بھر کی ہے تم نے۔''

چوہدری اکبر کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''ہم بھی کچھ ایسے ہی خیال رکھتے ہیں۔ زندگی کو ایسے ہی گزارنا چاہیے ورنہ یہ بندے کے لیے صرف ایک وخت (مصیبت) بن کر رہ جاتی ہے۔ ویسے ہم پہلے سے بھی تمہارے بارے میں کچھ تھوڑی بہت جان کاری رکھتے ہیں۔ تمہارے چند ایک پھڈوں کے علاوہ تمہاری عادتوں اور اصولوں کے بارے میں بھی سنا ہے۔ لہور کے بدمعاشوں میں اپنا سکہ منوالیا ہے تم نے' ہے نا؟''

''پرانی باتیں ہیں۔''

بے پرواہی مرشد کا انداز تھی۔ اس نے ایک اور بڑا سا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا۔

''لے مائی! ایک اپنے ہاتھ کا پٹیالہ دے۔''

اس نے گلاس نزہت بیگم کی طرف بڑھایا تو نزہت بیگم نے اسے گھورتے ہوئے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''آپ ان باتوں کو چھوڑیے جاگیردار صاحب! یہ کہیے کہ مرشد کی یاد کیوں آئی آپ کو' کوئی کام وام ہے تو کہیے؟''

مرشد نے دونوں بازو دائیں بائیں صوفے کی پشت پر پھیلا دیئے۔

''کام تھا تو نہیں مگر تمہاری یاد آئی تو دماغ میں ایک یال آ گیا تھا۔''

''مثلاً؟''

''پہلے تو یہ بتاؤ مرشد کہ اگر ہم تمہارے ذمے کوئی کام ئیں تو تم سے کیا توقع رکھیں..... ذمہ داری سے اسکو گے؟''

''توقع لگانے سے پہلے تو آپ کے لیے یہ جاننا زیادہ وری ہے کہ مرشد کوئی ذمہ داری قبول کرتا بھی ہے یا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

چوہدری اکبر نے بھویں اچکا کر مرشد کی طرف دیکھا۔ نزہت بیگم شراب کا گلاس تیار کر چکی تھی۔ مرشد نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''پہلے آپ معاملہ بتائیں' اس کے بعد ہی میں کہہ سکوں گا کہ مجھے کوئی ذمہ داری قبول کرنی ہے یا نہیں۔''

مرشد کے جواب اور انداز پر چوہدری اکبر کچھ دیر کے لیے مرشد کو صرف جانچتی تولتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''معاملہ ایک لڑکی کا ہے..... ہم اسی.....''

''نہ جاگیردار صاحب! میری طرف سے معذرت ہے۔'' مرشد نے چوہدری اکبر کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔

''زنانہ معاملات میں نہیں پڑتا میں..... اس طرح کے کام میرے بس کے نہیں ہیں۔ ویسے بھی ان مونچھوں کے ساتھ (مرشد نے انگلی کی پشت سے مونچھوں کو تھوڑا اٹھایا) کسی زنانہ پھڈے فساد میں ٹانگ اڑانا میری نظر میں کچھ جچتا نہیں ہے۔''

''پھڈے..... فساد تو مردانہ ہی ہوتے ہیں مرشد باؤ! بس درمیان میں یہ زنانی' کڑی آ گئی۔''

''جہاں کوئی زنانی یا کڑی آ جائے وہاں مرد کو رک جانا چاہیے' پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔'' مرشد نے ایک بار پھر چوہدری اکبر کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی تھی۔

''اپنا ماننا تو یہی ہے جی اور مرد کی شان بھی اسی میں ہے۔ ابھی اجازت چاہوں گا۔'' مرشد نے گلاس خالی کرتے ہوئے میز کے کونے پر دھرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کبھی کوئی مردانہ کام ہو تو بے دھڑک مرشد کو یاد کر لیجیے گا۔''

اس کے بعد مرشد وہاں رکا نہیں ..... وہ چلا گیا مگر چوہدری اکبر کی سرخ آنکھیں دروازے پر ٹکی رہیں۔ مرشد کی چند باتیں اور انداز چوہدری اکبر کو بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال میں مرشد اپنے متعلق کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار تھا مگر فی الوقت چوہدری نے مناسب سمجھا تھا کہ کوئی اور بکھیڑا نہ کھڑا کیا جائے۔

چار آدمی مرغا بنے کرلا رہے تھے۔ چاروں زخمی تھے۔ ان میں سے ایک زیادہ زخمی تھا۔ اس کے سر' ناک اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا' ان کے سامنے ایک مکان کا کشادہ دروازہ تھا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا اور دروازے کے سامنے سرکنڈے کی پشت والے موڑھے پر مرشد مطمئن سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اس کی نوروزی جوتی کا ایک پاؤں اس کے یار ساون کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا مراد کے اور وہ دونوں وقفے وقفے سے مرشد کے سامنے گلی میں مرغا بنے ان چار افراد کی تشریفات کی خبر گیری کررہے تھے۔

آس پڑوس کے کوٹھوں کی کھڑکیوں سے عورتیں لڑکیاں جھانک رہی تھیں۔ اشارے کررہی تھیں اور ہنس رہی تھیں' گلی میں بھی کافی لوگ جمع ہوچکے تھے۔ راہ گزرتے دو تین بیجڑے باقاعدہ وہاں ناچنے لگے تھے۔ اچھا خاصا تماشہ لگا ہوا تھا۔ وہ چاروں معافیاں مانگ رہے تھے۔ منت سماجت کررہے تھے مگر مرشد کے تیور انہیں معاف کرنے کے ہرگز نہیں تھے۔ اس کے سفید کرتے پر داغ تھے اور گریبان بھی تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا۔

اصل میں تو وہ پانچ بندے تھے۔ پانچویں ہی نشے میں دھت ادھر ادھر بے وجہ چھیڑ خانیاں اور بدتمیزیاں کرتے پھر رہے تھے۔ منع کرنے پر انہوں نے ایک دو افراد کو زدوکوب کیا اور ایک رقاصہ کو بھی تھپڑ شپڑ مارے تھے۔ ایک بندے کا سر بھی پھاڑ دیا تھا اور جس کا سر پھٹا تھا وہ مرشد کے چیلوں میں سے تھا اور اس وقت اندر اس کے سر کی مرہم پٹی کی جارہی تھی۔ اسی کی وجہ سے مرشد نے باہر آکر ان کا سامنا کیا تھا مگر ایک تو شراب' اور دوسرا ناواقفیت..... ان کے سرغنہ نے مرشد کو گریبان سے دبوچ لیا تھا۔ وہ لاہور شہر کا نہیں تھا۔ مرشد کو جانتا پہچانتا نہیں تھا کچھ اسے اپنے بڑے بھائی کالے خان کے بدمعاش ہونے کا زعم تھا مگر یہ زعم اسے بہت مہنگا پڑا اور اب وہ یوں سرعام ذلت اور بے چارگی کی تصویر بنا دہائیاں دے رہا تھا مگر مرشد پر ان چاروں کی داد و فریاد کا چنداں اثر نہ تھا۔ وہ چار وہاں مرغا بنے کھڑے تھے اور ان کے پانچویں ساتھی کو اچھی خاصی چھترول کے بعد مرشد نے بھیجا تھا کہ جا اور جا کر اپنے کالے خان کو بلا کر لا..... یا تو وہ یہاں سب کے سامنے تمہاری طرف سے معافی مانگتے ہوئے یہ معاہدہ کرکے جائے گا کہ آئندہ تم میں سے کوئی ادھر کا منہ نہیں کرے گا یا پھر آج فیصلہ ہو کر رہے گا کہ لاہور شہر میں تم لوگ رہتے ہو یا مرشد..... ساتھ ہی اس نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ جب تک کالے خان خود نہیں آجاتا یہ لوگ یہاں یونہی مرغا بنے رہیں گے اور یونہی ان کی سیوا خاطر جاری رہے گی۔

شاید یہ معاملہ طول پکڑ جاتا اگر استاد مبارک علی وہاں نہ پہنچ جاتے..... ان کے پیچھے پیچھے ٹڈا اچھو بھی پھدکتا آرہا تھا مگر وہ چند قدم پیچھے ہی رک گیا اور استاد جی مرشد کے قریب چلے آئے۔

''مرشد بیٹا! حسن بیٹا تمہیں بلا رہی ہے۔''

''کیوں! اب کیا ہوا؟'' مرشد کا موڈ خراب تھا۔

''اسے تمہارے اس جھگڑے کی خبر ملی ہے اور اس نے کہا ہے کہ جہاں اور جس حال میں ہو' فوراً اٹھ کر چلے آؤ۔''

استاد جی کی بات پر مرشد بس خاموشی سے انہیں گھورتا رہ گیا' ایک نظر اس نے اچھو کو بھی دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے' آپ چلیں میں بھی آرہا ہوں۔''

ساون اور مراد نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے جوتے مرشد کے سامنے ڈال دیئے۔

''کھڑے ہوجاؤ بھئی؟''

مرشد نے جوتوں میں پیر پھنساتے ہوئے کہا تو چاروں مرغے کراہیں بھرتے ہوئے آہستہ آہستہ سیدھے کھڑے ہوگئے۔

''آپ ابھی تک کھڑے ہو!'' استاد جی کو وہیں کھڑے دیکھ کر مرشد نے ناگواری سے کہا تو وہ فوراً واپس پلٹ گئے۔

مرشد ان چاروں کے سامنے آکھڑا ہوا..... ان بے چاروں کی حالت بڑی خراب تھی۔ چہرے سرخ انار اور سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور' سارے نشے کب کے ہرن ہوچکے تھے۔

''چل میرے گریبان پر ہاتھ ڈال۔''

مرشد نے اس باریک مونچھوں اور چھوٹی آنکھوں والے کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا جس نے جھگڑے کے

شروع میں مرشد کے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا اور جو کالے خان کا چھوٹا بھائی تھا۔

''میں نے کچھ کہا ہے تم سے؟''

چند لمحوں کے توقف کے بعد مرشد نے اسے دوبارہ مخاطب کیا مگر وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا جب کہ باقی تینوں نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''سنا نہیں تم نے؟''

مرشد کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ در آئی' اس شخص نے ایک نظر مرشد کی طرف دیکھا پھر دزدیدہ نظروں سے اپنے اردگرد موجود جمگھٹے کو دیکھتے ہوئے دوبارہ نظریں نیچی کرلیں۔

مرشد نے اچانک بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا دایاں ہاتھ کلائی کے قریب سے پکڑ کر تھوڑا اوپر اٹھایا اور دائیں ہتھیلی کو نیچے سے اس کی کہنی پر مارا ''کڑک'' کی آواز ابھری اور اس شخص کے حلق سے کرب ناک چیخ نکل گئی۔ اس کی کہنی کا جوڑ کھل چکا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی تھامتا' ڈکراتا ہوا وہیں گھٹنوں کے بل مرشد کے سامنے گر پڑا۔

''ان چاروں کو اندر کنکان کے ساتھ بٹھاؤ..... میں واپس آ کر ان کی خبر لیتا ہوں۔'' مرشد نے ساون اور مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جدھر استاد جی گئے تھے ادھر کو بڑھ گیا۔ باقی تینوں مرشد کو دہائیاں دینے لگے مگر مرشد نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اور سیدھا حسن آرا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

حسن آرا ہمیشہ کی طرح تھکی ہوئی سی اپنے پلنگ پر دراز خالی خالی نظروں سے چھت کی سیاہ کڑیوں کو تک رہی تھی۔ کمرے کے دروازے پر آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ آنے والا مرشد تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' سفید کرتا داغ دار تھا اور گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔

''پھر سے جھگڑا کیا تم نے؟'' وہ تکیے کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھی..... مرشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے پلنگ کے سرہانے دیوار میں بنی الماری کی طرف بڑھ گیا۔

''کیوں کرتے ہو یہ سب..... کیا ملتا ہے تمہیں ان جھگڑوں سے..... پتا ہے سب کتنے پریشان رہتے ہیں تمہارے لیے۔''

مرشد خاموش رہا' اس نے الماری سے کچھ دوائیں نکالیں' تپائی سے جگ اٹھا کر پانی کا گلاس بھرا اور حسن آرا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

حسن آرا چند لمحے اسے گھورتی رہی اور وہ خاموشی سے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کیے کھڑا رہا پھر حسن آرا نے دوائیاں اس کے ہاتھ سے لیں اور منہ میں ڈال لیں..... جانتی تھی کہ اب جب تک وہ یہ گولیاں وغیرہ کھا نہیں لے گی مرشد ہونٹ سیئے یونہی کھڑا رہے گا..... اس نے اپنے ہاتھوں سے حسن آرا کو چند گھونٹ پانی پلایا اور پھر ایک شیشی سے دو چمچ سیرپ کے حسن آرا کے منہ میں ڈالے اور آگے بڑھ کر شیشی دوبارہ الماری میں رکھ دی۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہ سب چھوڑ دو..... یہاں سے چلے جاؤ..... کسی دور دراز جگہ پر جا کر نئی زندگی شروع کرو..... اچھے طریقے سے زندگی گزارو' مگر تمہیں اثر نہیں ہوتا۔ کیوں نہیں ہوتا..... کیوں میری بات نہیں مانتے تم؟''

''کوئی نیا سوال ہے آپ کے پاس؟''

مرشد نے جیسے خود کلامی کی تھی۔ وہ پلنگ سے ٹیک لگا کر نیچے قالین ہی پر بیٹھ گیا۔

''نہیں۔''

''کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر بلایا کیوں ہے؟''

''تمہیں تو جیسے معلوم نہیں' کیا تماشہ لگا رکھا تھا گلی میں' کیوں مارا پیٹی کر رہے تھے؟''

''یونہی..... شوقیہ۔''

''اس طرح کے فضول شوق چھوڑ نہیں سکتے تم..... آخر کیا حاصل ہوتا ہے اس سب سے تمہیں۔ کیوں ہر کسی سے جھگڑتے پھرتے ہو؟''

''آپ کو تو جیسے معلوم نہیں۔'' مرشد نے اسی کے انداز میں کہا۔

''ویسے بھی آپ چاہتی کب ہیں کہ میں یہ فضول شوق

چھوڑ دوں۔''

''میں تو تمہیں منع کر کر کے تھک گئی ہوں۔ جانتی ہوں کہ تم نے میری بات نہیں ماننی' اسی لیے اب کہنا ہی چھوڑ دیا ہے مگر جو میرے کلیجے پر گزرتی ہے وہ بس میں ہی جانتی ہوں۔''

''کیوں گزرتی ہے آپ کے کلیجے پر..... کیوں بے وجہ پریشان ہوتی ہیں۔''

''ماں ہوں تمہاری۔''

''آدھی ماں .....آدھی ماں اور آدھی باجی..... باجی امی!''

''مرشد!''

حسن آرا نے قلق انگیز لہجے میں جیسے اس کا نام نہیں لیا تھا بلکہ اسے ٹوکا تھا۔

''جی' باجی امی۔''

''مت کہا کرو مجھے باجی امی' میں تمہاری باجی نہیں صرف امی ہوں۔ صرف ماں ہوں۔ تم مجھے صرف امی کہا کرو۔'' حسن آرا کی آواز بھیگ گئی۔

''ٹھیک ہے..... آپ جو کہتی ہیں وہی کہوں گا جیسے کہیں گی ویسے ہی پکاروں گا' لڑائی جھگڑے بھی چھوڑ دوں گا' جہاں کہیں گی وہیں جا کر رہوں گا' جیسے کہیں گی ویسے رہوں گا' بس ایک بات میری بھی مان لیں آپ..... صرف ایک بات..... میں آپ کی ہر بات پر بلا چوں چراں کیے عمل کرتا جاؤں گا جو آپ کہیں گی..... بس صرف ایک بات میری مان لیں' صرف ایک بات۔''

مرشد نے رخ بدلتے ہوئے پہلے حسن آرا کے پاؤں تھامے پھر اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کے ملتجی لہجے پر حسن آرا کا دل تڑپ اٹھا تھا مگر وہ منہ سے ایک لفظ نہ کہہ سکی' بلکہ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے' وہ جانتی تھی کہ مرشد کیا چاہتا ہے' کیا مانگ رہا ہے' کونسی ایک بات ہے جو وہ منوانا چاہتا ہے' گزشتہ کئی سال سے وہ یہی ایک بات تو کہتا آ رہا تھا' مگر وہ نہیں جانتا تھا' نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جو بات وہ منوانا چاہتا ہے' وہ جائز سہی' قابل عمل سہی مگر اس پر عمل کر پانا حسن آرا کے بس کی بات ہی نہیں' حسن آرا کے لیے تو ویسا سوچنا بھی ممکن نہیں تھا' عمل کر پانا تو پھر دور کی بات تھی۔

مرشد اس کے پیروں پر سر رکھے بیٹھا رہا اور حسن آرا پتھر کا بت بنی نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے' پھر خود بخود جیسے مرشد اپنی باجی امی کا جواب جان گیا۔ کئی سالوں سے تو اس ضد بحث کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر حسن آرا کی طرف دیکھا پھر اٹھا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کا ارادہ اپنی بیٹھک پر پہنچ کر کالے خان کے گرگوں کی مزید چھترول کے ذریعے اپنے سینے کی بھڑاس نکالنے کا تھا مگر ڈیوڑھی میں ٹڈے اچھو سے اس کا سامنا ہو گیا..... اچھو کے ہاتھ میں آٹھ دس رسالے دبے ہوئے تھے۔

''یہاں شکایت کس نے پہنچائی تھی؟''

مرشد اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ..... وہ میں نہیں تھا مرشد بھائی۔''

'کون تھا؟''

مرشد نے اس کا کالر پکڑ لیا۔

''وہ..... ہا..... ہاشو خان.....'' اچھو' مرشد کے تیور دیکھ کر ہکلانے لگا تھا۔

'کدھر ہے وہ؟''

'ادھ..... ادھر پچھلی طرف باغیچے والے کمرے میں ہوگا۔ بڑی اماں نے ادھر بلایا ہے اسے۔'' مرشد نے اسے چھوڑا اور واپس پلٹ کر عقبی طرف کو چل پڑا جدھر صحن کے ایک حصے میں گیندے' گلاب اور کلیوں کے پودے لگائے گئے تھے اور کونے میں ایک کمرہ بھی تھا۔

توقع کے عین مطابق ہاشو خان کمرے میں موجود تھا مگر وہ اکیلا نہیں تھا' نزہت بیگم بھی وہاں موجود تھی۔ خالہ زاد شگفتہ اور خالہ عشرت جہاں کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کمرے میں تھی جس کی شکل وصورت مرشد کے لیے نظر آشنا نہیں تھی۔ مرشد نے کسی کی طرف بھی دھیان نہیں دیا اور نہ اس بات پر توجہ دی کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ البتہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب کا دھیان اور توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس کے اس طرح اچانک اندر آنے پر سبھی جیسے گڑبڑا گئے تھے۔

مرشد نے اندر داخل ہوتے ہی ہاشو خان کے منہ پر

ایسا زبردست طمانچہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

''مرشد..... نزہت بیگم فوراً آگے بڑھی مگر پھر ٹھٹک گئی۔ مرشد کے تاثرات خاصے خراب تھے۔

''بڑا شوق ہے تجھے جاسوس بننے کا..... چل آج تجھے مکمل جاسوس بناتا ہوں میں۔'' مرشد نے آگے بڑھ کر اسے کالر سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے آیا۔

''باوا جی! میں..... میں نے کیا کیا ہے؟''

''کیا ہوا ہے؟''

مرشد کے تاثرات دیکھ کر ہاشو کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔

''مرشد..... رک جا مرشد۔''

''کیا کیا ہے اس نے؟''

''رک.....''

نزہت بیگم' عشرت جہاں دونوں اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

ہاشو خان اپنا گریبان چھڑانے کے لیے ایک ذرا پھڑکا تو مرشد نے اسے گھما کر پہلے تو دیوار سے ٹکرایا پھر دو تین تھپڑ رسید کر دیئے۔ ہاشو خان کے حلق سے بے اختیار دھاڑیں نکل گئی تھیں۔

'مرشد! چھوڑ اسے..... چھوڑ دے میں کہتی ہوں۔''

نزہت بیگم چند قدم کے فاصلے پر کھڑی مرشد پر چلا رہی تھیں..... اس کی تو مرشد نے سنی نہیں تھی مگر ٹھیک اسی وقت برآمدے سے حسن آرا نمودار ہوئی..... اس کے عقب میں اچھو بھی تھا۔

''مرشد! کیا ہو رہا ہے یہ؟ چھوڑو اسے..... میں کہہ رہی ہوں چھوڑ دو اسے۔'' حسن آرا کی آواز پر مرشد کی وحشت کو جیسے لگام آ گئی۔ اس نے ہاشو خان کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔

''آج کے بعد اگر تو نے میری جاسوسی کی..... میرے کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو میں تیری ٹانگیں توڑ کر تیرے گلے میں لٹکا دوں گا..... یاد رکھنا میری یہ بات۔''

اس نے ہاشو خان کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر غراتے ہوئے کہا اور پھر اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

حسن آرا اچھی خاصی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مرشد نے چپ چاپ وہاں سے نکل جانا چاہا مگر حسن آرا نے گزرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''اب باہر کہیں یا بیٹھک پر جا کر کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا' بس بہت ہو گیا مزید کچھ نہیں..... اور..... وہ جو چار بندوں کو تم نے کان پکڑا رکھے تھے۔ ان کی بھی جان بخشی کرو..... میرے لیے اذیت کا سامان مت کرو۔''

مرشد نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ حسن آرا کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

کیا نہیں تھا ان آنکھوں میں..... غصہ' ناراضگی' شکایت اور بے بسی۔

حسن آرا کی گرفت اس کے بازو سے ختم ہو گئی اور مرشد تیزی سے بیرونی طرف بڑھ گیا۔

حسن آرا اس کی آنکھوں کے اس مخلوط تاثر کو سمجھتی تھی۔ یہ بھی تسلیم کرتی تھی کہ جوان جہان بیٹا اور اس کا تقاضا' دونوں اپنی جگہ درست ہیں مگر اس کی بات پر عمل کرنا اس کے بس..... اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

☆

حجاب بی بی کو یہ جاننے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ قسمت کے الٹ پھیر نے اسے کہاں لا پھینکا ہے..... یہاں پہنچنے کے کچھ ہی بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لاہور کے بدنام زمانہ بازار حسن کے ایک کوٹھے پر پہنچا دی گئی ہے۔

سب سے پہلے اس عشرت نامی عورت نے اسے اپنی بیٹی کے کپڑے نکال کر دیئے تھے جو حجاب نے غسل کر کے پہن لیے..... پہلی رات کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا مگر دوسرے روز دوپہر کے بعد نیا معاملہ شروع ہو گیا۔ پہلے نزہت جہاں اسے میٹھے میٹھے انداز میں نصیحتیں کرنے آئی' پھر عشرت اور اس کی بہن سندس جہاں نے آ کر اسے سمجھانا بجھانا شروع کیا..... اور حالات سے سمجھوتا کر لینے کی پٹیاں پڑھائیں' سندس جہاں کی دو بیٹیاں شگفتہ بانو اور شازیہ بانو بھی آ کر ویسی ہی باتیں کرتی رہیں..... عجیب سی چمک تھی سب کی نظروں میں اور ان سبھی کی نگاہیں جیسے پور پور اس کے وجود کی تلاشیاں لیتی رہی تھیں..... حجاب نہیں جانتی تھی کہ ان سب کی آنکھوں میں تین کنال کی کوٹھی بجی ہوئی

ہے۔

دوسری رات وہ رات بھر روتی رہی اور خدا کے حضور گڑگڑاتی رہی..... صبح ہوئی تو پھر سے وہی سلسلہ شروع ہوگیا..... پہلے نرمی' محبت اور پیار سے اسے پیروں میں گھنگھرو پہن لینے کے لیے کہا جاتا رہا مگر اس کے مسلسل انکار پر ان عورتوں کے لہجے اور انداز سے وہ نرمی اور محبت یوں غائب ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ اسے ڈرانے دھمکانے پر اتر آئیں۔

تیسرے روز سہ پہر کا وقت رہا ہوگا کہ باہر سے دروازے کی زنجیر ہٹنے کی آواز آئی' دروازہ کھلا اور نزہت بیگم اور عشرت جہاں اندر داخل ہوئیں۔

''کیوں ری چھوری! کیا سوچا پھر تو نے' کیا فیصلہ کیا؟''

بھدے جسم والی مکروہ صورت نزہت بیگم نے اندر داخل ہوتے ہی تیوریاں چڑھا کر اس سے پوچھا تھا۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے۔''

حجاب نے سر جھکائے جھکائے کہا' وہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔

''کس ماں کے پاس جانا ہے یہ بھی بتا دے تو میں تانگہ منگا دوں تجھے۔''

''کہیں بھی چلی جاؤں گی' بس آپ لوگ مجھے ادھر سے باہر جانے دیں۔''

''تو پہلے ہی کہیں اور دفع ہو جاتی..... ادھر آئی کاہے کو تھی۔''

دونوں ہی اندر آ کر دوسری دیوار کے ساتھ بچھی مسہری پر بیٹھ گئیں۔

''میں خود سے تو نہیں آئی وہ..... وہ چوہدری مجھے زبردستی یہاں.....''

''دیکھ لڑکی! تو اچھی طرح جانتی سمجھتی ہے کہ تیری مرضی کی اب کوئی اہمیت نہیں' نہ تو تو یہاں اپنی مرضی سے آئی ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے یہاں سے جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہاں خیریت سے رہنا چاہتی ہے تو تجھے یہیں کے طور طریقوں کے مطابق جینا ہے' ہماری مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے' بہتر تو یہی ہے کہ تو خود ہی یہ سب جان سمجھ لے' دوسری صورت میں تیرے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کا اندازہ تیرے فرشتے بھی نہیں کر سکتے..... سمجھی تو؟''

یہ عشرت جہاں تھی..... پھر اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا کچھ بولتا دروازے سے دو حواس باختہ صورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ایک تو عشرت کا بیٹا ٹڈا اچھو تھا اور دوسری سندس جہاں کی بیٹی شگفتہ بانو.....

''اماں! وہ مرشد..... ہاشو۔''

شگفتہ بانو نے گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ کہنا چاہا تھا۔

''کیا؟''

''وہ مرشد کا جھگڑا ہو گیا ہے' کالے خان کے بندوں کو گلی میں پیٹ رہا ہے' ایک زخمی کو ہاشو لے کر اوپر آیا ہے۔''

''یا خدا۔''

نزہت اور عشرت دونوں بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئیں..... کالے خان' اس کو ٹھے اور ان کے اس دھندے کی پشت پناہی کرنے والوں میں سے ایک مضبوط شخص تھا۔ نزہت بیگم کے اپنے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''اے عشرت' تو یہیں رک میں دیکھتی ہوں۔ ایک تو اس مرشد نے جینا حرام کر چھوڑا ہے۔ پتا نہیں اسے کب موت آئے گی۔ کب جان چھوٹے گی اس منحوس مارے سے۔'' نزہت بیگم فوراً بکتی جھکتی کمرے سے نکل گئی۔ اچھو بھی اس کے پیچھے ہی نکل گیا تھا۔

''کس بات پر جھگڑا ہوا ہے؟' نزہت بیگم کے جاتے ہی عشرت جہاں نے شگفتہ سے پوچھا اور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''مرشد کو جھگڑا کرنے کے لیے کسی بات کی کیا ضرورت ہے بھلا۔''

شگفتہ بانو نے استہزا سے کہا اور آگے بڑھ کر حجاب کے قریب ہی پلنگ پر ٹک گئی۔

''ہاشو ایک زخمی بندے کو ساتھ لے کر آیا ہے کہ اسے حسن آرا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں تاکہ اس کے باقی ساتھیوں کی بھی جان بخشی کا پروانہ جاری کرا سکے۔''

''ان دونوں ماں بیٹے سے تو بس خدا ہی پوچھے..... انسانوں کے بس کے تو شاید یہ رہے ہی نہیں۔''

''جو پھن اس مرشد کے ہیں نا! وہ زیادہ عرصہ رہنے والوں والے نہیں' خدا نے دیر کر بھی دی تو اس کا کوئی بندہ ہی اس کو کہیں گھیر پوچھے گا' دیکھ لینا۔''

"ہمارے برباد ہوچکنے کے بعد ہی شاید ایسا کچھ ہوگا' یا جب اس کوٹھے پر تالے پڑ جائیں گے تب۔"

"تو بڑی اماں سے بات کر کے اس حسو کو یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتی۔"

"ارے...... وہ فتنے کتنی یہاں سے جانا چاہے تو تب ہے نامرشد تو کب سے اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ چل تجھے یہاں سے کہیں دور لے چلتا ہوں' زندگی کے آخری کچھ دن عزت سے گزار لے' مگر نہیں...... بیٹھی ہے کھونٹا گاڑ کے...... اس کے جیتے جی اس خبیث نے کہیں نہیں جانا اور اس خبیث کے ہوتے ہوئے کوئی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا...... اب بندہ مرے یا جیئے!"

وہ ماں بیٹی حجاب کو نظر انداز کیے اپنی ہی باتوں میں مگن ہوگئی تھیں۔

حجاب بی بی اپنی جگہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے دل و دماغ کی عجیب حالت تھی۔

اپنے گھر' اپنے صحن سے اغوا ہوئے اسے تقریباً آٹھ دس روز ہوچکے تھے۔ ان آٹھ دس دنوں میں وہ بے تحاشا روئی تھی۔ اپنا گھر' اپنے لوگ' اپنا گاؤں' سب کچھ اس کے اندر تڑپتا رہا تھا' سسکتا رہا تھا' اور وہ ہر ہر پل اپنے خدا کو پکارتی رہی تھی' التجائیں اور فریادیں کرتی رہی تھی۔ دن رات' ہر وقت...... مسلسل...... لاشعوری طور پر اسے مسلسل یہ امید یہ توقع رہی تھی کہ ضرور کوئی معجزہ ہوگا' ضرور کوئی نہ کوئی کرشمہ ہوگا اور سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ وہی گھر' وہی مطمئن اور آسودہ حال زندگی' مہربان و مشفق ماں باپ اور جان چھڑکنے والے گھبرو جوان بھائی...... مگر تا حال ایسا کچھ نہیں ہوا تھا...... اور کچھ ہونے کی توقع بھی اب جیسے دم توڑنے لگی تھی۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ نہ تو آسمانوں سے کوئی مہربانی ہونی ہے اور نہ کوئی زمینی مدد نصیب ہونی ہے...... ایک مایوسی خود بخود ہی اس کے دل میں پھیلنے لگی تھی۔ وہ جب سے یہاں پہنچائی گئی تھی تب سے اس کے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں مگر اس نے ابھی تک اس خیال پر توجہ نہیں دی تھی کہ یہ اسے کسی صورت قابل عمل اور ممکنات میں سے محسوس نہیں ہوا تھا۔ حجاب اپنے دماغ میں الجھی رہی...... عشرت اور شگفتہ اپنی باتوں میں محو تھیں پھر انہیں نزہت بیگم کی تند و ترش آواز ہی نے چونکایا تھا۔

"اب ادھر کدھر منہ اٹھائے آرہا ہے مردود! جا کر ہاشو کو ادھر بھیج' جا دفع ہو۔"

وہ باہر غالباً غصے میں اچھو پر برس رہی تھی...... چند لمحوں بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی گھنگروؤں کی جوڑی حجاب کے سامنے پلنگ پر پٹخ دی۔

"چل اے چھوری اٹھا کر باندھ یہ پاؤں میں اور تیار ہوجا' بہت سمجھالیا تجھے پیار سے' اب دیکھتی ہوں تو کیسے میری بات پر عمل نہیں کرتی۔"

نزہت بیگم تو جیسے انگارے چبا کر لوٹی تھی۔

"کیا مسئلہ تھا اماں! کیا ہوا؟"

عشرت جہاں بے ساختہ متفسر ہوئی۔

"مسئلہ......" نزہت بیگم فوراً عشرت کی طرف پلٹی۔

"یہ جو ماں بیٹا میرے کلیجے کی دق بن کر رہ گئے ہیں ان کے علاوہ اور کیا مسئلہ ہوسکتا ہے؟ یہ حسن آرا کا پاگل سانڈ کسی روز خود بھی جانور کی موت مرے گا اور ساتھ ہمارا بھی رگڑا نکلوا دے گا۔ اس منحوس نے کالے خان کے پانچ بندوں کا نیچے گلی میں اچھا خاصا تماشا بنایا ہے اور...... ان میں ایک کالے خان کا چھوٹا بھائی بھی ہے۔" نزہت بیگم عشرت کے ساتھ ہی مسہری پر بیٹھ گئی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان ماں بیٹوں کا کیا کروں۔"

اس کی حجاب پر نظر پڑی تو پھر سے بھڑک اٹھی۔

"اے! تجھے سنائی نہیں دیا کیا؟ یہ گھنگرو اٹھا کر پیروں میں باندھ لے ورنہ آج تیری چمڑی اتارلوں گی میں اور کل یہ گوری ملائم چمڑی جوتی کی صورت میرے پاؤں میں ہوگی...... سمجھی؟"

حجاب اپنی جگہ پتھر کا بت بن کر رہ گئی۔ اس کی نظریں گھنگروؤں پر ٹکی تھیں اور روح پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے پردہ تصور پر اس کے بابا سائیں کا سفید ریش اور پرنور چہرہ تھا اور وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"حجاب! یہ لوگ تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کریں' جو بھی ظلم توڑیں' مگر تم نے ان کی یہ بات نہیں ماننی...... ان

کے کہے پر عمل نہیں کرنا چاہے کچھ بھی ہوجائے۔'' حجاب کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو نزہت بیگم نے لپک کر اسے بالوں سے دبوچ لیا۔

''جانتی ہوں میں' سیدھے سبھاؤ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی' مگر میرا نام بھی نزہت بیگم ہے' بڑی بڑی چھنالوں کو سیدھا کیا ہے میں نے تو تو پھر بالشت بھر کی چھوکری ہے۔''

''میں ایسا کبھی نہیں کروں گی چاہے مجھے جان سے مار ڈالو۔''

حجاب نے لرزیدہ آواز میں کہا تو نزہت بیگم نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے پان زدہ گندے دانتوں کی نمائش کی۔

''یہاں کسی کو جان سے نہیں مارا جاتا..... تجھے بھی زندہ ہی رکھا جائے گا..... بس آٹھ دس بندوں کو ایک ساتھ جب تجھ پر چھوڑا جائے گا نا تو ساری ہیکڑی چٹکیوں میں جاتی رہے گی..... دیکھتی ہوں میں بھی کہ تو کب تک اڑی دکھاتی ہے۔''

نزہت بیگم نے اسے بالوں سے ایک ذرا جھنجوڑا' اسی وقت دروازے سے ہاشو خان اندر داخل ہوا..... حجاب کو اس کی صورت ہی سے کراہت محسوس ہوئی تھی۔

''جی بائی جی! وہ اچھو نے کہا کہ آپ نے بلایا ہے مجھے ''

نزہت بیگم حجاب کے بال چھوڑ کر ہاشو کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ہاں' آ ذرا ہاشو! دیکھو تو..... کیسی چیز ہے یہ؟''

اس کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔ ہاشو کی ندیدہ نظریں تو پہلے ہی حجاب پر جمی تھیں۔

''کیا بات پوچھتی ہو بائی جی! یہ تو ایک دم خالص کھوئے ملائی والی قلفی جیسی ہے۔ آگ کا بنا گلاب ہے ہر دامن جلا کر رکھ دے گا۔ بیٹھے بٹھائے یہ خزانہ کدھر سے ہاتھ لگ گیا۔''

اس کی نظریں بدستور حجاب کے بدن پر سرک رہی تھیں۔

''بس ہاتھ لگ ہی گیا ہے۔ مگر اس کھوئے ملائی والی قلفی کا کہنا ہے کہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔''

''آپ حکم کریں تو ساری ٹیڑھ منٹوں میں نکال دیتا ہوں۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جی۔''

ہاشو خان سینہ پھلا کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''کیوں ری! کیا کہتی ہے؟ اب بھی فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔''

نزہت بیگم کے سوال کے فوراً بعد شگفتہ نے حجاب کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

'بے وقوف نہ بن' تھوڑا عقل سے کام لے' کیوں اپنی کم بختی اور مصیبت کو آواز دے رہی ہے' تیرا بھلا اسی میں ہے کہ جو کہا جارہا ہے وہ چپ چاپ مان لے۔''

''میں یہ سب نہیں کرنا چاہتی' آپ سب کیوں مجھے زبردستی مجبور کررہے ہیں۔'' ہزار ضبط کے باوجود وہ سسک اٹھی۔ خشک پڑ چکی آنکھوں میں جانے پھر کدھر سے آنسو امڈ آئے۔

''مجھے جانے دیں' خدا کے لیے مجھے جانے دیں..... میں یہاں نہیں رہ سکتی' میرے ..... میرے والدین کو پتا چلا تو وہ دکھ سے مرجائیں گے..... خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ جانے دیں مجھے یہاں سے۔''

''میں نے کہا ہے نا ہاشو! یہ ٹیڑھی کھیر ہے' ایسے نہیں سمجھے گی' تو یوں کر کہ چار چھ اور جوانوں کا انتظام کر اور آج کی ساری رات دل کھول کر اس کی خبر لو..... میں پھر کل دن میں اس کے مزاج پوچھوں گی۔''

''اور کسی کی کیا ضرورت ہے بائی جی! میں اکیلا ہی اس کی طبیعت بحال کردوں گا۔'' ہاشو خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تو نزہت بیگم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا..... وہ تو حجاب کو صرف نفسیاتی مار مار رہی تھی' ورنہ چوہدری اکبر کے الفاظ وہ کوئی بھولی تو نہیں تھی۔

''نہیں ہاشو! کم از کم چھ آٹھ بندے تو ضرور ہوں تاکہ یہ خود کمرے سے بغیر کپڑوں کے دھمال ڈالتی ہوئی باہر آئے' مزہ تو تبھی آئے گا۔''

ہاشو کچھ بولنا چاہتا تھا مگر اسی وقت مرشد کمرے میں داخل ہوا تو سب چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔

اس نے اندر آتے ہی ہاشو کے گال پر اس زور کا تھپڑ رسید کیا کہ ہاشو لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

''مرشد.....'' نزہت بیگم فوراً آگے بڑھی مگر پھر ٹھٹک

گئی..... مرشد کے تاثرات خاصے خراب تھے..... حجاب بی بی کچھ مزید سہم گئی۔

''بڑا شوق ہے تجھے جاسوس بننے کا' چل آج تجھے مکمل جاسوس بناتا ہوں میں۔'' مرشد نے ہاشو کو کالر سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

نزہت بیگم اور عشرت جہاں مرشد کو پکارتی ہوئی فوراً اس کے پیچھے لپکی تھیں' شگفتہ بھی فوراً اٹھ کر ان کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ حجاب کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اس کے بالکل ہی سامنے کمرے کا دروازہ تھا جو چوپٹ کھلا تھا' دروازے سے باہر سامنے ہی پھولوں کے کچھ پودے دکھائی دے رہے تھے اور صحن کی چار دیواری کی ایک دیوار بھی جو حجاب کے قد سے تھوڑی چھوٹی ہی رہی ہوگی..... اگر ایک ذرا ہمت اور کوشش سے کام لیا جاتا تو اس دیوار کو پھلانگا بھی جاسکتا تھا۔ یک بہ یک حجاب کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں..... یہی ایک موقع اور وقت تھا جس کا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ وقت بہت کم تھا..... کسی بھی وقت وہ چڑیلیں واپس پلٹ سکتی تھیں' حجاب کو جو کرنا تھا وہ ابھی کرنا تھا..... وہ اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر بے اختیار آگے بڑھ کر دروازے کے قریب پہنچ گئی..... باہر کچھ فاصلے سے ہاشو کی دھاڑیں اور وہاں موجود خواتین کی روک ٹوک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی دروازے پر پہنچ کر حجاب کو صحن کی دوسری دیوار بھی دکھائی دینے لگی تھی جو سامنے کی دیوار سے اسی کمرے کی بغلی طرف کو آتی تھی۔ اسی دیوار کے ساتھ کوئی دس بارہ قدم دور کچھ لکڑی کے تختے اور لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا جس پر پاؤں رکھ کر باآسانی دیوار کے اوپر پہنچا جاسکتا تھا' شاید قدرت اس کی مدد پر آمادہ ہوآئی تھی۔

اس نے ایک ذرا دروازے سے باہر جھانکا..... کچھ فاصلے پر وہ چڑیلیں موجود تھیں' مگر اس طرف کو ان کی پشت تھی ایک طرف زمین سے اٹھتے ہوئے ہاشو خان کی جھلک بھی اسے دکھائی دی۔ ان سب سے آگے برآمدہ تھا' برآمدے میں ایک عورت اس جنوبی شخص کا بازو تھامے کچھ بول رہی تھی۔ جسے نزہت بیگم نے کچھ دیر پہلے مرشد کہہ کر پکارا تھا۔

حجاب کے پورے وجود میں ایک سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ دل جیسے حلق میں آکر دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے وجود پر شگفتہ کے کپڑے تھے اور پاؤں میں اسی کی چپل' حجاب نے آہستہ سے چپل اتار دی۔ اس نے نہیں سوچا تھا کہ دیوار پھلانگ کر کدھر جائے گی کیا کرے گی' اس کے دل و دماغ میں تو بس ایک خیال تھا کہ اس چار دیواری سے نکل جاؤں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں' اتنی دور کہ یہ لوگ دوبارہ میری گرد کو بھی نہ پاسکیں' حجاب نے آخری بار تختوں' لکڑیوں کے اس ڈھیر پر ایک نظر ڈالی' دیوار کی اونچائی کو دیکھا' دروازے سے اس ڈھیر تک کے فاصلے کو دیکھا اور ایک بار پھر خدا کو مدد کے لیے پکارتی ہوئی دیوار کی طرف دوڑ پڑی۔

کمرے سے نکلتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ ایک دو آوازیں بھی بلند ہوئیں مگر الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آسکے..... تختوں کے اس ڈھیر اور دیوار کے سوا اس کے حواس اور کسی شناخت کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

اس نے دوڑتے ہوئے ان تختوں لکڑیوں کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کے اوپر رکھے مگر اگلے ہی پل اس کے ہاتھ دیوار سے پھسل گئے' پیروں کے نیچے سے لکڑیاں سرک گئی تھیں توازن گڑبڑایا تو وہ گر پڑی' چوٹوں کو محسوس کیے بغیر وہ تڑپ کر اٹھی اور ایک بار پھر لکڑیوں پر چڑھ گئی۔ دونوں بازو دیوار پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے وجود کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھالیا۔ قریب تھا کہ وہ دوسری طرف کود پڑتی کہ ٹھیک اسی لمحے ایک ہاتھ نے عقب سے اس کی قمیض دبوچ لی..... دوسرا ہاتھ اس کی ٹانگ پر آجما اور اگلے ہی پل اسے واپس پیچھے کھینچ لیا گیا۔ وہ بامشکل گرتے گرتے بچی۔ اسے کھینچنے والی شگفتہ تھی۔ نزہت بیگم اور عشرت جہاں بھی فوراً ہی اس کے سر پر پہنچ آئیں۔ نزہت بیگم سر پر پہنچتے ہی دو ہتڑوں سے شروع ہوگئی تھی۔

''کدھر کو اڑی جارہی تھی ناس پیٹی..... ہیں..... یہاں سے اڑ کر نکل جانا اتنا آسان سمجھا ہے تو نے..... کمینی' چنڈال۔''

شگفتہ نے اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ عشرت جہاں بھی نزہت بیگم کے ساتھ آملی..... اس نے حجاب کے بال دبوچ لیے تھے۔ حجاب کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

''میں فرار کراتی ہوں تجھے۔''
''حرافہ کہیں کی..... بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔''
''ہاشو! پکڑ..... پکڑ ذرا اس چھنال کو۔''
''اماں! اسے اندر لے چلو۔''
حجاب نے دیکھا' ہاشو اس کے سر پر کھڑا تھا اور برآمدے میں دکھائی دینے والی عورت بھی حیران پریشان سی صورت لیے اسی طرف چلی آرہی تھی۔
''اماں! اماں کیوں مار رہے ہو اسے..... کون ہے یہ؟''
ہاشو نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے..... نزہت بیگم اسے چھوڑتے ہوئے فوراً قریب آئی اس حیران پریشان صورت والی عورت کے سامنے کھڑی ہوگئی۔
''بس حسن آرا! رک جا اس معاملے سے تیرا کوئی لینا دینا نہیں۔''
''مم..... مگر یہ ہے کون؟ اور تم لوگ اسے پیٹ کیوں رہے ہو..... کیوں مار رہے ہو اسے؟''
''میں نے کہا نا! یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے تو..... تو واپس اپنے کمرے میں چل' چل واپس۔''
نزہت بیگم نے بازوؤں سے پکڑ کر اسے واپس موڑا اور ہاشو سے مخاطب ہوئی۔
''ہاشو! تو اس مال زادی کو اندر لے چل میں ابھی آئی۔''
ہاشو نے حجاب کو بالوں سے پکڑے پکڑے بے رحمی سے کمرے کی طرف گھسیٹا تو بے اختیار حجاب کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ اس نے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کی مگر گرفت مضبوط تھی..... ہاشو یونہی اسے بالوں سے دبوچے گھسیٹ کر کمرے میں لے آیا..... ساتھ ہی وہ اسے غلیظ اور شرمناک گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا..... عشرت جہاں اور شگفتہ بھی اس سب میں شریک تھیں۔ کچھ ہی دیر میں نزہت بیگم بھی لوٹ آئی..... اس کی سانس پھولی ہوئی تھی' پھر بھی اس نے اندر آتے ہی حجاب کو بالوں سے دبوچ لیا۔ پہلے اسے بالوں سے جھنجوڑا پھر کچھ دو ہتڑ برسائے اور دوسری مسہری پر ڈھے سی گئی۔
''آج..... آج نہیں بچے گی تو.....'' اس نے ایک مردانہ قسم کی گالی نکالی۔
''تجھے عبرت کا نشان بنادوں گی میں..... تیری..... تیری سات پشتیں بھی نزہت بیگم کو کبھی بھول نہیں سکیں گی۔''
پھر وہ ہاشو سے مخاطب ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''چلو ہاشو..... تیاری کرو..... آج کی رات اس کے سارے کس بل نکالنے ہیں۔ ساری رات سبق سکھانا ہے اسے چلو۔''
نزہت بیگم ان تینوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی اور باہر سے ایک بار پھر زنجیر چڑھا دی گئی۔ حجاب بی بی فرش پر بیٹھی تھی' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سر پلنگ پر ڈالا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆

نزہت بیگم' حسن آرا کو اس کے کمرے میں پہنچا کر واپس گئی تھی اور ساتھ ہاتھ جوڑ کر' واسطے بھی دے گئی تھی کہ تو اس سب سے الگ رہ' مگر حسن آرا..... اس کے دل و دماغ میں ایک بے سکونی آ بیٹھی تھی..... اس لڑکی کی دیوار پھلانگنے کی کوشش' نزہت اور عشرت کی اس کے ساتھ مار پیٹ اور ہاشو کا بے دردی سے اس بے چاری کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا اور..... اور اس لمحے اس لڑکی کے حلق سے نکلنے والی دل دوز چیخیں..... حسن آرا کا دل بیٹھنے لگا' کنپٹیوں میں برف سی جمتی محسوس ہوئی اور وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔
حسن آرا نے اس سارے واقعے کو ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کی مگر..... اسے ناکامی ہوئی..... چیخوں کی وہ آواز اس کے دماغ میں گونجتی رہی اور وہ معصوم سی صورت جیسے اس کے پردہ تصور پر جم کر رہ گئی۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ وہ لڑکی کسی بہت ہی اچھے اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے' مگر کون ہے' کہاں سے ہے اور یہاں کیسے آ پھنسی ہے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا..... اور نزہت بیگم بھی تو وہ اس بارے میں کچھ کہنے سننے پر ہرگز بھی آمادہ نہیں تھی۔
حسن آرا نے ایک بار پھر سر جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی..... تکیے کے نیچے سے دو ٹیبلٹس اٹھا کر منہ میں ڈالیں اور دو گھونٹ پانی پی کر دوبارہ لیٹ گئی۔ لڑکی کا خوبصورت اور معصوم چہرہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا..... خوف اور

دہشت سے بھری وہ آنکھیں..... حسن آرا سے لیٹا نہیں گیا..... وہ اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ مگر بے چینی بڑھتی ہی گئی' نزہت بیگم سے فی الوقت کوئی بھی بات کرنا فضول تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور دوسری منزل پر آ گئی..... سندس جہاں تو اپنے کمرے میں نہیں تھی البتہ شازیہ بانو ہاتھوں پیروں اور منہ پر لیپا پوتی کیے حسب عادت ایک کرسی پر بیٹھی رسالہ پڑھنے میں مگن تھی۔

''ارے خالہ! آپ ادھر..... آیئے آیئے۔''

شازیہ نے اس پر نظر پڑتے ہی رسالہ بند کیا اور سیدھی ہو بیٹھی..... ایک تو حسن آرا اپنے کمرے سے کم ہی نکلتی تھی اور اگر نکلتی بھی تھی تو کچھ دیر کے لیے عقبی صحن کے باغیچے میں چہل قدمی کے لیے اور بس..... دوسرا محلے کی اور بہت سی طوائفوں اور رقاصاؤں کی طرح شازیہ بھی مرشد کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے والیوں میں سے تھی' سو پیٹھ پیچھے بھی اس نے مرشد یا حسن آرا کے متعلق کبھی کوئی فضول بات نہیں کہی تھی۔

''خیریت تو ہے خالہ! آپ آج ادھر کو کیسے آ گئیں؟''

''بس خیریت ہی ہے..... دل گھبرا رہا تھا تو اٹھ کر ادھر چلی آئی..... سندس نظر نہیں آ رہی۔'' حسن آرا پلنگ پر بیٹھ گئی۔

'اماں کو گل ناز نے بلایا تھا..... ادھر ہی کو نکلی ہوئی ہے۔''

''اچھا۔''

''خالہ! کچھ کھائیں پئیں گی آپ؟''

''نہیں شازیہ۔''

''چائے بنا دوں؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں' تم یہ بتاؤ کہ ادھر باغیچے والے کمرے میں جو لڑکی ہے اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''وہ..... وہ لڑکی نہیں ہے خالہ! تین کنال کی کوٹھی ہے وہ تو۔''

''تین کنال کی کوٹھی۔''

''ہاں جی! ابڑی اماں سے کسی نے سودا کیا ہے' اسے بلد از جلد طوائفوں والی تربیت دے کر تیار کر دیا گیا تو جرت میں تین کنال کی کوٹھی ملے گی' ماڈل ٹاؤن میں۔''

شازیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی مگر اس کی بات سنتے ہی حسن آرا کے چہرے پر ناگواری سی پھیل گئی۔

''کہاں کی ہے؟ اور اسے یہاں لایا کون ہے؟''

''یہ تو پتا نہیں' بڑی اماں ذکر کر رہی تھی مگر میں نے دھیان نہیں دیا' بہرحال دشمنی وغیرہ کے چکر میں یہاں تک پہنچائی گئی ہے۔''

حسن آرا بیٹھے بیٹھے سوچ میں پڑ گئی..... اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس معاملے میں کیا کہے اور کیا نہیں..... دوسرا اسے کچھ کہنا چاہیے بھی یا نہیں..... یہ تو جگہ ہی ایسی تھی' چاروں طرف بے شمار ایسی کہانیاں تھیں' حسن آرا نے خود بھی دیکھا تھا کہ والدین خود اپنی بہو بیٹیوں کو یہاں چھوڑ جاتے تھے کہ انہیں کام دھندے پر لگا دیا جائے۔ شوہر اپنی بیویوں کو چھوڑ جاتے تھے۔ صاحب اختیار اور طاقت ور لوگ اپنے دشمنوں کی بہن بیٹیوں کو اٹھا کر یہاں پھینک جاتے تھے' کچھ عورتیں لڑکیاں خود اپنی مرضی سے بھی آ جایا کرتی تھیں۔ یہاں تو یہ معمول کی ایک بات تھی مگر پتا نہیں کیوں اس لڑکی کا چہرہ اور آنکھیں حسن آرا کے اندر جم کر رہ گئی تھیں۔

''آپ نے دیکھا ہے اس لڑکی کو.....؟''

شگفتہ کے سوال پر حسن آرا کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''بالکل آپ جیسی دکھتی ہے' ہے نا! جب آپ اس عمر کی تھیں تو یہی قد بت' یہی رنگ روپ تھا نا! اس کے چہرے کی بناوٹ' آنکھیں' پیشانی اور ناک بھی ملتی جلتی سی ہے' میں نے تصویریں دیکھی ہیں آپ کی' اماں اور بڑی اماں بھی یہی بات کر رہی تھیں۔''

شگفتہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھی اور حسن آرا اپنی جگہ گم صم سی بیٹھی خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

☆

آدھے صحن میں چاندنی تھی اور آدھے میں اس دو منزلہ مکان کا سایہ' صحن کے بالکل وسط میں کنکان (کتا) پڑا سو رہا تھا۔ سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے کے سامنے تقریباً چھ بائی آٹھ کا ایک پختہ چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ صبح قریب تھی

..... چاروں طرف خاموشی تھی' مگر اس چبوترے پر موجود تینوں افراد جاگ رہے تھے۔

مراد ایک طرف بغل میں گاؤ تکیہ دبائے نیم دراز تھا..... ساون برآمدے کے ستون سے پشت ٹکائے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا تھا..... اس کے دائیں ہاتھ کے قریب جگ گلاس اور شراب کی بوتل دھری تھی' جبکہ مرشد چبوترے پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کا سر چبوترے سے نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا' آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ حرکت میں' اس کی بھاری گونجیلی آواز چاندنی میں ڈوب ابھر رہی تھی۔

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا' کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات' بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں' بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا!!

وہ خاموش ہوا تو چند لمحے تک فضا میں خاموشی تیرتی رہی' پھر مراد اپنے ٹیٹوے کو کھجاتے ہوئے بوجھل آواز میں بولا۔

''اچھا استاد! تیری مرضی ہے' جو مرضی ہے..... کہتا رہ۔''

''کون مر گئی ہے؟''

ساون' مراد سے مخاطب ہوا تھا۔

''مر نہیں گئی..... ماری گئی ہے۔''

''ماری گئی ہے..... کون ماری گئی ہے؟''

''تیری مت ماری گئی ہے..... چڑھ گئی ہے تجھے؟''

مرشد ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ساون!''

اس نے ساون کی ران پر زور سے ہاتھ مارا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

''بنا ایک ایک اور۔''

''پہلے ہی اپنے اصول سے زیادہ پیئے بیٹھے ہو تم۔''

'اوئے اصول گیا تیل لینے..... تو گلاس پکڑا۔''

مرشد کے لہجے میں وہی ازلی بے پرواہی تھی۔ ساون نے جگ گلاس اپنے سامنے سرکا لیے' مراد بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

مرشد شراب تو پیتا تھا مگر ایک مخصوص حساب کتاب کے مطابق کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس حساب کتاب کو نظر انداز کر دیتا تھا اور جب ایسا ہوتا تھا تب پھر وہ بے حساب پیتا تھا اور آج وہی بے حسابی چل رہی تھی۔ کل شام اپنی ماں سے مل کر آنے کے بعد اس نے کالے خان کے آدمیوں کو فوراً ٹھڈے مار مار کر وہاں سے بھگا دیا تھا مگر تب سے اب تک اس کا موڈ بحال نہیں ہوا تھا۔ رات تقریباً گزر چکی تھی اور ساری رات وہ تینوں شراب ہی کے ساتھ مصروف رہے تھے۔

ساون نے گلاس تیار کیے' تو مرشد نے فوراً اپنا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

''اوئے..... او۔''

''او لالا..... حوصلے سے یار' کیسے پی رہا ہے تو؟''

ساون اور مراد دونوں ہی متعجب تھے۔ انہوں نے تو ابھی اپنا اپنا گلاس اٹھایا بھی نہیں تھا۔

مرشد نے منہ کھول کر ایک سانس چھوڑا اور گویا ہوا۔

میں تلخیٔ حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا
دنیائے حادثات ہے اک دردناک گیت
دنیائے حادثات سے گھبرا کے پی گیا
میں آدمی ہوں' کوئی فرشتہ نہیں حضور!
میں آج اپنی ذات سے گھبرا کے پی گیا!!

''استاد! تو یہ اخبار اور رسالے پڑھنا چھوڑ دے ورنہ

دیوداس بن کے رہ جائے گا..... مان مری بات' چھوڑ دے۔''

مراد نے مرشد کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا..... مرشد کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ ساون سے مخاطب ہوا۔

''اچھوآیا تھا کل؟''

''ہاں! وہ..... جب تم اماں کو ملنے گئے تھے تو..... وہ آ کر اندر سے رسالے رسولے اٹھا کر لے گیا تھا۔''

''استاد!'' مراد نے مرشد کے گھٹنے پر دستک دی۔

'مان میری بات..... چھوڑ دے..... اس بے چاری کو بھی سمجھا' منع کر۔''

''کسے؟''

ساون نے بات برائے بات پوچھا تھا۔

''وہی..... شازیہ جو اس کے جوٹھے رسالے پڑھتی ہے۔'' اس نے پھر مرشد کے گھٹنے پر دستک دی۔

''مردار خان! تجھے چڑھ گئی ہے' یہ میرا گھٹنا ہے' تیری بے بے کا دروازہ نہیں جسے بجا رہا ہے۔''

مرشد بچپن سے مراد کو یونہی مردار خان کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

''ویسے یہ جوٹھے رسالے والی بات تم نے اچھی یاد دلائی ہے۔'' ساون نے مراد کے گھٹنے کو تھاما۔

''ایک روز..... وہ فیروزہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر تو مرشد کا کوئی جوٹھا رسالہ لا دے تو..... میں تجھے گنڈیریاں کھلاؤں گی۔''

''ساون..... تجھے بھی چڑھ گئی ہے۔''

''ہاں..... کچھ چڑھی ہوئی تو ہے اور کام کیا ہے اس کا۔''

''تو پھر تم دونوں اب سو مر جاؤ۔''

''اب کیا سونا..... اب رات باقی ہی کتنی ہے..... اب تو دن چڑھے ہی سوئیں گے۔''

''تو پھر یہ زنانیوں والی باتیں مت کرو' ورنہ..... میں سو جاؤں گا۔''

مرشد نے ایک بدن توڑ انگڑائی لی۔

''لو..... خود زنانیوں والی اکڑ لیے لے رہا ہے اور ہم لوگ زنانیوں والی باتیں بھی نہ کریں۔ یہ کہاں کا انصاف ہوا بھلا۔''

مراد نے شراب کا گھونٹ بھرا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔

''لا ساون! بوتل پکڑا ادھر۔''

''بس مرشد! بہت ہو گئی۔''

''یار! یہ تو دادا ابو نہ بن بیٹھا کر..... لا دے ادھر۔''

مرشد نے بیزاری سے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو ساون نے سر جھٹکتے ہوئے بوتل اٹھا کر اسے تھما دی۔

''کیا..... ؟ مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟''

ساون نے سنجیدگی سے مرشد کی طرف دیکھا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''نہ..... کچھ تو ہے..... کوئی بھانبڑ تو ہے اندر جسے ساری رات کی شراب نوشی بھی ابھی تک بجھا نہیں سکی' بول کیا بات ہے؟''

''کہا تو ہے کچھ نہیں ہے' اب کیا اسٹام پیپر لکھوائے گا مجھ سے۔'' مرشد نے پھر گلاس بھر لیا تھا۔

''یعنی پھر اماں سے وہی بحث و تکرار ہوئی ہے کل۔''

ساون نے جیسے خود سے جان لیا تھا مرشد کے سینے میں یہی ایک زخم تو تھا جو کب سے اندر ہی اندر سلگتا آ رہا تھا۔

''چھوڑ..... کوئی اور بات کر۔''

مرشد نے گلاس اٹھایا..... گلاس ہونٹوں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فضا میں اذان فجر کی صدا بلند ہوئی۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔''

مرشد کا ہاتھ ٹھٹک کر رک گیا..... اس نے ہونٹوں کے قریب آیا گلاس واپس نیچے رکھ دیا۔

''کیا.....''

مراد فوراً آگے کو ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

''اشہد ان لا الہ الا اللہ..... اشہد ان لا الہ الا اللہ''

''اللہ جل شانہ'' مرشد نے زیر لب پڑھا۔

''یہ کیا ہے اب؟''

مراد نے گردن آگے کو نکال کر اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر مرشد نے سر جھکا لیا تھا۔

اشہدان محمد رسول اللہ!

''صلی اللہ علیہ والہ وسلم!'' مرشد جیسے زیر لب بڑبڑایا تھا۔

مراد نے ایک گہری سانس لی اور سر جھٹکتے ہوئے پیچھے ہو کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد اذان مکمل ہونے تک تینوں ہی خاموش رہے اور جیسے ہی اذان ختم ہوئی مراد نے گلاس اٹھا کر مرشد کے سامنے کر دیا۔

''بس اب رہنے ہی دو۔''

مرشد نے آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

'کاہے کو رہنے دو؟ یہ پکڑو اب اور پڑھاؤ..... ابھی آدھی بوتل اور پڑی ہے۔'' مرشد نے اس کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر ایک طرف رکھا اور خود صحن کی طرف منہ کرتے ہوئے دونوں ٹانگیں چبوترے سے نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''یار! تیری فلم آج تک اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔''

''آئے گی بھی نہیں' لہٰذا تو اپنی سمجھ دانی پر زیادہ زور مت ڈال۔''

اگر تجھے دین دھرم کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر یہ الٹے سیدھے کھیل ویسے ہی چھوڑ دے ..... داڑھی بڑھا اور مولوی بن جا..... بدمعاشی کی بجائے کسی مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو نمازیں پڑھا' کسی ایک طرف کا ہو..... یہ..... دو دو کشتیوں میں سواری کا ٹوپی ڈرامہ کرتے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں گھامڑ! کتنی بار تو سمجھایا ہے تجھے۔''

''اپنے کو ایسی بے تکی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں..... تو..... یا تو یہ شراب پینا چھوڑ دے ..... یا پھر نماز پڑھنا چھوڑ دے..... اس طرح نمازیں پڑھنا فضول ہے۔ تیری ایسی نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔ سمجھا اس بات کو۔''

''اوئے واہ اوئے مردار خان! میری نمازیں قبول کرنا نہ کرنا رب کا کام ہے تیرا نہیں۔ اور..... یہ تو مجھے سمجھا رہا ہے یا کوئی فیصلہ سنا رہا ہے؟''

''کچھ بھی سمجھ..... مگر سمجھ سہی..... ثواب کو ثواب ہی رکھنا چاہیے' جو تیرا طریقہ کار ہے اس طرح تو نماز پڑھ کے تو الٹا گناہ کماتا ہے..... لہٰذا اس کام سے باز آجا۔''

مرشد نے بے ساختہ ایک زور کا قہقہہ لگایا تھا۔

''کیا.....'' مراد نے آنکھیں پٹپٹا کر تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تیرا کیا خیال ہے میں نماز ثواب کمانے کے لیے پڑھتا ہوں؟''

''تو اور کیا.....؟ اور نماز کس لیے پڑھی جاتی ہے؟''

مرشد ایک بار پھر ہنس پڑا۔

''تو واقعی مردار خان ہے مرادے! نرا گھامڑ کا گھامڑ۔'' مرشد ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یار! تو بھی کیا فضول بات لے کر بیٹھ گیا ہے۔''

ساون نے بدمزگی سے مراد کی طرف دیکھا

''ہر بندہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے ..... آپ جواب دہ ہے' تجھے بھلا کیا تکلیف ہے۔''

''یار کو یار کی تکلیف نہیں.....''

''او بس رہنے دے یار تکلیف دار' چھوڑ کوئی اور بات کر۔'' ساون نے اس کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی ..... پھر اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ بولتا' کسی نے بیرونی دروازہ اس زور سے دھڑ دھڑایا' کہ وہ تینوں ہی بری طرح چونک اٹھے۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Pakistanipoint
Waqar Azeem